مکتوباتِ مولوی محمد حسین آزاد کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

مقالہ نگار:

مسرت یاسمین

ایم ۔اے (اُردو) پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگر یٹڈ سٹڈ یز اینڈ ریسرچ

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز ، اسلام آباد

۲۰۰۸ ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے ، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: مکتوبات مولوی محمد حسین آزاد کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

پیش کار: مسرت یاسمین رجسٹریشن نمبر: 296-Ph.D/Urdu/2004

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اُردو

ڈاکٹر گوہر نوشاہی
نگران مقالہ
____

ڈاکٹر شندرہ منور
____
ڈین فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

ڈاکٹر عزیز احمد خان
ریکٹر
____

____
تاریخ

اقرار نامہ

میں، مسرت یاسمین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آیندہ کروں گی۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

مسرت یاسمین

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ، اسلام آباد

۲۰۰۸ ء

فہرست ابواب

مقالے کا دائرہ کار

مکتوب نگاری فنون لطیفہ کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک باقاعدہ فن ہے بلکہ اور فنون کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور زیادہ شائستہ فن ہے۔ اسی لئے اسے بعض اہلِ قلم نے لطیف ترین فن کا نام دیا ہے لیکن اِس فن کی طرف بہُت کم توجہ دی گئی ہے۔

اُردو ادب کے چند نثر نگاروں کے مکتوبات کے علاوہ ابھی تک اس شعبے میں کوئی ٹھوس تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ اس حوالے سے اہم نثر نگاروں کے مکتوبات محققین اور ناقدین کے منتظر ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ '' مکتوبات مولوی محمد حسین آزاد کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' اسی مطالعے اور تجزیے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اِس مقالے کی ابواب بندی یوں کی گئی ہے۔

پہلا باب اُردو مکتوب نگاری کی روایت ، آغاز سے سرسید احمد خاں تک ، محمد حسین آزاد بحیثیت مکتوب نگار ، کے مطالعے کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں مولوی محمد حسین آزاد کے معاصرین کی مکتوب نگاری کے سلسلے میں خدمات اور اسالیب کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب مولوی محمد حسین آزاد ، سوانح ، توقیت ، ادبی خدمات اور آزاد کے اُسلوب نثر پر مشتمل ہے۔ چوتھے باب میں مکاتیب آزاد کا تحقیقی مطالعہ ، مکتوبات آزاد مرغوب ایجنسی لاہور ۱۹۰۷ء ، مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد ۱۹۲۳ء ، مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ۱۹۶۶ء اور آزاد کے غیر مدون مکاتیب کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں مکاتیب آزاد اور آزاد کے اُسلوب نثر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔مکتوبات آزاد میں سوانح آزاد کی جھلک اور مکتوبات آزاد اور آزاد کی دیگر تصانیف کے باہمی ارتباط پر بھی بحث کی گئی ہے۔

چھٹے باب میں آزاد کے مکتوب الیہ ، زیر بحث لائے گئے ہیں۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اکیسویں صدی چونکہ جدید دور کی صدی ہے۔ اِس میں مکتوب نگاری کی صنف تقریباً ختم ہو رہی ہے کیونکہ موبائل فون کا زمانہ ہے۔ ایسے میں یہ مکتوبات جو اُردو ادب کا سرمایہ بھی ہیں اور یہ تاریخ ادب اُردو میں خاص اہمیت کے حامل بھی ہیں خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

ABSTRACT

Letters written by famous writers have contributed a great deal in the development of Urdu language and literature. Today, this significantly important type of prose writing is on decline, due to advancement in the field of communication. Hence, communication through letters is being substituted with SMS, MMS, templates and e-mails etc, which are not being preserved for subsequent analysis. So far, letters of only few famous writers have been researched & critically analyzed, for their literary importance. It is in this back drop that the letters of Muhammad Hussain Azad, who is regarded as one of the five important learned persons of Urdu prose writing, have been selected for research and critical analysis. My endeavor was to highlight the ignored aspects of Azad's prose and an effort in this direction has been made through literary analysis of various letters.For ease of understanding, I have segregated my research into six chapters; each one elucidating distinctly, important aspects of my research. The first chapter is about tradition of Urdu letter writing from its infancy till Sir Syed Ahmed Khan. The 2nd chapter discusses the letter writing style of Azad's counter parts, whereas 3rd chapter presents Azad's biography, literary services and style of expression in prose. Fourth chapter focuses on the research of Azad's letters whereas 5th chapter offers critical analysis of his letters and style of letter writing. The chapter also focuses on Azad's biography derived from his letters & Azad's style of letter writing in relation to his overall style of prose writing. Last chapter briefly describes addresses.

مقالے کا مقصد

مکتوبات کی ادبی اہمیت کسی طرح بھی تخلیقی کارناموں سے کم نہیں ۔فن تاریخ کے نقطہ نظر سے بھی ان کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ مولوی محمد حسین آزاد کو اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

آزاد بذات خود ایک دبستان تھے اِن کی ادبی خدمات کا دائرہ بھی بہُت وسیع ہے لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ مولانا آزاد کو نثر میں معاصرین کے مقابلے میں اپنے اُسلوب خاص کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ آزاد کی نثری تصانیف پر بہُت کام ہو چکا ہے لیکن آزاد کی نثر کا ایک پہلو ابھی تک تحقیق کا موضوع بننے سے قاصر تھا۔ اگر چہ اِن کا یہ نثری پہلو اُن کے اُسلوب میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے یعنی مولوی محمد حسین آزاد بحیثیت مکتوب نگار۔

آزاد کی مکتوب نگاری کو تاریخ ادب اُردو میں ایک خاص مقام حاصل ہونا چاہیئے تھا لیکن اتفاق سے یہ پہلو آج تک ہمارے محققین و ناقدین کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ جس سے مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کا مکمل احاطہ نہیں ہو سکا اور تاریخ ادب اُردو میں نثر آزاد کا مقام متعین کرنے میں ایک خلا سا رہ گیا۔

لہٰذا مکتوبات آزاد کی ادبی اہمیت کے پیش نظر انھیں اِس تحقیقی مقالے کے لئے بطور موضوع منتخب کیا گیا ہے۔ مکتوبات مولوی محمد حسین آزاد کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے سے مطالعہ آزاد میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

اظہار تشکّر

اپنے تعلیمی سفر کی اِس منزل پر رسائی تک میں سب سے پہلے اپنے خدائے بزرگ و تر کی شُکر گزار ہُوں جس نے مجھ ناچیز کو اِس قابل بنایا۔ لطفِ الٰہی کے ساتھ ساتھ جن محترم شخصیات نے اِس اہم کام میں میری معاونت اور راہنمائی کی میں سمجھتی ہوں کہ اُن کے لئے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنا میرا فرض اور اُن کا حق ہَے۔ اِن اہم شخصیات میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شکریے کے مستحق میرے اُستاد مکرم اور اس مقالے کے نگران جناب ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب ہیں جنھوں نے محبت اور شفقت سے قدم قدم پر میری راہنمائی کی اور میرے فراہم کردہ خام مواد کو ایک پختہ مواد کی صورت دے کر مجھے تعلیمی سفر کی اِس اہم منزل سے ہم کنار کیا ہے۔

میں اُستاد گرامی قدر جناب ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی بھی احسان مند اور شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے بھی بڑے مشفقانہ انداز میں میری راہنمائی کی اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا اور ضروری معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں میری اِعانت کی۔

استادِ گرامی جناب بریگیڈیئر عزیز احمد خان کی تہ دل سے ممنون ہُوں کہ اِس مقالہ میں اُن کی راہنمائی میرے لئے بہُت کارگر ثابت ہوئی۔ شعبہ اُردو کے دیگر اساتذہ کی بھی ممنون ہوں کہ جب مجھے کہیں مشکل پیش آئی اِنھوں نے نہ صرف میری مشکل کو حل کیا بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

میں جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور مولانا محمد حسین آزاد کے اخلاف میں سے آغا سلمان باقر کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے بالمشافہہ اور ٹیلی فون پر بھی وقتاً فوقتاً مجھے اپنی راہنمائی سے نوازا۔

میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، پبلک لائبریری لاہور، دیال سنگھ لائبریری لاہور، اور جی سی یونیورسٹی لاہور لائبریری، گورنمنٹ کالج برائے خواتین پسرور لائبریری، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد لائبریری، مقتدرہ قومی زبان لائبریری اسلام آباد اور کراچی یونیورسٹی لائبریری

کے عملے اور سرپرستوں کی بھی احسان مند ہوں خاص طور پر جی سی یونیورسٹی لاہور کے لائبریرین عابد اقبال عابد کی بہت ممنون ہوں کہ اُنہوں نے فراہمی مواد میں ہر ممکن میری مدد کی ۔ میرے والدین کی دعائیں میرا اثاثہ بھی ہیں اور سہارا بھی میں سر تا پا اُن کی شکرگزار ہوں کہ اُنہوں نے جس پیار اور لگن سے مجھے علم کی روشنی سے منور کیا میں آج جو کچھ بھی ہوں اُن کی شفقتوں اور دعاؤں کے طفیل ہوں۔ میں ان کے لئے دعا گو ہوں خصوصاً اپنے والد صاحب کے لئے جو آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور والدہ کی شفقت کا سایہ اور دعائیں ہر لمحہ میرے ساتھ رکھے۔ آمین !

میں اپنے بہن بھائیوں کی بھی بے حد شکرگزار ہوں جن کا تعاون اور مشورے ہر قدم پر میری لئے خود اعتمادی کا باعث رہے، اپنے پیارے بیٹے آفاق یوسف چوہدری کی بھی ممنون ہوں کہ اس سارے عرصہ میں وہ میرا حوصلہ بڑھاتا رہا۔

اور آخر میں محمد اختر چوہدری کی جو میری زندگی کے ساتھی ہیں اور سب سے زیادہ شکریے کے مستحق ہیں تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ اس مقالے کے مواد کے لیے جہاں کہیں مجھے جانے کی ضرورت پڑی وہ میرے ساتھ گئے اور میری مدد اور راہنمائی کی۔ اگر اس سارے عرصے میں ان کا تعاون اور رضا شامل نہ ہوتی تو اس کام کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا ناممکن اگر نہ ہوتا تو مشکل ضرور ہوتا۔

تلخیص

مکتوباتِ مولوی محمد حسین آزاد کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

مسرت یاسمین

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ، اسلام آباد

۲۰۰۸ ء

مکتوباتِ مولوی محمد حسین آزاد کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

باب اوّل

اُردو مکتوب نگاری کی روایت

ا۔مکتوب نگاری:

مکتوب عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ''خط تحریر، نوشتہ'' ہیں۔ ''نگاری''، فارسی زبان کا حرف ہے اور اس کے معنی ''لکھنا'' ہے۔ خط یا مکتوب کی تعریف اس طرح ہے: ایک کا پیام دوسرے تک تحریری صورت میں پہنچانے کو خط یا مکتوب کہتے ہیں۔

مکتوب کے معنی ہیں چٹھی۔ خط۔لکھا ہوا۔[۱] خط کے معنی بھی چٹھی، لکھت، تحریر کے ہیں۔[۲] خط کے معنی نشان، علامت، العبد، اصلاح، حجامت، داڑھی کا آغاز بھی ہیں۔[۳]

خط کے معنی لکیر۔نشان۔چٹھی۔مکتوب۔نامہ۔نیا سبزہ جو چہرے پر آتا ہے۔ داڑھی مونچھیں اُگنے کا نشان۔تحریر لکھائی۔اندازِ تحریر۔شکل۔صورت۔حلیہ۔چھب۔حجامت۔علم ہندسہ، لکیر جس کا طول ہو عرض نہ ہو۔کنارا۔حد۔ساحل۔حکم۔شادی کا معاہدہ۔لکیر کھینچنا۔[۴]

خط (اسم مذکر) نوشتہ۔لکھت۔تحریر۔نوشت۔دستاویز، تمسک۔ سند۔قبالہ۔لکیر لائین۔ دھاری۔ ڈنڈیر۔ وہ لکیر جس کا طول ہو اور عرض و عمق مطلقاً نہ ہو۔[۵]

خط Line ریاضی کی اصطلاح میں اِس سے مراد اَیسی لکیر ہوتی ہے۔ جس میں صرف طوالت پائی جاتی ہو اِس لکیر میں چوڑائی یا گہرائی کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ خطاطی میں جو مختلف طرزہائے تحریر ہیں۔تحریر میں اِنھیں بھی خط کہا جاتا ہے۔[۶]

مکتوب نگاری کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں: چند معلومات ، دلی احساسات و کیفیات اور اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے یا تحریری صورت میں لانے کو مکتوب نگاری کہتے ہیں:

خط کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> خط تہذیب انسانی کے محیر العقول عجائبات میں سے ہے انسان کی یہ اختراع اس کی زندگی کے عجیب وغریب اور ہمہ گیر تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ پہلے محض سادہ ضرورتوں کو پورا کرنے کی حد تک محدود رہی اس کے بعد جملہ فنون عالیہ کی طرح ایک فن لطیف ۔ بلکہ بقول بعض لطیف ترین فن بن گئی۔ [۷]

خط کی ضرورت کیلئے ابلاغ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ابلاغ انسانی فطرت کی ایک لازمی اور ضروری حاجت ہے۔ خط ایک اجتماعی عمل بھی ہے کیونکہ ابلاغ کیلئے ایک سے زیادہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ابلاغ محدود ہو جاتا ہے۔ خط کیلئے بھی ایک سے زیادہ لوگوں کا ہونا ضروری ہے ۔اس طرح خط ہو یا ابلاغ دونوں ہی اجتماع کے مرہون منت ہیں۔ دونوں کے لیے ضروری ہے ۔کہ بات چیت یا گفتگو کے لیے کوئی دوسرا ہو۔ نہ خط مکتوب الیہ کے بغیر لکھا جائے گا اور نہ ہی اس کا ابلاغ دوسرے کے علاوہ ممکن ہوگا۔ دو انسانوں کا باہمی معمولی افہام و تفہیم بھی ابلاغ کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔حتیٰ کہ معاشرتی تمدن کی بنیاد اوّل ہی ابلاغ پر ہے۔

انسان نے جب اس دنیا میں قدم رکھا اور انسانی زندگی کا آغاز ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ ہم اپنی بات اپنے قریب کے لوگوں کے ساتھ تو بالمشافہ کر لیتے ہیں اور ان کی بات با آسانی سن لیتے ہیں لیکن جو لوگ ہم سے دور ہیں یا جہاں تک ہماری آواز کی رسائی نہیں ۔ان لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کا کوئی طریق کار ہونا چاہیے۔ تا کہ ہم اپنی بات دور بیٹھے لوگوں کو پہنچا سکیں اور ان کی سن سکیں ۔ اسی انسانی ضرورت کے پیش نظر ذہن انسانی نے اپنی خدا داد قوت اختراع سے کام لے کر

خط ایجاد کیا۔ اس طرح انسان نے ایک ایسا وسیلہ گفتگو ڈھونڈ لیا ، جس سے انسان کوسوں دور بیٹھے دوسرے فرد سے بات چیت یا گفتگو کر سکتا تھا ۔یہ وسیلہ گفتگو گویا زبان کا قائم مقام تھا اور اپنی بے زبانی کے باوجود زبان سے بھی زیادہ شیریں بیان اورنطق سے زیادہ فصیح اللسان تھا اور اس کی گفتگو زبانی مکالمہ سے بلیغ تر۔

جو بات ہم اپنی زبان کے ذریعے دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے ہیں، وہی بات ہم بے زبان خط کے ذریعے دوسروں تک منتقل کر سکتے ہیں۔ چونکہ گفتگو کے ذریعے کسی بھی بات کو ایک حد سے زیادہ دورنہیں پہنچایا جا سکتا ۔ فاصلوں کی دشواریاں طے کرنا گفتگو کے بس کی بات نہیں۔ اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک کا سفر کرنے کے لیے کسی اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

خط کی ایجاد ذہن انسانی کے دور ارتقاء کی ایک اہم ایجا د ہے۔ جس طرح مقولہ ہَے کہ ضرورت ایجا د کی ماں“ ہے۔ خط کی ایجاد بھی انسان کی ضرورتوں اورطرح طرح کی مجبوریوں سے ہوئی ہے۔ اس ایجاد کی ترقی میں انسانی کوشش اورسعی کا بڑا ہاتھ ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

> خط نے انسان کے لیے فاصلے کا مسئلہ حل کر دیا ہَے اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ابھار کی تسخیر کے جو کمالات انسان نے بعد میں دکھائے ان کا پہلا اور اہم قدم یہی واقعہ ایجاد خط تھا۔ گویا دوری کا احساس یا مجبوری ایک اہم چیز ہے۔جس نے انسان کوگفتگو کے ابہام و ایہام اور اس شکوک و شبہات ، اس تحریف و مسخ اور اسکے ناقابل اعتماد ذرائع اظہار سے ہمیشہ کے لیےمحفوظ کر دیا۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو زبانی ابلاغ ابدالآباد تک نارسا ہی رہتا۔ اور مکالمات کومشکوک وضعیف ہی رکھتا۔ دیکھئے غالب کےمحبوب نے بھی جس شے کو ہراس انگیز اورمشکوک بنانا تھا اس کو قاصد کی زبان کے حوالے کر دیا۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

عربوں کے خیال میں تحریر کی ایجاد کا بنیادی مقصد علم و معلومات سے پہلے محض پیغام پہنچانا اور دلی جذبات یا معاملات ضروری کا ابلاغ تھا۔ چونکہ عربی میں رسم تحریر یا تحریر ہی کو ''خط'' کہتے ہیں۔ بعد میں ابلاغ کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف نام رکھے گئے اور خطوں کے لیے مکاتیب اور مراسلت وغیرہ کی اصطلاح وضع ہوئی۔

اسلامی تہذیب نے اپنے دور میں خط و کتابت کو اتنی اہمیت دی کہ پرانے زمانے میں ادب و انشاء کی تکمیل کی بنیاد ہی اچھی خطوط نویسی پر ہوتی۔ جو شخص اس زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتا تھا اور جس کو اس زبان و بیان پر کامل شناسائی ہوتی تھی۔ جو دوسروں کے دل و دماغ کی باتیں جانتا اور ان کے دل و دماغ سے تعلق رکھتا۔ یا جو شخص ان آداب رسوم و رواج سے زیادہ واقف ہوتا۔ جن سے دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات و روابط ان مختلف صفات کی وجہ سے ہوتے تو اس شخص کو اسلامی اَدوار میں اکتسابات و فضائل کے لحاظ سے مہذب اور شائستہ ترین آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسے سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدوں کا حق دار ٹھہرایا جاتا تھا۔ابلاغ کے ذرائع پر قدرت کی اہمیت و فضیلت کا یہ اعتراف اسلامی عربی تہذیب کی روح شناسی کی ایک اہم کلید ہے۔چنانچہ ترسل کتابت اور دبیری کی اہمیت پر بعض مصنفوں نے مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔[۸]

اس سے اسلامی ادوار میں سیاسی یا دفتری خط لکھنے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عام مکتوب نگاری انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا

آدمی ہوگا جس کو کبھی خط لکھنے یا لکھوانے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو، یا ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو۔ خط سے بڑھ کر کوئی ادارہ جمہوری یا بنیادی طور پر اجتماعی نہیں ہوسکتا۔ یہ ادارہ بہت وسیع ہے۔ اس کی وسعتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک عام کاروباری پیغامی تحریر سے لے کر اعلیٰ ادب کے رتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ عام بھی ہے اور خاص بھی۔ خط ایک ایسی چیز ہے جو ہرانسان کی رسائی میں ہے ۔ کسی مہذب اور شائستہ انسان کو اس کی گفتگو کی وجہ سے مہذب کہا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان کی گفتگو ہی اس کو شائستہ بناتی ہے لیکن اس سے بھی بڑی چیز جو کسی کو مہذب اور شائستہ بناتی ہے۔ وہ ہے خط نگاری کا سلیقہ۔ جتنا کوئی خط نگاری میں سلیقہ شعار ہوگا اتنا ہی وہ مہذب اور شائستہ ہوگا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> گفتگو میں آواز، لہجہ، چشم و ابرو کی حرکات اور مشافہہ کے دوسرے وسائل مغز سخن کی خامیوں کو چھپا دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات بے کار بات بھی اثر کر جاتی ہے۔ خط ان خارجی وسائل سے محروم ہوتا ہے۔ مگر جو شخص اس کے باوجود خط کو موثر اور بلیغ بنا سکتا ہے وہ درحقیقت ایک شائستہ اور تربیت یافتہ انسان ہی ہوسکتا ہے۔[۹]

خط و کتابت کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً نجی، سیاسی، دفتری کاروباری، تجارتی، عام معمولی اطلاعاتی، علمی اور معلوماتی، شخصی، خیالی اور جذباتی وغیرہ۔

ان میں سے دو اقسام زیادہ اہم ہیں:

۱۔ نجی خط جن کا تعلق ذات سے ہے۔ یہ پرائیویٹ حیثیت سے لکھے جاتے ہیں اور افشائے عام کے لیے نہیں ہوتے۔

۲۔ دوسرے وہ جو پبلک ہو سکتے ہیں۔ ہر خط بنیادی طور پر ایک شخصی اور نجی چیز ہے سوائے اس کے کہ کوئی شخص خط کے ذریعے پبلک کو خطاب کرے۔ ایسے خط کا

> فائدہ نہایت محدود ہوتا ہے مگر جب ایسے خط منظر عام پر آ کر مطالعہ کی چیز بن جاتے ہیں تو ادب اورعلم کا قیمتی ذخیرہ بن جاتے ہیں۔

خط خواہ کسی بھی قسم کے ہوں۔ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ان سے علمی اور معلوماتی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ پرانے خطوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ پرانے خطوں سے تاریخی اور سوانحی مواد حاصل ہوتا ہے۔ بعض اوقات خطوط فن اور ادب کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ویسے تو ہر خط اپنی جگہ دلچسپ ہوتا ہے مگر ادبی و علمی مطالعہ کی حیثیت سے خطوط کی اہمیت کچھ اس چیز پر بھی ہے کہ خطوط کا لکھنے والا کون ہے ، اور یہ خط کس کو لکھے گئے ہیں ، یعنی کاتب کون ہے اور مکتوب الیہ کون۔ اس طرح مکتوب نگاری کا فن ایک شخص کا ہونے کے ساتھ ساتھ شخصیتوں کا فن بھی بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> عام طور سے ان خطوں میں زیادہ دلچسپی لی جاتی ہے جن کے طرفین کی شخصیتیں کسی نہ کسی وجہ سے جاذب توجہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط کے جو مجموعے بھی محفوظ رہتے ہیں یا رکھے گئے ہیں ، وہ عام طور سے وہی ہیں جن کا تعلق جاذب توجہ شخصیتوں سے ہے۔یہ مجموعے تاریخ ، شخصیات نگاری اور سوانح نگاری کے لیے بیش بہا مواد کا درجہ رکھتے ہیں۔[10]

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر بڑا آدمی خواہ ادب سے متعلق ہو یا کسی اور شعبہ زندگی سے لازماً اچھا خط نویس بھی ہوسکتا ہے۔مکتوب نگاری تو بذات خود ایک فن ہے اور اس فن میں کامیاب وہی شخص ہوسکتا ہے جس کو قدرت نے یہ فن ودیعت کیا ہو۔ خط نگار کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھی خط نگاری ایک خاص شخصی ماحول پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ خط نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک آسان فن ہے جو ہر اس شخص کے لیے حاصل کرنا آسان ہے جو اس کا ارادہ کرے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

مگر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہی آسان ترین فن نازک ترین فن بھی ہے۔ کیونکہ اس میں نئی نزاکتوں کی نمود کچھ اس طرح کی مشکل شے ہے جیسے کوئی شے عدم سے وجود حاصل کرتی ہے۔ عدم سے وجود، اس لیے خط نگاری ادب کے دوسرے شعبوں کے برعکس اصلاً ادب نہیں بلکہ محض ایک میکانکی اور افادی عمل ہے۔ خط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد، ایک خاص آن، خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔ مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے۔ یہ شیشہ گری ہے۔ اور پھر آئینہ ساز ہو کر بھی کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچ مچ ایسا آئینہ ڈھال سکتے ہوں گے جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن جائیں گے، اور بہر نظارہ اپنے جوہر کی ہر ادبی لکیر کو مژگاں بنا دیں۔

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

غرض یہ کہ خط نگاری اصلاً فن لطیف نہ بھی ہو تب بھی بعض اوقات لطیف بلکہ لطیف ترین فن کے درجہ اعلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے خط نگاری کے فن پر نظر ڈالی جائے تو اچھی اور باذاق خط نگاری کی کچھ خاص شرائط سامنے آتی ہیں۔"

مکتوب نگاری کے سلسلے میں ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ ہر اچھے مکتوب کو، وہ مقصد جس کے لیے مکتوب لکھا گیا ہے، پورا کرنا چاہیے تا کہ جس کو وہ لکھا گیا ہے اس کو مکتوب نگار کے مطلب اور مدعا کا پتہ چلے۔ مکتوب نگار کو پیغام کی جزئیات کا قطعی علم ہونا چاہیے۔ اس طرح ہر خط کی اولین خوبی اس کی قطعیت ہے۔ دوسری خوبی جو خط کو زندہ رکھتی ہے وہ ہے دلچسپی۔ جن خطوں کی انسانی یا سوشل اپیل کامیاب ہوگی، وہی خط زیادہ مقبول اور مستقل طور پر دلچسپ ہوں گے۔ اسی طرح جن خطوں میں شخصی جذبے کا اظہار اس طور پر ہوا ہو کہ شخصی ہونے کے باوجود اس کی حیثیت وسیع

معنوں میں انسانی ہوگئی ہو ، ان خطوں کی دلچسپی اور دیر پا مقبولیت میں کوئی شک نہیں رہتا۔خطوں کے لیے یہ بھی ضروری ہَے کہ وہ نجی اور ذاتی ہوں۔ نجی زندگی کی خوشیوں اور خواہشوں کا اظہار ہو۔ان میں نجی زندگی کے عام واقعات اور معمولات میں ہمہ گیر دلچسپی پیدا کرنا ہی تو اصل فن ہے ۔اسی دلچسپی کی وجہ سے اچھے خط ادبی صورت اختیار کرتے ہَیں ۔خط ایک جذبے کے تحت لکھا جاتا ہے۔ یہ جذبہ ایک وسیع تر انسانی جذبہ ہے یوں ہی خط کا نام زبان پر آتا ہے۔۔۔تو ایک پُراسرارقسم کی جستجو، ایک پر لطف سی گدگدی طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہَے۔ خط سے حظ اٹھانے کا جذبہ ہر انسان کے لیے یکساں ہے۔ یہی وجہ ہَے کہ دوسروں کے خط پڑھ کر جب انسان محظوظ ہو رہا ہوتا ہے تو یوں لگتا ہَے کہ جیسے انسان اپنے ہی تجربات کو دہرا رہا ہو۔ پھر جب وہ انسانی مزاج اور دل کے رنگا رنگ تاثرات کی سحرانگیز بوقلمونیوں کو دیکھتا ہے ۔تو کسی ادب پارے کی طرح خطوط سے بھی عام انسانی بوالعجیوں مطالعہ سے خیال آفرین خوشی و انبساط حاصل ہوتی ہَے چونکہ خطوں میں خالص، سچائی ، صداقت اور خلوص کی توقع ہوتی ہے۔ ڈر، خوف ،شہرت نمود و نمائش اور اس قسم کی دوسری رکاوٹیں خطوط میں نہیں ہوتیں ۔اس صداقت اور خلوص سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے کیونکہ خط کی بنیادی ضرورت یا بنیادی جذبہ ہم کلامی کی تمنا ہے۔

بقول مولانا غلام رسول مہر:

> مکاتیب کا سب سے بڑا فائدہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اپنے جذبات و امیال، احساسات و تاثرات ، رجحانات و مرغوبات اور فکر ونظر کے تمام پہلو بے تکلف آشکار کر دیتا ہے۔ ہم جس طرح کسی آدمی کی زندگی کا حقیقی نقشہ مکاتیب میں دیکھ سکتے ہیں، کسی دوسری چیز میں نہیں دیکھ سکتے۔"[۱۲]

بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ :

> خط بنیادی طور پر دو انسانوں کے وجود کا طالب ہَے پھر اس میں ''غیبت'' یا

رازیت کا ایک تحیر انگیز ماحول بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جو ادب میں موجود نہیں
ہوتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں سوشل اپیل ہے بھی اور نہیں بھی۔ اگر
خط نگار کو مناسب فضا مل جائے تو خطوط ایک عجیب وغریب پرمسرت اجتماعی
نظام یا ''ادارہ'' بن سکتے ہیں۔ جن خط نگاروں میں اس فضا کے پیدا کرنے اور
باقی رکھنے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے خط وسیع تر مطالعہ کے وقت زیادہ
خوشگوار اور پرتاثیر بن جاتے ہیں۔[۱۳]

معین الدین احمد انصاری لکھتے ہیں:

جب سے اِنسان نے لکھنے کا آغاز کیا ایک کا پیام دوسرے تک پہنچنے کا طریقہ بھی
شروع ہو گیا جسے آج ہم مکتوب نگاری کا نام دیتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ کام
ٹھیکروں اور درختوں کی چھال سے لیا جاتا تھا اور آج ہم کاغذ کے ذریعے اپنا
پیام دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ مکتوب نگاری کی اصل غرض آج بھی وہی ہے۔
جو اُس زمانے میں تھی۔ دُور کا کوئی رہنے والا جس سے ہم بالمشافہہ بات چیت نہ
کر سکتے ہوں خطوط کے ذریعے سے اُسے مخاطب کرتے ہیں۔ وہی باتیں جو
بالمشافہہ ہو سکتی تھیں کاغذ کے پُرزے پر منتقل کی جاتی ہیں، اس لیے خطوط کو نصف
ملاقات کے مماثل ٹھہرایا جاتا ہے۔[۱۴]

خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں'' خط محض نصف ملاقات نہیں
ہوتے بلکہ ایک معنی میں پوری ملاقات ہوتے ہیں''۔[۱۵]

اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

بنا بریں میں تو خط کو نصف ملاقات قرار دینے میں متامل ہوں اور اس کو ملاقات
کی ایک ارفع صورت قرار دیتا ہوں۔ جس میں جسمانی اور مادی واسطے بالکل
معدوم ہو جاتے ہیں۔ اور روحوں کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔[۱۶]

بقول اسلم فرخی:

> اچھا خط لکھنے کے لیے زندگی سے محبت اور زندگی گزارنے کا سلیقہ دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔اُردو مکاتیب میں غالب کو جو اہمیت حاصل ہے اُس کی بڑی وجہ یہی ہے۔غالب زندگی سے محبت بھی کرتے تھے اور زندگی گزارنے کے طریقے سے بھی واقف تھے۔ خط نہ تو مبسوط منطقی بیان ہوتے ہیں نہ مدلل مضامین۔ خط کے تنگ دامانی میں اس کی گنجائش کہاں۔ اِس کے دائرہ عمل میں صرف دو شخص ہوتے ہیں۔ ایک خط لکھنے والا اور دوسرا خط پڑھنے والا۔ ایک باتیں کرتا چلا جاتا ہے دوسرا ہمہ تن گوش ہو کر لذت شنید کی دلفریبیوں میں محو ہو جاتا ہے۔ذاتی تجربے، مشاہدات، واردات، بے قصد و ارادہ خط کے دامن سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور معصوم خوشیاں غیر اہم تکالیف، خط کی دُنیا میں پہنچ کر لازوال اثرات کی حامل ہو جاتی ہیں۔ اچھا خط لکھنے میں مقصد اور ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ محبت کی حکایت بیان کرنے میں قصد اور ارادے کی ضرورت کہاں پیش آتی ہے۔ اچھا خط اپنے لکھنے والے کو بھی لازوال بنا دیتا ہے۔[۱۷]

خط کا ایک اور بنیادی عنصر اس کی ترتیب اور دلکشی ہے۔ ان میں ثقل اور بوجھ نہیں ہوتا ۔ ہر حسین مکتوب کاتب خط کی پوری شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے تبھی تو وہ بے زبان ہونے کے باوجود ظاہری وجود سے بہت دور رہ کر بھی احسن ملاقات کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ساری باتیں جو ملاقات میں ممکن ہوتی ہیں خطوط نویسی اور مکتوب نگاری کے ذریعے پوری کی جاتی ہیں۔ جو شے خط کو نقصان پہنچاتی ہے وہ ہے، جذباتیت کا اظہار۔یہی وجہ ہے کہ محض عاشقانہ خط فنی رتبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ عاشقانہ جذبات کے ساتھ لطافت اور توازن کی بھی ضرورت ہے۔ خط ایک مختصر صنف تحریر ہے اور اس کا حسن اس کے اختصار ہی میں نکھرتا ہے۔لمبا خط لمبی غزل کی طرح بے مزہ ہو جاتا ہے۔خط نگاری میں طول ایک عیب ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> کہ خط بڑا ہی نازک فن ہے۔ یہ کاریگری بھی ہے آئینہ سازی بھی ۔ یہ مختصر اور

محدود بھی اور وسیع و بے کراں بھی ہے یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے۔مگر اس کے
باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی یہ بظاہر کچھ بھی
نہیں مگر اس کا ہر ورق پھر بھی دفتر ہے معرفت کردگار اور معرفت انسان دونوں
کا۔ یہ لکھنے والے کے لیے تو محض عرض سخن ہے۔مگر پڑھنے والے کے لیے گنجینہ
فن بھی ہو سکتا ہے۔غرض خط ایک جہان راز ہے جس کے راز اگر سربستہ رہیں تو
سینوں کو گہر ہائے معنی کے دفینے بنا دیں اور آشکار ہو جائیں تو جذبے کی ساری
دنیا مشک زار بن جائے۔[۱۸]

دنیا بھر کے خطوط کے مجموعوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہی خط دیرپا اور مستقل ادبی حیثیت سے
زندہ رہتے ہیں جن میں انسانی طبیعت کے بنیادی ذوق کی تسلی و تشفی کا وسیع تر سامان موجود ہو۔
خط کہنے کو تو دو چار باتوں کا نام ہے لیکن خط کا ہیولیٰ فن اور شخصیت دونوں سے مل کر تیار ہوتا ہے۔
لہٰذا مستقل شاہکار بننے کے لیے دانش وبینش کے جوہر کے علاوہ خط میں آدمیت کا رنگ آشنائی بھی
ضروری ہے۔ یہ رنگ آشنائی Friendliness سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔اور یہ رنگ آشنائی دنیا کے
بڑے بڑے مکتوب نگاروں کے مکاتیب میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

خط نگاری ایک معمولی کاروباری چیز ہے۔ یہ ایک مادی ذریعہ ہے ، نظام تمدن کا جیسے ، تار،
ٹیلیفون وغیرہ۔مگر بعض لوگوں نے اسے آرٹ بھی بنایا۔چند معلومات کو ایک پیغام کی شکل میں تحریر
میں لا کر مکتوب الیہ تک پہنچانا خط نگاری کا مقصد ہے۔خط نگاری کا اولین مقصد ادب پیدا کرنا نہیں
مگر انسانی ذہن نے اس کو تہذیب و تکمیل کے اس درجے پر پہنچا دیا ہے کہ یہ بذات خود ایک فن
بھی بن گیا ہے۔ بلکہ اپنے خاص احاطے سے بلندتر اور وسیع تر ہوکر اس کے بہترین حصوں نے بلند
ترین ادب میں بھی مقام حاصل کر لیا ہے۔ چنانچہ ادب کی تاریخ میں اعلیٰ خط بھی ادبی شاہکاروں
کے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں۔مگر اسلامی تہذیب وتمدن نے خط نگاری کو اس سے بھی زیادہ اہمیت
دی ہے۔مسلمانوں نے خط کو شائستگی اور اعلیٰ تر زندگی کے زاویے سے دیکھا ہے۔اسلامی تاریخ کے

ہر دور میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جو شخص خط لکھنے کا ماہر ہے۔ وہ تہذیب کی روح کا حقیقی شناور بھی ہے۔

۱.۲ مکتوب نگاری آغاز سے سرسید احمد خان تک

مسلمانوں کے گذشتہ ادبیات میں خطوط و مکاتیب کے وسیع ذخیرے موجود ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ممالک کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط لکھے تھے۔ یہ خطوط عربی انشاپردازی کے عمدہ نمونے خیال کیے جاتے ہیں۔ حضرت محمدؐ کی زندگی ہی میں ان کے خطوط کو جمع کرنے کا کام شروع ہو گیا تھا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے خطوط سے بھی اِس دور کے انتظامی، فوجی اور معاشرتی اُمور سے متعلق آپ کے احکام اور خیالات کا اِظہار ہوتا ہے۔ ان کے ہاں خط و کتابت ایک عظیم علم کا درجہ رکھتی ہے ان کے اصول و معنی پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن کی اہم رسوم و شرائط یہ ہیں فن میں سب سے پہلے صورت کا سوال آتا ہے۔ خطوں میں سب سے پہلے سرنامے، عنوان کی مناسبت اور سرنامے کی موزونیت کا خیال کیا جاتا تھا۔ القاب کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا۔ مشرقی خط نگاری کی تاریخ میں حسن صورت کے لیے کیا کیا اہتمام کیے جاتے تھے، اس کی روئیداد بہت طویل ہے۔ البتہ خطوط کے مختلف ارتقائی ادوار میں عجیب عجیب تبدیلیاں رونما ہوتی نظر آتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً خط نگاری میں سادگی، ایجاز و اختصار، مدعا نگاری خلوص اور مناسبت و موزونیت کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ تہذیب میں تکلف کا رنگ جوں جوں بڑھتا گیا اسی قدر خطوں میں بھی تکلف اور تصنع کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ طویل سرنامے، لمبے القاب و آداب طرز تخاطب میں بناوٹ اور تصنع اور دفتر یت کے انداز نمایاں ہوتے گئے۔

یہ روش کسی خاص دور تک محدود نہیں بلکہ اس کا سلسلہ عربی ادب کے دور مصنوعیت سے جا ملتا ہے۔ جس کے اثر میں سارا فارسی انشائی ادب مدتوں ڈوبا رہا مصنوعیت کی ایک وجہ دربار داری کا غلبہ تھا جس نے خط نگاری کو بری طرح مجروح کیا اور اس کو بے جا تکلف کے راستوں پر ڈال دیا۔

شروع میں ان مکتوبات میں شاہی ادب و آداب اور آن بان کا خیال رکھا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ان میں ادبیت کا رنگ جھلکنے لگا اور جدت پیدا کرنے کی دوڑ شروع ہوگئی۔ اس طرح نہ صرف انشاء پردازی کے فن نے ترقی کی بلکہ مکتوب نگاری کا فن بھی سنورنے لگا۔ خط ایک نجی، شخصی و کاروباری چیز بننے کی بجائے رنگین نثر کی ایک شاخ بن گئے۔ ہندوستان کے فارسی ادب میں مراسلت کا اولین ممتاز ہدایت نامہ اعجاز خسروی ہے۔ یہ بھی سادگی سے زیادہ تکلف اور رنگینی کی تحریک کرتا ہے۔ کلام میں (بشمول خط) نمکینی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نمکینی کا ذائقہ ترکوں کو خاص طور سے عطا ہوا ہے مگر یہ نمکینی بھی ایک خاص مرحلے کے بعد صنائع بدائع کی رنگینیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ خسرو کے بعد فن انشا کے اکثر ماہرین اسی رنگینی سے متاثر رہے۔

ابوالفضل نے مکتوب نگاری کو ایک نئے انداز سے روشناس کیا جس کو رنگین تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس کو دقیق اور پیچیدہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اور ہر چند کے اس کے نجی خطوط اس کی انشا کے دوسرے دفتر میں ہیں اور یہ نجی خطوط سرکاری و دفتری خطوں سے آسان زبان میں ہیں۔ مگر ان کے پیچیدہ ہونے میں شک نہیں۔ ان میں گہرا انفرادی رنگ پایا جاتا ہے لیکن ان میں بناوٹ بالکل موجود نہیں۔ وہ ابوالفضل کی عظیم شخصیت کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ ان میں شخصی جزئیات اور معاملات کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ابوالفضل کے خط ادب عالیہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ فارسی میں اور بھی بڑے بڑے انشا پر داز مکتوب نگار ہو گزرے ہیں۔ درباری ماحول سے متاثرہ مکتوبات کے علاوہ صوفیانہ نوعیت کے مکاتیب بھی کافی ملتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر اور چندر بھان برہمن کا تعلق ہندوستان کی مکتوب نگاری سے ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر اور چندر بھان برہمن کی مکتوب نگاری میں سادگی، سلاست اور مدعا نگاری کا عنصر بھی ہے اور ان میں کاتب کی شخصیت کا انفرادی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر اورنگ زیب کے خطوط تو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ کہ ان میں مدعا نویسی کے باوجود ادبی شان اور کامل بلاغت ہے۔ برہمن کے خطوں میں تکلف اور رنگینی کے رواج عام کے باوجود اس کے خطوں میں سادگی اور مدعا نگاری مقدم ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خطوں میں معصوم، نرم و ملائم اور تہذیب یافتہ لہجے کی مٹھاس ہے۔ خط کے فن

پر اس کو خاص قدرت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب فارسی کی کاروباری حیثیت کو زوال ہوا اور اُردو نے اس کی جگہ لے لی تو اُردو میں خط نگاری کا رواج زیادہ بڑھتا گیا اور اب عام خط و کتابت انگریزی کے علاوہ اُردو ہی میں کی جاتی ہے۔اُردو خط نگاری کا اولین دور فارسی سے متاثر تھا۔ وہی القاب و آداب ، وہی سرنامے، وہی عنوان ، وہی اختتامیے ، وہی رنگ انشاء اور وہی تکلف و رنگینی۔ [۱۹]

انیسویں صدی کے آغاز کے بعد سادگی کا کچھ کچھ رجحان پیدا ہوا۔ ڈاکٹر ثریا حسین لکھتی ہیں :

> مرزا غالب نے شاید ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ اُردو میں خط و کتابت شروع کی اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اُنھوں نے فارسی کے پُرتکلف القاب و آداب ترک کرکے بے تکلف اور غیر رسمی اندازِ تحریر اپنایا اور مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ لیکن گارسین دتاسی نے جو خطوط اپنے مجموعے میں پیش کیے ہیں وہ مرزا غالب سے بُہت پہلے لکھے گئے تھے۔ دتاسی کے مکتوب نگار کسی ایک خطے ، طبقے یا فرقے سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ یہ اٹھارہ خطوط ہندوستان کے مختلف دور افتادہ علاقوں میں لکھے گئے کلکتہ ، مدارس ، پانڈیچری، دکھن اور شمالی ہند۔ اور مکتوب نگار اوائل انیسویں صدی کے معاشرہ کے Cross Section کے نمایندہ ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو زبان اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں نہ صرف بولی اور سمجھی جا رہی تھی بلکہ اِس میں نجی اور کاروباری خط و کتابت بھی رائج ہو چکی تھی اور روزمرہ کی زبان میں خط لکھے جا رہے تھے اِس مجموعے میں راجہ موہن رائے کا مراسلہ موجود ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرنے والے یا ملازمت کے خواہاں عام ہندوستانیوں کے خطوط بھی ملتے ہیں ۔مکتوب الیہ فرنگی افسر ہیں ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز اور فرانسیسی افسر بھی اُردو میں خط و کتابت کرتے تھے۔ [۲۰]

خط کی نئی طرز کی ایجاد کا سہرا صحیح معنوں میں غالب کے سر ہے۔ ۱۸۴۹ء کے لگ بھگ غالب نے نئے انداز میں خط لکھ کر اُردو میں نہ صرف مکتوب نگاری کی نئی طرز نکالی بلکہ خود اُردو نثر کو

بھی ایک بدیع طرز نگارش سے روشناس کیا۔ مرزا غالب کے خطوط اُردو خط نگاری کی تاریخ میں منفرد امتیازات کے حامل ہیں۔ ان میں مرزا کا رنگ طبیعت بلکہ نجی اور پرائیویٹ زندگی کی عکاسی بھی ہے۔ غالب سے پہلے خطوں میں خلوت کی زندگی کے اشارات اگر کبھی آتے تھے تو چیستاں اور معمہ کی زبان میں آتے تھے۔ اس کے باوجود ایسے خط شاید ہی کبھی محفوظ رکھے گئے ہوں جن میں کسی کی نجی زندگی کا کوئی ایسا پہلو آتا ہو جو قابل اخفا ہو۔ مرزا غالب نے اس رسم کو ترک کر کے اپنی زندگی ہی میں اپنے خطوط شائع ہوتے دیکھے اور ان میں دلچسپی لی۔ یہ وہ خط تھے جن میں ذاتی معاملات اور عام مطالب کے علاوہ ان کی زندگی کے ہر قسم کے حالات ہمیں ان کے خطوں میں ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی مے نوشی اور عشق بازی کے تذکرے بھی ان کے خطوں میں آتے ہیں۔ غالب نے اکثر خطوط کاروباری، معاملاتی تحریک سے زیادہ خط نگاری کے ذوق سے لکھے ہیں۔ غالب کے خط ان کے لیے رفیق تنہائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ انہی سے دل بہلاتے تھے۔ غالب کے خطوں سے ان مسرتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو اس عظیم خط نگار کو اپنے اس رفیق زبان کی صد رنگ گویائیوں کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ غالب کی خط نگاری کی اہم بات شخصی تفصیلات کا جذباتی ذکر ہے۔ پھر وہ مکتوب الیہ کی تفریح و فرحت کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ غالب نے القاب و آداب کے پرانے اور فرسودہ طریقے کو ختم کر دیا ہے۔ غالب خود لکھتے ہیں:

> ''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے
> بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''۔[۲۱]

غالب نے انشاء پردازی کو تیغ بُراں سمجھ کر استعمال نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ اپنا علمی سکہ اغیار کے دل پر بٹھائیں بلکہ اپنے قلم کی روانی سے دل کی بات کا عکس کاغذ پر اتار دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ اسی لیے ان کے خطوط مشکل تراکیب اور دقیق الفاظ سے کسی کو مرعوب نہیں کرتے۔ غالب نے کبھی اپنی شخصیت کو نہیں چھپایا۔ وہ جیسے تھے ویسے ساری عمر رہے۔ انھوں نے اپنی رندی کو اس زمانے میں نہیں چھپایا، جب چھپانا زیادہ مناسب تھا۔ ان کی شاعری کی عظمت ان کے خطوط سے اور

بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فلسفی نہیں تھے بلکہ ہمارے دل کی آواز ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کی انسانیت ، ان کی لغزشیں، ان کی وضع داری نبھانے کی آخری کوششیں ، ان کی کینہ پروری ، اپنی کوتاہی پر ہنس لینے کا جذبہ، دہلی سے بساط اُلٹ جانے پر عالم خیال میں انجمن آرائی کا ولولہ، زندگی سے آخر تک لڑنے اور مایوس ہونے کے بعد پھر عزم تازہ پیدا کرنے کا جذبہ غالب کے خطوط کو سدا بہار جوانی عطا کرتے ہیں۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ غالب اُردو مکتوب نویسی میں خضر راہ اور راہ نما کا رتبہ رکھتے ہیں۔

ان کے خط نگاری کے انداز نے کردار نگاری اور شخصیت نگاری کے لیے بڑے اچھے نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے خطوں میں کہیں ''خود کلامی'' اور ''خود انتقادی'' بھی ہے۔ اس سے ان کے مطالب خط کے کناروں سے اُچھل کر ادب کا دریائے بے کراں بن جاتے ہیں۔ غالب کے خطوں کی مقبولیت سے اُردو مکتوب نگاری کو ایک خاص ادبی مقام حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران سینکڑوں مکتوبات لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مکتوبات کا کتابی صورت میں پہلا ایڈیشن ''اس گھر کو آگ لگ گئی'' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں اس کتاب کا نام بدل کر ''۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط'' کر دیا گیا۔ یہ ایڈیشن ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں انگریزی فوج کے افسروں کے نام ضمیر فروشوں اور ملک دشمن ہندوستانی جاسوسوں اور غداروں کے خطوط ہیں جنھوں نے تھوڑی سی دولت کی تمنا اور ہوسِ جاہ و منصب کا شکار ہو کر وطن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ دیکھیے ۲۱ اگست ۱۸۵۷ء میں لکھا ہوا تراب علی کا ایک مکتوب

(۸۴) ـــــــ تراب علی ـــــ ۲۱، اگست ۱۸۵۷ـ

آج دو پلٹن اور ایک رجمنٹ بمعہ دو توپوں کے مالاگڑھ روانہ ہوئیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ لوٹ مار کا سامان ، ۵۰ حکیم اور کاریگر لے گئے ہیں اور دریا کے پار سونی پت جانے والی سڑک پر مورچہ نصب کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ

اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔۔ بریلی بریگیڈ کے باغپت اور علی پور جانے کی
اطلاع بھی ملی ہے۔ آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ اگر صاحب موجود نہیں تو آپ خود
اپنی مہر لگا کر خط بھیج دیں۔ میں آپ کے لیے سپاہی اکٹھے کر لوں گا۔
مفتی صدرالدین کو ایک لاکھ روپے دینے کے لیے روز تنگ کیا جا رہا ہے۔
(ر۔م جلد۳ ص ۱۹۱) [۲۲]

اس طرح کے اور بے شمار مکتوبات ایسے ہیں جو مخبری اور جاسوسی کے لیے انگریزوں کو لکھے گئے ہیں، یہ مکتوبات سیاسی ہیں۔ان کے بعد خوش مذاق خط نگاری عام طور پر مرزا غالب کے انداز کی تقلید کرتی نظر آتی ہے۔ البتہ سرسید کا رنگ اپنا ہے۔سرسید کی ادبی تحریک اور ان کے شخصی رنگ مکتوب نگاری نے بھی خاصی حد تک اُردو خط و کتابت پر اثر ڈالا۔سرسید احمد خان جس طرح نثر میں مدعا اور مقصد کے حامی ہَیں، انہوں نے تہذیب الاخلاق میں خود بھی اس کا ذکر کیا ہے۔[۲۳] اسی طرح مکتوب نویسی میں بھی مقصد نگاری کے ہی حامی ہیں۔ وہ صرف کام کی باتیں کہنا چاہتے ہیں۔ عبارت آرائی تکلف و بناوٹ سے پرہیز کرتے ہَیں۔سرسید کے خط ان کی عام نثر سے زیادہ شگفتہ ہَیں، ان میں قدرے ایجاز بھی مدنظر رہتا ہے۔خطوں میں ظرافت اور لطف اندوزی بھی ہے۔تفصیل کو پسند کرتے ہیں، اور اپنی تحریک کے معاملات میں اسی جوش وخروش اور طول کلام کو روا رکھتے ہیں۔ان کے خطوط اور مضامین کے درمیان کچھ فاصلہ ہَے مگر زیادہ نہیں کیونکہ ان کے خط بھی پیغام کی حدوں سے تجاوز کر کے تبلیغ و خطابت تک پہنچ جاتے ہَیں۔یہ مسلم ہَے کہ سرسید نے اُردو خطوط نگاری کو مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور مخاطبت کے خلوص سے آشنا کیا۔ان کے خطوط میں تخلیہ کی فضا کچھ زیادہ نہیں۔ان میں تنہائی کا ماحول کم اور ہنگامہ زندگی کا شور وغو غا زیادہ ہے، کیونکہ یہی ان کی زندگی کا عام رنگ ہے۔ان کے خطوں میں اخفا اور رازداری کا ماحول بھی کچھ زیادہ نہیں۔ان خطوں کا مخاطب کوئی بھی ہوسکتا ہے۔خصوصیت کی دھار کند سی ہے۔ البتہ ان جذبوں کی کوئی کمی نہیں جن کی ارفع ترین صورت اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ اقدار کے جوش سے پیدا ہوتی ہے اور ظاہر ہَے کہ یہ اعلیٰ مقاصد کی پیش رفت اور اعلیٰ اقدار کی خدمت گہری دوستداریوں کے سچے اور پاکیزہ روابط کے بغیر ممکن

نہیں۔ چنانچہ ان کی زندگیوں میں بھی کئی ایسے مواقع آجاتے ہیں ، جب انھیں اپنی روحانی تنہائیوں کے اندر گہما گہمی اور ہنگامہ آرائی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ یہی وہ انسانیت پرور بنیاد ہے جو ان کی خط نگاری کو بہر حال قابل توجہ بنا دیتی ہے۔

سرسید کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سرسید کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''خطوط سرسید'' مرتبہ سرراس مسعود ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد کے تمام خطوط جو مجموعی طور پر ۲۶۵ ہیں، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ''مکتوبات سرسید'' کے نام سے لاہور سے ۱۹۵۹ء ، ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۵ء میں شائع کیے ہیں۔ چونکہ سرسید احمد خاں سے پہلے اُردو مکتوب نویسی میں غالب ہی ایسے شخص تھے جن کے خطوط کو اہم سمجھا جا سکتا تھا ، اس لیے سرسید احمد خاں بھی اِن کے خطوط سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غالب کی مکتوب نگاری میں نجی تاثرات کی جھلک زیادہ ملتی ہے ، جب کہ ہندوستان کے پچاس سالوں کے علمی ، مذہبی ، سیاسی اور معاشرتی واقعات کی سچی عکاسی سرسید کے خطوط سے ہی ملتی ہے۔ سرسید احمد خان کے خطوط کی بڑی خصوصیت ان کی سادگی اور بے تکلفانہ انداز تحریر ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد بحیثیت مکتوب نگار

سرسید کے بعد خطوط نگاری میں جو اہم نام آتا ہے وہ مولانا محمد حسین آزاد کا ہے۔ مکاتیب آزاد کا پہلا مجموعہ مکتوبات آزاد کے نام سے سر عبدالقادر مرحوم کی کوششوں اور میجر سید حسن بلگرامی کی محبت سے ۱۹۰۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ سر عبدالقادر نے پہلی بار ۱۹۰۶ء میں ان خطوط کو مخزن میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو تقریباً چھ سات مہینے تک جاری رہا ۔ مکتوبات آزاد مع دیباچہ مولفہ سید جالب دہلوی ، مارچ ۱۹۰۷ء ، مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد ۱۹۲۳ء ، اور مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل ۱۹۶۶ء لاہور سے شائع ہو چکے ہیں ۔ مولانا آزاد کے خطوط تعداد میں کم ہیں لیکن آنے والی نسلوں کے لیے بے حد مفید ہیں۔ مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل کے مجموعے میں شائع شدہ خطوں کے علاوہ ان کی تقریباً پینتیس نادر تحریروں کا اضافہ بھی

شامل ہَے۔ یہ تحریریں تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہَیں۔ مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں حد درجہ صاف اور شُستہ زبان استعمال کی ہے۔دقیق اور قدیم اُردو کا رنگ ان کے خطوط میں بالکل نہیں ہے اور نہ ہی فارسی استعارے اور مرکب جملوں کا سہارا لیا ہے۔ ان کے خطوط پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہَے کہ وہ دلی کی زبان بول رہے ہیں۔مولانا آزاد کی خطوط نویسی میں مرزا غالب کا انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے بلکہ بعض خطوط ایسے ہَیں جن میں یہ فرق کرنا مشکل ہَے کہ یہ مولانا کے خطوط ہَیں یا مرزا غالب کے۔ مولانا آزاد کے خطوط میں بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ تصنع اور آورد بالکل نہیں ہَے۔ ہر خط سے خلوص اور محبت کی چاشنی ملتی ہے۔ ان کے خطوط میں ہندو و مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں محبت کا اظہار ملتا ہے۔آزاد علم کے شیدائی تھے اور علم حاصل کرنے والوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ آزاد کے بعض مکتوب بہت ہی مختصر ہیں مثلاً میاں نوشاہی کے نام مکتوب لکھتے ہیں:

میاں نوشاہی جی !

''کوئی میرا خط ہو تو دے دیں''۔

فدوی محمد حسین آزاد عفی عنہ

۴ دسمبر ۱۸۷٦ ع [۲۴]

آزاد القاب و آداب کی پروا کیے بغیر بعض اوقات مکتوب الیہ سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں بے تکلف لکھتے ہیں۔ اپنے خطوط میں کبھی کبھی اپنے آپ کو غائب فرض کر لیتے ہَیں اور خط کے خاتمہ پر کبھی بندہ ، کبھی نیاز مند ، کبھی صرف محمد حسین عفی عنہ ، دعا کا محتاج بندہ آزاد لکھتے ہیں۔بعض خطوط ''صاحب'' سے شروع کرتے ہیں۔ آزاد نے غالب کے انداز کو اس قدر اپنایا کہ ان کے ہاں سلاست و روانی غالب سے کسی طرح کم تر نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

جناب من ! ہزار لعنت ہَے مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں۔ اور لاکھ لاکھ لعنت ہَے میرے اعمال و اشغال پر کہ مجھے ایسے عالم میں

ڈال رکھا ہَے کہ جو چاہتا ہے۔ اور جو واجب و فرض عینی ہَے وہ کر نہیں سکتا ، بھائی! تم تو سچے ہو۔ مگرتمھیں میرے حال کی بھی خبر ہَے۔ ؟[۲۵]

ایک اور خط میں آزاد اس طرح لکھتے ہَیں جیسے باتیں کر رہے ہَیں:

صاحب ! آپ تو دور بیٹھے احمق بناتے ہَیں ۔ اصل بات جوہَے وہ مختصر ہَے۔ اب جھوٹے ڈھکو سلے آپ کے خوش کرنے کو بناؤں ، یہ مجھ سے ہونہیں سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہَے کہ خلیفہ صاحب سے ہو سکے، خط چٹھی جو ہولکھوا لیجیے۔ آپ کو یہ ارمان نہ رہ جائے اور:

ع شاید کہ ہمیں بیضہ بر آرد پر وعنقا گردد۔[۲۶]

آزاد کا بےتکلف انداز ہے اور محبت و خلوص سے لبریز ہَے۔ ایسے معلوم ہوتا ہَے جیسے ابھی اٹھ کر گلے مل رہے ہیں۔ بےتکلفی کا عالم یہ ہَے کہ ''تم'' کہہ کر بھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ''میاں میرے ! تم تدبیروں کے رستم ہو۔ جو کوئی نہیں کرتا سوتم کرگزرتے ہو۔ قسمت تمھاری کچھ زبردست ہے، کچھ کمزور ہے'' ایسا لگتا ہَے کہ مخالف ان کے رُوبرُو باتیں کر رہا ہے۔ آزاد کے خطوط میں اعتدال اور میانہ روی ہَے۔ ان کے خطوط میں ایک وقار، سکون ، تحمل اور محبت و خلوص کا انداز ملتا ہے۔ آزاد دلی کی پرانی تہذیب کے نمائندے تھے۔ شرافت ، رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہیں۔ اپنی وضع داری کے ساتھ ساتھ اخلاقی جرات بھی رکھتے تھے جو ان کے خطوط سے ٹپکتی ہے۔ مولانا آزاد نے زندگی بسر کرنے کے جو انداز اپنے خطوں میں اپنائے ہَیں وہ ہماری تہذیب کے بلاشبہ انمول موتی ہیں۔ آزاد طبعاً آزادی پسند نہیں تھے۔ اس کی بڑی وجہ آزاد کا علمی کاموں میں مشغول رہنا بھی ہو سکتا ہے۔ غموں کی کثرت اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہنے کی وجہ سے آزاد نے زیادہ خط نہیں لکھے لیکن پھر بھی وہ اپنی قدر و قیمت میں ہزاروں پر گراں ہَیں ۔ بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

آج سے تقریباً سو سال پہلے کی زبان انہوں نے اس طرح خط میں سمو دی ہَے کہ وہ گویا آج کی زبان ہے۔ جس میں کسی بھی کہنگی کا اثر نہیں آیا۔ یہ ان کی نیک نیتی کا پھل ہَے کہ آج آزاد کے سر پر اپنے علمی کاموں کے سبب شہرت

حام و بقائے دوام کا تاج رکھا ہوا ہے۔ اُردو ان کے احسانات سے گراں بار ہے اور ان کی تحریر کا ہر ہر لفظ ہماری زبان کی بہتری کے لیے ایک گراں بہا خزانہ ہے۔ ویسے بھی یہ عطیہ الٰہی ہے کہ شبلی جیسے نامور اور فرید فرد بھی چاہے ان سے کتنا ہی اختلاف کریں لیکن ان کی گپیں بھی ان کو تو وحی ہی معلوم ہوتی ہیں ۔ایں سعادت بزور بازو نیست۔[۲۷]

لیکن مولانا آزاد کا زور بیان ، ادبیت اور تخیل کی کرشمہ سازی ایسی تھی کہ دوسروں کے لیے اس میدان میں قدم رکھنا گویا ہمالیہ کی چوٹی کو سر کرنا تھا۔بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

ان کی نثر سرتا سر شعر تھی اور ہر بات کو تشبیہہ واستعارہ کے پیرایہ میں بیان کرنا ہی ادائے بیان کا جوہر۔ وہ تن کی عریانی کے قائل نہ تھے بلکہ عروس ادب کی زلفوں کو آراستہ کرنا ہی پیرائیہ بیان کی شستگی سمجھتے تھے۔ انہوں نے زبان کو حسن بخشا اور حسن کو حسن کمال۔ اسی لیے شبلی جیسا ناقد بھی اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔[۲۸]

ایک اور جگہ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی لکھتے ہیں:

آزاد نے علمی وخشک مسائل (علم اللسان ، دیومالا) کو بھی جب انشاء پر دازی کے انداز میں لکھا تو وہ ایک نئی چیز معلوم ہوئے لیکن اگر آزاد اس انداز میں خط بھی لکھتے تو ہوسکتا تھا کہ تعلّی اور شیخی کے جذبہ کا طعنہ دیا جاتا۔لیکن ان کے سامنے خطوط کی حیثیت مخاطب کے ساتھ اُسی انداز کی گفتگو کرنا تھی، جس رتبہ کا وہ اہل تھا۔اسی لیے سید حسن بلگرامی اور ناصر نذیر فراق کے نام لکھے ہوئے خطوط میں آپ کو بین فرق ملے گا۔آج بھی پاک سرزمین پر رہنے والوں کی سلیس و پاکیزہ زبان سیکھنے اور بولنے کے لیے آزاد کی علمی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔[۲۹]

آزاد اپنی تحریروں میں سانس لیتے، چلتے پھرتے اور باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔مولانا محمد حسین آزاد علمی استعداد رکھتے تھے۔ اُن کی علمی لیاقتوں کا اعتراف سرسید کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جس میں اُنہوں نے آزاد کو اپنا بھتیجا کہا ہے۔سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> مولوی محمد حسین صاحب سے میرے اورمیرے خاندان سے ایک ربط خاص ہے۔ ان کے دادا اور میرے والد میں ایسی دوستی تھی کہ لوگ بھائی بھائی کہتے تھے اور ان کے والد مولوی محمد باقر صاحب مرحوم سے مجھے اور خصوصاً میرے بڑے بھائی مرحوم سے بہ سبب ہم عمری کے ایسا ہی ارتباط تھا۔ پس اگر سچ پوچھو تو مولوی محمد حسین صاحب میرے بھتیجے کے برابر ہیں۔مگر چونکہ علم وفضل ، نیکی و نیک ذاتی میں مجھ سے زیادہ ہیں۔اس لیے میں ان کو مکرم ومعظم اپنا سمجھتا ہوں۔[۳۰]

آزاد کے خطوط آزاد کی طبیعت اور مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ آزاد کی قناعت پسندی ، خوداری اور اصول پسند طبیعت کو ان کے خطوں کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک خط میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

> جن جن نسخوں کے لیے آپ نے ارقام فرمایا ہے ، بے شک حصول مقاصد اور مطلب برآری کا رستہ یہی ہے ،مگر کیا کروں کہ طبیعت ایسی واقع نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ یک رُخی بازی کھیلا ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا؛ جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے۔کبھی تو ہمارا پانسہ بھی سیدھا پڑے گا۔[۳۱]

حوالہ جات

۱ فیروزالدین مولوی ، ڈسکوی ، ''اُردو لغات فیروزی'' الفیصل ناشران و تاجران کتب ،غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور ، ۱۹۸۹ء ، ص ۵۴۶

۲ ایضاً

۳ ایضاً

۴ عبدالمجید، خواجہ بی۔اے، ''جامع اللغات'' جلد اوّل ، اُردو سائنس بورڈ ، ۲۹۹ اپر مال روڈ لاہور ، ۱۹۸۹ء ، ص۹۵۴۔

۵ سید احمد دہلوی ، ''فرہنگ آصفیہ'' جلد دوم ، مکتبہ حسن سہیل لاہور ، سال تالیف مذکور نہیں ، ص ۱۹۹

۶ حامد علی خان ، مولانا (مدیراعلیٰ) ،اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا'' جلد اوّل ، غلام علی اینڈ سنز لاہور ، ۱۹۸۷ء ، ص۵۷۳

۷ سید عبداللہ، ڈاکٹر ،اُردو خط نگاری ''نقوش مکاتیب نمبر'' ۱۹۵۷ء ، ص ۱۵ نیز ''میر امن سے عبدالحق تک'' ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ۱۹۶۵ء ص۲۶۴۔

۸ ایضاً ، ص ۱۶

۹ سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ''وجہی سے عبدالحق تک'' سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۶ء ، ص ۲۶۱

۱۰ ''نقوش مکاتیب نمبر'' ، ص ۱۸

۱۱ ایضاً ، ص ۱۸

۱۲ قدوائی، جلیل احمد ، مکاتیب عبدالحق ، مکتبہ اُسلوب کراچی ، ۱۹۶۳ء ص ۲۳۱

۱۳ سیدعبد اللہ، ڈاکٹر، ''نقوش مکاتیب نمبر'' ص ۲۰

۱۴ معین الدین احمد انصاری ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں'' اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۱

۱۵ سیدعبد اللہ، ڈاکٹر، ''نقوش مکاتیب نمبر'' ۱۹۵۷ء، ص ۲۰

۱۶ ایضاً

۱۷ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف'' (حصہ دوم)، انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۶۵۴۔۶۵۵

۱۸ سیدعبد اللہ، ڈاکٹر، ''نقوش مکاتیب نمبر'' ص ۲۴

۱۹ اُردو خط نگاری ''نقوش محولہ بالا''، ص ۲۷

۲۰ ثریا حسین، پروفیسر، '' گارسین دتاسی، اُردو خدمات اور علمی کارنامے'' اتر پردیش اُردو اکادمی، سال تالیف مذکور نہیں، ص ۲۲۵

۲۱ غالب، ''اردوے معلّٰی'' مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل سید جلد اوّل جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۵۰۶

۲۲ سلیم قریشی، سید عاشور کاظمی، ''۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط'' انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی بہ اشتراک انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۷

۲۳ طاہر نسیم ''سرسید اور اُردو صحافت'' مکتبہ عالیہ ایبک روڈ (انارکلی) لاہور بارِ اول جون ۱۹۸۰ء ص ۱۰۶

۲۴ آزاد، مولوی محمد حسین ،''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۱۳۳

۲۵ آزاد، مولوی محمد حسین،''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید ، ص ۹۴۔

۲۶ ایضاً ، ص ۱۴۷

۲۷ نظیر حسنین زیدی ، ڈاکٹر ، اُردو مکتوب نویسی کے عناصر،''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین''، ناظم آباد کراچی ، ۱۹۶۳ء، ص ۹۱

۲۸ ایضاً ، ص ۹۲

۲۹ ایضاً

۳۰ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد،''مکتوبات آزاد'' ، نظام الدین گیلانی پریس لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۱۲۰

۳۱ ''مکاتیب آزاد'' ، مجلس ترقی ادب ، لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۱۹۷

باب دوم

مولوی محمد حسین آزاد کے معاصرین کی مکتوب نگاری کے سلسلے میں خدمات اور اسالیب کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ا۔مولوی محمد حسین آزاد کے معاصرین

مولانا محمد حسین آزاد کے معاصرین میں سرسید احمد خاں ، نواب محسن الملک ، وقار الملک، مولوی نذیر احمد دہلوی کے خطوط ، مولانا شبلی نعمانی کے مکاتیب اور مولانا الطاف حسین حالی کے مکاتیب قابل ذکر ہیں۔مگر مولانا محمد حسین آزاد کے معاصرین میں خطوط نگاری میں سرسید احمد خان ، مولانا شبلی نعمانی اور حالی کے مکاتیب ایسے ہیں جن پر روشنی ڈالی جائے گی، کیونکہ مرزا غالب کے بعد ان کے مکتوبات کو اردو ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

سرسید احمد خان

سرسید احمد خاں کے سامنے اُردو مکتوب نویسی میں فن سے زیادہ مقصدیت اور افادیت تھی۔ اسی لیے ان کے خطوط زبان و بیان کے ساتھ ساتھ عمل کے لحاظ سے بھی افادیت کا ایک نمونہ ہیں جن میں نجی زندگی کا نقشہ بھی ہے اور تعلیمی و اصلاحی سرگرمیوں کا خاکہ بھی گویا سرسید احمد خاں کے خطوط ہندوستان کے گذشتہ پچاس برس کا عکس ہیں ۔سرسید احمد خاں ایک ریفارمر اور مصلح قوم تھے۔ ان کا مقصد قوم کی اصلاح کرنا تھا۔ وہ قوم کی بھلائی چاہتے تھے۔قوم کے دکھ درد میں بے قرار ہو جاتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے خطوط سے بھی قومی بھلائی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے خطوط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کن لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور کن کی عزت کرتے ہیں ، کن کا احترام مقصود ہے ، کن لوگوں سے ناراض ہیں اور کن لوگوں سے مروت اور رواداری برتتے ہیں۔ سرسید احمد خاں کے خطوط بہت ہی سادہ ہیں۔ ان کے خطوط میں کہیں تکلف کا رنگ نہیں۔ سرسید احمد خاں جیسے تھے

ویسے ہی تاثرات کا اظہار اُنہوں نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہَے ۔غرض جو ان کے دل میں تھا وہی تحریروں میں بھی ہَے ۔ان کا طرز تحریر زور دار مگر صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ہے۔ ان کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اُردو میں برتی جاتی تھی، ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔''مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو''۔یہ سید صاحب کا عمل تھا۔ اور حقیقت میں یہی حال ان کی تمام تحریروں کا ہے۔ ان کی عبارت ان کے ادائے مطلب سے کبھی قاصر نہیں ہوتی۔ ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔اُردو نثر لکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے کہ ان کے پیشتر کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ مولانا حالی تو ان کو''نثر اُردو کا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہُیں۔''[1] سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے، نیز اپنے مضامین کے حسن و قبح کو بھی نہایت زور دار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے۔ سرسید کے خطوط کی بڑی خصوصیت اُن کی سادگی اور بے تکلفانہ طرز تحریر ہے۔غرض کہ جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے، وہی نوک قلم پر بھی آجاتی ہے۔

سرسید احمد خاں کے خطوط کے ذریعہ کسی مصلح یا ریفامر کے صحیح خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے خطوط کی برجستگی اور بے تکلفی ایک سرمایہ ہَے جس میں تصنع کا نام نہیں۔بقول حالی ''وہ جواب دینے میں فیاض تھے''۔[2] یہاں تک کہ اپنے دوستوں کو اپنے ہاتھ سے خط لکھتے جس میں مزاح وظرافت کا رنگ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔خط کے اختتام پر اپنے آپ کو ہمیشہ خاکسار لکھا کرتے تھے۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے نام لکھے ہوئے ایک مکتوب کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

جناب مخدوم ومکرم۔من !

میرے دل کو اُس دن آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہونے کا نہایت رنج ہے۔حقیقت میں اس قدر کام تھا کہ حاضر ہونا بالکل بھول گیا۔ نہایت نادم ہوں۔

ندامت کا افسوس نہیں ہے کیونکہ آپ سے ندامت ہونا کچھ بات نہیں ہے۔مگر درحقیقت مجھ کو رنج ہے اور وہ اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ میں دولت خانے پر، خواہ چادر گھاٹ میں خواہ پہاڑ پر، جہاں آپ ہوں، حاضر ہو کر الوش خوری کر کے رنج کو مٹا دوں۔ پس اگر کل آپ تشریف رکھتے ہوں تو مجھے علی الصباح مطلع فرمایئے، میں حاضر ہوں۔ ورنہ پہاڑ پر جس دن آپ فرماویں، حاضر ہوں۔جو دلی نیاز کہ مجھ کو آپ سے ہے وہ حاجتِ بیاں نہیں رکھتا۔ والسلام

۲۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء　　　　　　　　خاکسار، سید احمد[۳]

سر سید احمد خاں نے خطوط نویسی میں بھی وہی انداز قائم رکھا جو ان کا مقالہ نویسی میں تھا۔ مقالہ نویسی میں وہ صاف اور سچی بات کا اظہار بلا تامل کر دیتے تھے۔جو ان کی صفائی قلب اور اظہار خیال کی آزادی کی دلیل ہے۔ بحث و مباحثہ میں بھی سید صاحب تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح ان کے خطوط میں بھی جذباتی گفتگو کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔بعض لوگوں کو سر سید کی پالیسوں پر اعتراضات رہے کہ انہوں نے انگریز پرستی سکھائی، لیکن اگر سر سید احمد خان ایسا نہ کرتے تو مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے۔

سر سیداحمد خاں کا رجحان طبع ان کے خطوط سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ کس قدر پر عزم اور باحوصلہ انسان تھے۔ان کے اپنے بھی دشمن تھے اور پرائے بھی، لیکن سر سید احمد خاں ان باتوں سے بے نیاز قوم کی بھلائی کے لئے کام کرتے رہے۔وہ کسی کام کو کرنے سے پیشتر اچھی طرح اس کے نتیجہ پر غور کر لیتے تھے۔اس کے بعد جب ارادہ کر لیتے تو پھر پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

سر سید احمد خان اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ کے ایڈیٹر کے نام لکھتے ہیں:

۔۔۔۔کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہوا جس کا کوئی نہ کوئی مخالف نہ ہوا ہو۔ پس جس شخص کی مخالفت میں لوگ ہیں اس کا اور اس کے دوستوں کا یہ کام نہیں ہے

کہ مخالفوں کی باتوں کا جواب دیتے پھریں اور (اس) بے فائدہ اور مہمل کام
میں اپنا وقت ضائع کریں۔ بلکہ اس کا اور اس کے دوستوں کا یہ فرض ہے کہ
مخالفوں کی گفتگو کو سنیں اور ان کی تحریروں کو بخوشی پڑھیں اور نہایت سچائی سے غور
کریں کہ حقیقت میں وہ عیب (اور) نقصان اس میں ہیں جو اس کے مخالفوں
نے نکالے ہیں یا نہیں۔ اگر ہوں تو ان مخالفوں کا شکر کرنا چاہیے کہ انھوں نے
اپنی مہربانی سے اس عیب سے مطلع کیا اور اگر نہ ہوں تو بھی خدا کا شکر کرنا چاہیے
کہ وہ عیب جو مخالف لگاتے ہیں، اُس میں یا اُس کے دوست میں نہیں ہیں۔ اور
کسی رد و قدح پر متوجہ ہونے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ جو بات جھوٹی ہے وہ
تھوڑے ہی زمانے میں ازخود مثل جھوٹے موتی کی آب کے بے آب ہو جاوے
گی۔ خواہ وہ بات خود اس شخص کی ہو، خواہ اس کے مخالف کی۔ ۔۔۔۔۔[۴]

سرسید احمد خاں کے اُسلوب تحریر کی پانچ اہم خوبیاں ہیں۔

۱۔ سادگی اور سلاست
۲۔ مطلب نگاری اور مدعا نگاری
۳۔ بے ساختگی اور بے تکلفی
۴۔ منطقیت اور عقلیت
۵۔ مقصدیت

سرسید کا اُسلوب فطری ہے۔ وہ دل کی بات دل میں اُتارنے کے قائل ہیں اور اس کے لیے اُنہوں نے سیدھا سادہ اور براہ راست اندازِ تحریر اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اس سے سرسید کی تحریروں کا ادبی حسن مجروح بھی ہوا لیکن سرسید اپنے مشن اور مقصد کے اعتبار سے کامیاب ہوئے۔ سرسید اپنے مشن کے پیش نظر توسیع نثر کا کام کرنا چاہتے تھے جس سے ان کا مشن بخوبی پھیل سکے۔ اگر وہ زبان کی تراش خراش، تزئین و آرائش اور تصنع میں پھنسے رہتے تو جتنا بڑا سرمایہ ادب انہوں نے پیدا کیا، اس کا عشرِ عشیر بھی پیدا نہ کر سکتے تھے۔

ان کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سرسید نے خود تہذیب الاخلاق اختتام سال ۱۸۹۱ء میں تحریر کیا ہے۔

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ وضع کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پُرکشش رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور اس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا تُک بندی سے کہ وہ اس زمانے میں مقفّی عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ دی۔''[۵]

اس میں کوئی شک نہیں ہَے کہ سرسید کی نثر میں تخلیقی آب و رنگ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اِس میں نثر کی بیشتر بُنیادی خصوصیات ضرور ملتی ہیں۔ اِس سے اِنکار نہیں کہ اُردو زبان میں توانائی اور ہر رنگ میں ڈھل جانے کی صلاحیت سرسید کی دین ہَے۔ سرسید کے سامنے اولین کام قوم کی فلاح و بہبود تھا۔ سرسید کے رفقاء نے جو عظیم تخلیقی کارنامے انجام دیئے اُن کا سہرا بھی سرسید کے سر ہَے۔ سرسید کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مقاصد اعلیٰ ہوں تو اُن کے فیضان سے زبان خود بخود ارفع و اعلیٰ ہو جاتی ہَے۔

بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

غالب کی مکتوب نگاری نے خطوط کو اپنے تاثرات کا عکس بنا کر پیش کیا، لیکن ہندوستان کے پچاس برس کے علمی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی واقعات کا فوٹو سرسید ہی کے خطوط ہیں۔ اسی لیے دونوں کے بیان میں ایک نمایاں فرق تھا۔ جس کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہ ایک کو غم عشق تھا لیکن دوسرے کو غمِ روزگار۔ ایک اپنے جینے کے لیے مرتا تھا دوسرا دوسروں کے جینے

کے لیے دم دیتا تھا۔ اک مفکر تھا دوسرا مصلح۔ ایک کی انشا پردازی میں اپنے غم کا رونا ہے دوسرے کے خطوط میں قوم کا رونا۔ ایک کو وسعت بیان کے لیے تنگنائے غزل سے نکلنے کی فکر تھی تو دوسرے کے سامنے ادب کے گوشوں کا تقاضا حیات فرد نہیں تھا، بلکہ حیات قومی۔ غالب کے خطوط اگر فرد کی کائنات غم کا دفتر ہیں تو سرسید کے خطوط مِلّت کی بہبودی کا بحر بیکراں۔ ایک کے خطوط میں ہم اس کی تصویر دیکھتے ہیں دوسرے میں ہم اپنی تصویر، دُنیا کی متمدن سوسائٹی میں فرد اور ملت کا رشتہ نہ ٹوٹتا ہے اور نہ ٹوٹ سکتا ہے۔ اِسی لیے سرسید نے ملت کی بقا اور عزت کے لیے افراد کی زندگیوں کو سنوارنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔ سرسید کے ایثار کی یہ قابل قدر مثال کم نہیں ہے۔ کہ بقول آرنلڈ "جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ تو نہ اِن کے پاس رہنے کو گھر تھا اور نہ مرنے کے بعد تجہیز وتکفین کے لیے پیسہ۔"[۶]

سرسید احمد خان کے خطوط کی اہمیت کا اندازہ مولانا حالی کے ان الفاظ سے بھی ہوتا ہے۔ جو قارئین کو سرسید کے خطوط جمع کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

> افسوس کہ اب تک کسی نے سرسید کے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگرچہ اُمید نہیں ہے کہ اِن کا دسواں حصہ بھی اب فراہم ہو سکے لیکن جس قدر دستیاب ہو سکیں اُن کا جمع کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ ایک ایسا مجموعہ ہو گا جو غیروں کو اپنا بنانا اور وحشیوں کو رام کرنا سکھائے گا۔ وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہو گا۔ وہ آیندہ نسلوں کو یاد دلائے گا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ریا اور کیسے محبت والے ہوتے تھے۔ کس طرح دوستوں کا دِل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے اور کیوں کر اُن کے دِلوں کا شکار کرتے تھے۔[۷]

احمد ندیم قاسمی ''مکتوبات سرسید، جلد اوّل کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں:

مکاتیب علم و ادب کی نہایت دلچسپ صنف ہوتے ہیں کہ اُن کی تصنیف کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں نہیں آتی اور نہ ہی مکتوب لکھنے والے کو اس طرح کا کوئی شبہ ہوتا ہے کہ یہ تحریر کسی روز پوری قوم کے زیرِ مطالعہ ہوگی۔ اس صورت میں مکاتیب میں جو بے تکلفی اور بے ساختگی ہوتی ہے، اس کی کوئی ایک بھی مثال کسی صنفِ ادب کے پاس نہیں ہے۔ اُن شخصیات کے مکاتیب بطورِ خاص دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ جن کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تاریخ وتمدن کے ایوانوں کی تعمیر میں حصّہ لیتا ہے۔ سرسید کے یہ مکاتیب اسی لیے صرف ایک بڑی شخصیت کے کردار ومزاج ہی کے عکاس نہیں ہیں بلکہ ہماری قومی تاریخ کی کتنی ہی دلچسپ اورمعلومات افزا جزئیات کی پردہ کشائی بھی کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات بے حد متنوع ہیں۔علم و ادب اور تعلیم وتہذیب سے لے کر عزیزوں اور دوستوں کے معاملات میں سرسید کی دلسوزی کے ساتھ حصّہ داری ان مکاتیب میں موجود ہے۔ چنانچہ یہ نہ صرف سرسید کی شخصیت کی مزید تفہیم میں مددگار ثابت ہوں گے، بلکہ ان کی اس تحریک کے پس منظر اور پیش منظر کو بھی نمایاں کریں گے جس نے مسلمانوں کو برعظیم کے حالات سے نمٹنا اور پھر ان پر چھاجانا سکھایا۔[۸]

سرسید احمد خاں کے خطوط پڑھ کر ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ان کے خطوط بالکل ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے حقیقت میں وہ خود تھے۔سرسید احمد خاں خطوط کا جواب جلدی دیتے تھے۔گالیوں بھرے خطوط پردھیان نہیں دیتے تھے۔اسی طرح اپنے پر اعتراض کرنے والوں اور اپنے مخالفین کے خطوط کو ضائع کر دیتے تھے اپنے دوستوں اور محبت کرنے والوں کی بیماری سے حد درجہ بے چین اور فکر مند ہو جاتے تھے۔اور اُن کو بار بار تار بھیجتے اور خطوط لکھتے تھے تا کہ اُن کی بیماری کے بارے پتہ چل سکے کہ اس بیماری سے چھٹکارا پایا ہے یا نہیں، اپنے مخصوص دوستوں

اور یاروں کو جس دلچسپ اور پُر لطف انداز میں خط لکھتے تھے۔اس بارے مولانا حالی لکھتے ہیں:

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔جو خط کہ پانی پت سے علی گڑھ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اُس کا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے جواب آجاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو۔ جب کہ اُن کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھنا چاہیے کہ اپنے خالص دوستوں اور ہمسروں اور ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔دوستوں کو معذوری کی حالت کے سوا وہ ہمیشہ پرائیویٹ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے البتہ مدرسہ وغیرہ کے متعلق جو خط لکھتے تھے وہ اکثر پیش دست لکھتا تھا اور وہ خود بتاتے جاتے تھے لیکن جو فضول تحریریں لوگ ان کے پاس بھیجتے تھے اُن کا کچھ جواب نہ دیتے تھے۔جس خط کا جواب لکھ چکتے اس کو فوراً چاک کر ڈالتے تھے کبھی اُنھوں نے کسی تحریر کو اس خیال سے کہ مخالف کو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے ، اپنے پاس دستاویز بنا کر نہیں رکھا۔جب کسی خالص ومخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آتی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ برابر تار پر تار یا خط پر خط بھیجتے رہتے۔ جو خط کہ وہ اپنے بے تکلف اور خالص ومخلص دوستوں کو لکھتے تھے اُن کا اندازِ تحریر فی الواقع ایسا دلکش اور دل نشیں ہوتا تھا کہ اگر اُس کو جادو یا افسوں یا سحر کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔[۹]

علی احمد فاطمی سرسید کے خطوط، ایک عمومی جائزہ میں لکھتے ہیں:

انیسویں صدی میں غالب کے بعد دوسری بڑی شخصیت سرسید کی ہے جن کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر خطوط کلکٹر ، پرنسپل ، رجسٹرار ، سکریٹری ، ایڈیٹر یا سرکاری و نیم سرکاری اداروں و افسروں کو لکھے گئے ہیں ظاہر ہے ان میں وہ کیفیت ، دلچسپی اور اثر آفرینی ممکن نہیں جو غالب کے خطوط میں ہے۔ پھر غالب غالب ہیں اور سرسیّد۔سرسیّد۔ ایک

شاعر دوسرا ادیب ، ایک بے باک اور لااُبالی دوسرا محتاط اور ڈپلومیٹ ، ایک فنکار ، اور دوسرا معمار اور بھی بہت کچھ بدلا بدلا سا اس لیے فرق تو ہونا ہی چاہیے لیکن اس فرق اور ایسے خطوط کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے ، اس لیے کہ یہ ایک بڑے معمار قوم اور تحریک کے بانی کے خطوط ہیں۔

اسی جائزے میں آگے وہ لکھتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ سرسید نے مکالمہ کو مجاہدہ میں تبدیل کر دیا اور اِس کے رشتے جرأت اظہار ، حقیقت کی پیکار اور تاریخ کے آزار و آثار سے اِس طرح جوڑ دیے کہ انیسویں صدی کے تمام عوامل ومحرکات کو سرسید کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا اور اصل سرسید اور ان کے مشن کو ان کے خطوط کے بغیر سمجھ پانا ناممکن نہ سہی تو مشکل ضرور ہے۔[۱۰]

سرسید احمد خان کی مکتوب نگاری میں ان کی زبان سلیس اور عام فہم ہے اور ان کا اندازِ تحریر دلکش اور بے تکلف ہے۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے وہی نوکِ قلم پر بھی آجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوبات میں بے پناہ خلوص اور صداقت ہے۔قوم کی بھلائی اور ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس طرح ان کی عام نثر میں اصلاح اور قوم کی بھلائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔اسی طرح ان کے مکتوبات میں بھی اصلاح اور قومی بھلائی کا جذبہ موجزن ہے۔سرسید احمد خان کے مکتوبات میں علمی ، مذہبی ، سیاسی ، تعلیمی اور معاشرتی غرض کہ ہر طرح کے معاملات اور مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے مکتوبات ایک خاص مقصد ، حقیقت ، واقعیت اور وضاحت کے زیرِ اثر لکھے گئے ہیں۔سرسید احمد خان کا لب ولہجہ بھی علمی ہے۔ لہٰذا ان کے مکتوبات افادی ہونے کے ساتھ ساتھ علمی اور فکری پہلو لیے ہوئے ہیں۔سرسید احمد خان کی ادبی تحریک اور ان کے شخصی رنگ مکتوب نگاری نے خاصی حد تک اُردو خط و کتابت پر اثر ڈالا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نے جب مکتوب نگاری کا آغاز کیا تو اِن کے سامنے اُردو خطوط نویسی کے تین نمونے موجود تھے۔ غالب کے خطوط، سر سید احمد خان کے خطوط اور مولوی محمد حسین آزاد کے خطوط۔

آزاد کے خطوط فنِ انشاء پردازی کا اہم نمونہ تھے۔ آزاد کی ادبیت، زورِ بیان اور تخیل کی کرشمہ سازی اِس بلا کی تھی کہ دوسروں کے لیے اِس میدان میں قدم رکھنا آسان کام نہ تھا۔ ان کی نثر سرتا پا شعر تھی۔ وہ ہر بات کو تشبیہہ و استعارہ کے پیرایہ میں اِس انداز سے بیان کرتے کہ دوسروں کے لیے یہ اندازِ بیان اپنانا اُن کے بس کی بات نہ ہوتی بلکہ ششدر و حیران رہ جاتے۔

بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

> آزاد تن کی عریانی کے قائل نہ تھے بلکہ عروسِ ادب کی زلفوں کو آراستہ کرنا ہی پیرایہ بیان کی شستگی سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے زبان کو حسن بخشا اور حُسن کو حُسن کمال۔ اسی لئے شبلی جیسا ناقد بھی اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی سبب تھا کہ آزاد کی کوئی تاسی نہ کرسکا۔ بقول شیخ محمد اکرام" شبلی کی اہمیت سر سید کے گروہ میں ہونے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ وہ عمر میں سب سے چھوٹے اور ذہانت میں کسی سے کمتر نہیں۔ اُن کی دو حیثیتیں تھیں ایک عالم ہونے کے لحاظ سے اور ایک اُردو کے مایہ ناز انشا پرداز ہونے کے سبب۔"

معین الدین احمد انصاری لکھتے ہیں :

> مولانا شبلی کے مکتوبات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے خطوط میں غالب کے خطوط کی سی شگفتگی ہے۔ بعض خطوں میں مکالموں کا بھی وہی انداز ہے جو غالب کے بعض خطوط میں پایا جاتا ہے۔ ان کے مکاتیب میں سر سید کی طرح قوم اور مذہب

سے محبت کا شدید جذبہ ہے۔اقبال کے خطوط میں جس طرح علمی مسائل پر گفتگو
اور مختلف مشاغل کا حال ہوا کرتا تھا وہی بات شبلی کے مکاتیب میں ہے۔ ابوالکلام
سے تو شبلی کو بڑی ہی مناسبت ہے۔ ان دونوں کے خطوط ان کی طبیعتوں کو واضح
طور پر پیش کرتے ہیں۔ دونوں کی طبیعت انفرادیت پسند ہے۔خود شناسی کا جذبہ
دونوں کے پاس ہے۔ اس لیے دوسروں کو ذرا کم ہی خاطر میں لاتے ہیں۔
انانیت دونوں میں ملتی ہے لیکن مایوسی اور محرومی کی ملاوٹ کے ساتھ۔ مذہب کے
معاملے میں دونوں کے پاس عقل کا دخل ہے لیکن آزاد جذبات کو غالب ہونے کی
اجازت نہیں دیتے اور شبلی بعض وقت جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ ان
دونوں کے خیالات سے اتفاق رکھنے والے اور ان کے مزاج کو سمجھنے والے ذرا
مشکل ہی سے ملتے ہیں لیکن شبلی نے آزاد کو سمجھا اور ان کی قدر کی۔ آزاد نے شبلی
کو مانا اور ان کی عزت کی۔غرض ان کے خطوط ان کی شخصیت کا صحیح پرتو ہیں۔"[۱۲]

اُردو مکتوب نگاری میں غالب کے بعد شبلی نے بلند تر ذہنی اور ادبی صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔زبان و ادب کے لحاظ سے شبلی کے مکاتیب ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔جہاں تک نازک جذبات و احساسات کے اِظہار کے لیے خطوط کو وسیلہ بنانے کا تعلق ہے اس میں شاید شبلی پہلے مکتوب نگار ہیں۔

مکاتیب شبلی کے بارے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں"اگر اِن مکاتیب میں
کاروباری مطالب کی بھرمار نہ ہوتی تو شبلی کے خطوط غالب کے خطوط کی صف
میں رکھے جا سکتے تھے"۔[۱۳]

شبلی نے اپنے مکتوبات میں اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے۔ اِن کے خطوط اِن کے طرزِ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔"مکاتیب شبلی" میں علمی و ادبی نکات ملتے ہیں۔خطوطِ شبلی کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا ہے اِس سے شبلی کی زندگی اور ذہن کے وہ نازک گوشے بھی سامنے آ گئے ہیں جن کا سراغ

کسی اور جگہ ممکن نہیں ۔ شیخ محمد اکرام شبلی کو عشقیہ خطوط کے بانی کہتے ہیں ۔"[۱۴] اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کیونکہ اِن ہی کے خطوط سے اُردو کی عشقیہ خط نویسی کی ابتدا ہوئی ہے ۔ دراصل مولانا شبلی نعمانی کی زندگی دو خانوں میں بٹ گئی تھی ۔

بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

> اِن دونوں خانوں کی نقاشی دو مختلف مکاتیب فکر نے مختلف ہی کی ہے ایک طرف ندوۃ العلماء کا گروہ ہے۔ دوسری طرف علی گڑھ کے نقاد۔ ایک کے سربراہ سید سلیمان ندوی ہیں اور دوسرے کے شیخ محمد اکرام۔ایک کے خیال میں شبلی سید العلماء ہیں تو دوسرے کے خیال میں عشقیہ خطوط کے بانی ۔ ایک کی نگاہ میں شبلی مجد دوقت ہیں تو علی گڑھ والوں کی نگاہ میں شبلی یونانی ۔ ایک کے سامنے شبلی کی زندگی عمامہ و جبّہ کے ساتھ نظر آتی ہے تو دوسرے ان کی زندگی میں بمبئی کی رعنائیاں جلوہ فگن پاتے ہیں ۔ دونوں کا نقطۂ نظر ، اِنتخاب، انداز بیان اور پیرایۂ کلام ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ دونوں صرف اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں شبلی کی صرف ایک زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ۔ اور دوسری زندگی سے رابطہ کچھ یوں ہی سا رہ جاتا ہے لیکن اِس میں شبہ نہیں کہ شبلی عمامہ اور جبّہ کے اندر نئی زندگی کی تڑپ رکھتے تھے ۔ وہ ٹھیٹ قدامت پسند عالم نہیں رہے تھے ۔اور سرسید کے فیضِ صحبت نے انھیں نئے ماحول سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ دوسرے عالموں کی طرح تنگ خیال نہیں تھے ۔ سرسید کی قربت نے اُن کے علم کو جلا دی تھی اور اُنھی کی بزرگانہ شفقتوں نے شبلی کی جولان گاہِ علمی کے میدان کو وسیع کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سرسید جو وسعتِ قلبی لے کر آئے تھے وہ شبلی میں نہیں تھی ۔ اِسی لیے شبلی ریفارمر نہ بن سکے۔شبلی ندوۃ العلماء میں زیادہ عرصہ قیام نہ کر سکے نہ ہی علی گڑھ میں لیکن جو علمی راہیں سرسید کی راہنمائی کے سبب اُن کے سامنے کُھل گئی تھیں ، اُنہوں نے اُن راہوں کو اختیار کر کے اپنے لیے ایک مقام متعین کر لیا۔[۱۵]

مولانا شبلی نے نئے نئے اسالیب اختیار کیے۔ اُن کا قلم رنگا رنگ انداز میں اہلِ نظر کو دعوتِ نظارہ دیتا رہا۔ اُن کی زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کبھی اُنھیں علی گڑھ کی فکر لاحق ہوتی اور کبھی ندوۃ العلماء کی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی سرسید احمد خاں سے اُلجھتے اور کبھی قدامت پسند علماء سے ناراض ہو جاتے اور یہی رنگ ان کے خطوط میں بھی جھلکتا ہے۔ کہیں اُن کے خطوط میں جلال ہے اور کہیں جمال۔

سید سلیمان ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> مولانا کے خصوصیات انشاء پر بھی کچھ عرضِ خیال کا ارادہ تھا لیکن اسی زمانہ میں ہماری زبان کے جادو نگار انشاء پرداز جناب ایم مہدی حسن صاحب نے اس موضوع پر ایک دلچسپ تحریر لکھ کر بھیجی، چنانچہ مسرت کے ساتھ ہم اس موقع پر اپنی جگہ سے ہٹ کر ان کو آپ کے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔
>
> تعلقات کی تدریجی رفتار کے ساتھ، تحریر کا لب و لہجہ بھی بدلتا گیا ہے۔ جس طرح مولانا کی تقریر برجستہ اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی، پچھلے تذکرے اس طرح کرتے تھے کہ یاران کہن کی بزم سے اُٹھ کر ابھی آئے ہیں، اور باتوں باتوں میں سب کچھ یوں کہ جاتے تھے گویا واقعات سُنے سُنائے نہیں آنکھوں دیکھے ہیں، یہ مادّہ اجتہادی جسے جانِ ادب کہیے، ان کی وسیع معلومات کے ساتھ ان کی تقریر کا خاصہ امتیاز تھا، ان کی شستہ رفتہ اور نہایت پاکیزہ تحریروں میں یہ رنگ اور نکھر جاتا تھا، شراب محبت تھی جو کھنچ کھنچا کر دوآتشہ ہو جاتی تھی، نج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا، یعنی اظہار خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے، اس لیے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشاء پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔ اچھے اچھے بولنے والوں، بعض چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں سیدھی سادھی نہیں لکھ سکتے۔ مولانا میں یہ خاص جامعیت تھی کہ جس طرح بولتے تھے، اسی طرح لکھتے بھی تھے اور نہایت خوشخط لکھتے تھے۔

مولانا خاص حالتوں کے سوا لکھنے میں پہل کم کرتے تھے، لیکن ملک کے سب سے بڑے متجمع ؟صفاتِ کمالیہ انسانی یعنی سالار جنگ اعظم کی طرح واپسی ڈاک جواب دینے کے عادی تھے۔

جس روز ڈاک میں مولانا کا خط ملتا تھا، اس کا پڑھنا پڑھانا میرے لیے ایک ایسا عیش ہوتا تھا جسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ سوادِ خط اتنا پیارا ہوتا تھا کہ میں نے عمدہ سے عمدہ ولایتی کاغذ اور لفافے بہم پہنچائے کہ تحریر کے حسنِ ظاہری کی چمک دمک کچھ اور بڑھ جائے، لیکن طبیعت اس کی پابند نہیں رہتی تھی۔ کبھی کارڈ پر ٹالتے تھے کبھی اس طرح لکھتے تھے کہ کاغذ اور لفافہ، تاہم میرے پاس بعض خطوط ایسے محفوظ ہیں جو اس لائق ہیں کہ ان کی عکسی ہاف ٹون کاپیاں لی جائیں۔ حُسن کہیں ہو، کسی حیثیت سے ہو فطرت کا وہ پاکیزہ مظہر ہے جس سے حافظ کی شراب معرفت کی طرح قطع نظر نہیں کی جاسکتی، مولانا ادبی حیثیت سے اس کا نہایت صحیح مذاق رکھتے تھے، عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ اُن کی حکیمانہ شوخیاں سرمایۂ ادب ہوتی تھیں۔ مولانا نہایت خوش ترتیب تھے، اونچے طبقے کی سوسائٹی میں بہت مانگ رہتی تھی جہاں وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہوتے تھے۔ ملک کے بعض نہایت اونچے خاندانوں سے مخلصانہ روابط تھے ان میں بعض لیڈیاں نہایت شائستہ قابل اور مولانا کے مذاقِ ادب کی دلدادہ تھیں، ان کو کبھی خط لکھتے تھے تو اس طرح جیسے سرکاری گزٹ! بہت ہوا ''دعائیں'' لکھ دیں، ایک کو لکھا کہ ''کچھ نہیں'' میں نے عرض کیا، مولانا مقصود بالذات تو وہی تھی یہاں بھی امتیاز رہا۔ سُن کر پھڑک گئے اور میرے انتقالِ ذہن سے خوش ہوتے رہے۔

اسی طرح ایک رئیس نے جن کی بیوی نہایت حسین تھیں، مولانا سے پوچھا، جنسِ لطیف میں کن کن اوصاف کی ضرورت ہے؟ مولانا نے کہا اُسے صرف حسین ہونا چاہیے، اس فقرے کا میاں بیوی پر جو اثر ہوا تھا، آج تک سماں آنکھوں میں ہے۔ بہرحال خطوں میں نسبتاً کم کھلتے تھے، لیکن مجھ پر خاص عنایت تھی، اس لیے

راز نہیں رکھتے تھے ، تاہم تصریحات کی جگہ آپ دیکھیں گے چشمِ سخن صرف اشاروں سے کام لیتی ہے میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا، اور یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر تصریح طلب نکتوں کی بے نقابی میں نے جائز نہیں رکھی ، میرا خیال ہے آفتابِ علم کی ضیاء یک طرفہ (خطوط) ان کی مستقل تصنیفات کے مقابلہ میں نسبتاً کم دلچسپ نہیں ہے۔[۱۶]

بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

اُردو میں اُن کے خطوط برنگ شفق آسمان ادب پر چمکے اور اپنی رنگا رنگی بوقلمونیوں سے تضاد کا رنگ جھلکتا دکھائی دینے لگا کسی نے اُن کے خطوط کو قومی اعمالنامہ کہا۔ کسی نے اُن کے خطوط میں قوم کی زندگی کے لیے تڑپ پائی ، میں سمجھتا ہوں کہ قومی اعمالنامہ تو سرسید کے خطوط ہیں۔ البتہ شبلی کے خطوط سرسید کا محاسبہ ہیں ۔ ان کے خطوط میں تضاد کی بڑی وجہ خود اُن کی اندازِ طبع تھی وہ کام کی تڑپ رکھتے تھے ۔ لیکن علی گڑھ کو جب سراسر مغربی رنگ میں ڈوبتے دیکھا اور اپنے مشرقی علوم سے کنارہ کشی کرتے دیکھا تو علی گڑھ میں رہنا گوارا نہ کر سکے۔ ندوۃ العلماء کو انگریزی تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن یہاں قدامت پسندی نے اپنے پنجے اس طرح گاڑ رکھے تھے کہ شبلی کی کچھ نہ چل سکی اور تڑپ کر رہ گئے اُنہوں نے چند تمناؤں اور آرزوں کے ساتھ ندوۃ العلماء کے قیام میں حصّہ لیا تھا۔ وہ اُمیدیں قدامت پسند علماء نے پوری نہ ہونے دیں۔ دراصل شبلی مفاہمت چاہتے تھے لیکن شبلی اس مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔[۱۷]

یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی کی انشاپردازی میں زندگی سے مایوسیوں کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ شبلی نعمانی کے وہ خطوط جو اُنہوں نے عطیہ بیگم کے نام لکھے ہیں ، اُن میں اُن کے ادبی جوہر، دلی تاثرات واحساسات کا اِظہار ہوتا ہے۔ مولانا شبلی رنگا رنگ صفات کے مالک تھے ۔ وہ رومانیت پسند تھے جو ان کی تصنیف شعرالعجم اور عطیہ بیگم کے نام خطوط میں جھلکتی ہے۔ ان کے خطوط ملکی

قومی ، مذہبی اور اصلاحی خیالات کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ مولانا نے اپنے اُردو خطوط کو اتنی اہمیت نہ دی جتنی فارسی خطوط کو وہ دیتے تھے۔ اِسی لیے اُنھیں فارسی خطوط بہت عزیز تھے اور اُن کو سنبھال کر بھی رکھتے تھے۔ مولانا کی تحریر صاف و شفاف حشو و زوائد سے پاک تھی۔ وہ لکھنے میں پہل کم کرتے تھے لیکن ادبی اعتبار سے پاکیزگی حسن کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کہیں کہیں تشریحی انداز میں اِس طرح لکھتے تھے جیسے سرکاری گزٹ اور کبھی اِتنا مختصر لکھتے کہ صرف ہاں یا نہ پر جواب ہوتا۔ آداب والقاب کی پروانہیں کرتے تھے۔ اپنے دوست احباب کو خطوط کا جواب پابندی سے دیتے تھے اور مختلف لوگوں سے اُن کے علمی ذوق مقام و مرتبہ کے مطابق بات چیت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> آداب و القاب کی پروانہیں کرتے تھے۔ اکثر بلاتمہید مطلب شروع کر دیتے تھے (قدما کا یہی طرز تھا) جس کا بڑا خیال کیا ، اس کو صرف ایک دو لفظ القاب کے لکھ دیتے ۔ تمام مکاتیب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آئیں گے۔[۱۸]

بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی :

> وہ خطوط جو شبلی کے علمی نقوش کے پس منظر ہو سکتے ہیں ، وہ مولوی حبیب الرحمان ، پروفیسر عبد القادر ، حمید الدین ، عبد الماجد اور مہدی الافادی کے نام ہَیں ، جن کی علمی خوشبوؤں سے دماغ معطر ہو جائے لیکن وہ خطوط جو شبلی کے نفسیاتی پس منظر کو پیش کریں ، جو اُن کے احساسِ جمال کی نازک خیالیاں ہم پر آشکارا کریں جو شبلی کے روانی طبع کے دھارے کا رُخ بتائیں ۔ وہ صرف مخصوص خطوط ہَیں جو بقول ڈاکٹر خورشید خاصہ کی چیز ہیں ۔ جن کی خاطر شبلی کو مطعون کیا گیا اور ان کی زندگی پر تنقید کرنے والے اگر یہ کہتے ہَیں کہ شبلی نے سرسید ہی سے کسبِ کمال کیا تو اس

میں کوئی مبالغہ نہیں۔ لیکن یہ عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ انہوں نے ہی سرسید سے
وہ کسبِ فیض حاصل کیا جو اچھے اچھے نہ کر سکے۔اُن کے مزاج کی بوقلمونی نے
راجپوتی خون اور اسلامی رنگ کے امتزاج کو ظاہر کر دیا۔شبلی کی انشاپردازی نے
خطوط میں اپنی جدت پسندی کو قائم رکھا۔ اور جہاں موقع مل گیا وہاں قلم کی جولانی
پھر کسی سے نہ رک سکی، اگر مایوسیاں شبلی کے آڑے نہ آتیں تو کوئی تعجب کی بات
نہیں کہ وہ مولانا آزاد کی راہ اختیار کر لیتے وہ زاہد خشک نہ تھے۔لیکن ندوۃ العلماء
نے اِن پر اعتراضات کیے اور آزاد طبع کہا۔البتہ شبلی کی راہ کانٹوں کی راہ تھی جس
پر چلنا تمنائے آبلہ پائی کرنا تھا۔شبلی اس راہ پر چلے اور زندگی بھر یہ کانٹے نکالتے
رہے لیکن دل کا کانٹا نہ نکل سکا۔ اور لوگوں کے طعن و تشنیع سے وہ مایوس ہو کر
اعظم گڑھ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا راجپوتی رنگ قلم کے تیغ بُراں کی صورت میں
چمکا اور علی گڑھ کے ماحول سرسید کے فیضانِ نظر نے اُن کے محدود علمی دائرہ کو
وسعت قلب بخشی تھی۔اِسی لیے وہ ہر اُس چیز کے قدر دان تھے جس میں اُن کو
حسن ملے۔[۱۹]

الغرض شبلی کے قلم کی روانی نے ادب میں نئے نئے گوشے پیدا کر دیئے اور یہی جولانیاں
اِن کے خطوط میں بھی جھلکتی ہیں۔ مولانا شبلی خطوط کے جواب پابندی سے دیتے۔ اِس بارے مولانا
سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''مکاتیب شبلی حصہ اوّل'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> خطوط کے جواب پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے۔اکثر ایسا
> ہوا ہَے کہ خط لکھا اور آتے جاتے کا حساب لگا کر جو دن مقرر کیا، اسی دن جواب
> آ گیا۔ بیماری تک میں وہ وضعداری کو نباہتے تھے۔ بہت مجبور ہوتے تو دوسروں
> سے لکھا دیتے ۔چنانچہ مکاتیب کی دونوں جلدوں میں اس قسم کے خطوط ملیں
> گے۔[۲۰]

شبلی کے مکاتیب اپنی تازگی ،طرفگی ندرت ، ایجاز اور اپنے آشنایانہ وسخن گسترانہ انداز کے باعث مستقل قدر و قیمت کے مالک ہیں۔اِن میں مقصد بھی ہے اور پیغام کا اختصار بھی ہے۔ اِن کے مخاطبوں کے رتبہ و مقام کا لحاظ اِن کے جذبات ونفسیات کا پورا پورا شعور بھی موجود ہے۔

نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں مرحوم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

جناب من،

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی ، آپ لوگ مجھ کو اس قدر بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں اسکول کے لیے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا ، لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے ، باہر نہیں جاتا ، مجھ کو سرِ دست صما ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے ، اور یہی یہاں کا خرچ ہے۔ پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے خرچ بڑھتا جاتا ہے ، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل ، بدحیثیت ، بے وقعت ہو کر رہوں ، تو پس انداز ہوسکتا ہے ، باقی وہاں کے لیے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے۔

مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں ہے۔ کچھ ابراہیم ادھم یا بایزید نہیں ہوں ، میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں ، مجھ سے جوڑ توڑ ، سازش ، دربار داری ، خوشامد ، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم ،

اس لیے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا ،۔۔۔۔[۲۱]

سرسید کا دور اپنے بے تکلف اندازِ بیان کے لیے شہرت رکھتا ہے۔طرز بیان میں اگر اس کی لطیف روح کہیں جلوہ گر ہوئی ہے تو وہ شبلی کے خطوط و مکاتیب میں ہوئی ہے۔اِن کے خطوط میں

ذوق وشوق اور دل و دماغ کو سیراب و شاداب رکھنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہَے۔ ایسا محسوس ہوتا ہَے جیسے اِن کا ہر ایک خط زعفران کا پھول ہَے ، جس میں باغ فردوس کی خوشبو ہَے۔شبلی کے خط مختصر ہوتے ہیں۔ اختصار شبلی کی تحریروں کی خوبی ہَے مگر جو ایجاز اِن کے خطوط میں ہے ، اِس کو جان ایجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> نہایت مختصر لکھتے تھے کبھی کبھی صرف ہاں ، ناں پر اکتفا کرتے تھے ، مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دوفقروں میں دیتے تھے ، اس قسم کے سینکڑوں خطوط میرے پاس ہیں ، لیکن میں نے ان کو قصداً اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا، میری مرحوم بیوی (خدا اس کو غریقِ رحمت کرے) مولانا کے خط کو (تار) کہتی تھی۔[۲۲]

شبلی کے خطوط فرصت اور وقت گزاری کا مشغلہ نہیں ہیں۔اِن کا ہر خط کسی مقصد سے وابستہ ہَے۔شبلی کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہَے کہ وہ وقت کی اہمیت سے واقف ہیں اور وقت کی قدر کرتے ہَیں۔ وہ زندگی کے اس قیمتی وقت کو بہت اہمیت دیتے ہَیں۔ اِن کے نزدیک زندگی کا ایک پل بھی رائگاں نہیں۔ اِسی لیے اِن کے خط کا کوئی ایک لفظ بھی بے کار اور بغیر ضرورت کے نہیں۔ ہر لفظ بچا ، تلا اور ضروری ہوتا ہے مگر پُر تاثیر۔ اِن کے چھوٹے سے چھوٹے خط سے بھی ایسی تسکین ملتی ہے۔ جیسے کسی نے کوئی دلچسپ داستان پڑھ ڈالی ہے۔ ایک ہی مصرعے سے ، ایک ہی چبھتے فقرے سے ، ایک ہی استعارے یا ترکیب سے ، ایک ہی طنزیہ چھیڑ سے اِن کا خط لذتوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔

شبلی کے خط سب کچھ کہتے ہَیں ، لیکن اِن کی اپنی ذات کچھ پوشیدہ ہی رہتی ہے۔ مہک تو ہَے مگر پھول پر نظر نہیں پڑتی۔ شبلی کے خطوں میں جذباتیت ہے، مگر اختصار کی بدولت اِن کی جذباتیت ناگوار اور بُری نہیں لگتی۔ اِن کے خطوں میں زور اختلاطی کا رنگ نہیں بلکہ مکتوب الیہ سے ایک فاصلہ ہوتا ہے۔

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا [۲۳]

اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کا خیال ہے :

> لیکن درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے ، اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ معنی میں پوری وسعت موجود ہو ، یہی خصوصیت مولانا کی انشاپردازی اور بلاغت کی جان ہے۔ وہ ان ہی ایک دو فقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں ، ہم صفحوں میں ان کو نہیں کھپا سکتے۔ وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں ، اس زمانہ کے سامری سینکڑوں منتروں میں وہ روح نہیں پیدا کر سکتے۔[۲۴]

شبلی کے خطوط میں اپنائیت ، شفقت اور محبت کا رنگ ہے لیکن بالا دستی یہاں پر بھی ہے۔ اِن کے عام خط علمی و تنظیمی موضوعات پر ہیں۔ ان خطوں میں خصوصیت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہَے کہ ان کی بالا دستیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ان کے خطوں میں مکتوب الیہ کے متعلق خاص باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔اس لیے عام انداز میں دوسرے لوگوں کو اِن کے خط پڑھ کر بُنیادی اِنسانی رفاقتوں کی خوشیاں ذرا کم ہی حاصل ہوتی ہیں۔مگر اِن کے خطوں کی زمین اتنی مانوس اور شاداب ہوتی ہَے کہ سارا خط چمن کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔مخاطب کے ذوق کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہیں۔بعض اوقات خط میں مکتوب الیہ کے لیے تلخی بھی اسے تلخی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اُس کے لیے شادمانی کا باعث ہو جاتی ہے۔شبلی کی طبیعت میں جذبے ، جوش ، حسن سے متاثر ہونے اور عشق سے دلچسپی کی کمی نہیں۔ اِس لیے اِن کے خطوط رنگین بھی ہَیں اور دلکش بھی۔

مولانا شبلی کے تمام دلی کوائف اور مختلف واقعات طرز اظہار کی صورت میں ان کے خطوط میں موجود ہیں شبلی جب تاریخ لکھتے ہیں یا ناقد ہوتے ہیں تو ان کے قلم کا رشتہ دماغ اور عقل سے ہوتا ہے۔ان کی علمیت پر فکر اور فلسفہ طاری ہو جاتا ہے لیکن خطوط میں خاص طور پر نجی اور ذاتی خطوط

میں ان کے قلم کا رشتہ براہِ راست ان کے دل سے استوار ہو جاتا ہے۔ جذبات کی گرمی کی وجہ سے آزادی اور بے باکی سے لکھتے جاتے ہیں۔جن میں بے پناہ صداقت ہوتی ہے۔ تکلف اور تصنع کی دیوار حائل نہیں رہتی اور اسرارِ حیات بے نقاب ہونے لگتے ہیں۔غرض یہ کہ شبلی کے خطوط میں ان کی زندگی کے ہر دور اور تمام نشیب وفراز موجود ہیں جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔

ظفر الدین شبلی کی شخصیت ،خطوط کے آئینے میں لکھتے ہیں:

> شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمالنامہ ہیں ان میں شبلی کی خانگی زندگی نمایاں نہیں ہے لیکن پس پردہ جلووں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے۔ بہر حال ان خطوط میں ندوہ کے نقوش ہیں ، سیرت پر مکالمات ہیں ،شعرالعجم کے مباحث پر گفتگو ہے ، نادر کتابوں کی دریافت پر خوشی کا اظہار ہے ، تبصرے ہیں ، تنقیدی اشارات ہیں ، دوستوں کی سرگوشیاں ہیں ، عزیزوں کی سفارش ہے اپنی عظمت کا شعور ہے اور وہ لطائف ہیں جو روح اور بدن کو سرشار کیے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔[۲۵]

جس طرح مولانا شبلی نے اپنی قلم کی روانی سے ادب میں نئے نئے گوشے پیدا کیے اسی طرح ان کی قلم کی جولانیاں ان کے مکتوبات میں بھی جھلکتی ہیں۔وہ رومانیت پسند تھے۔ ان کی یہ خصوصیت عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے خطوط میں ملتی ہے۔مولانا شبلی رنگا رنگ صفات کے مالک ہیں۔ انہوں نے مکتوبات میں بھی اپنی جدت پسندی کو قائم رکھا۔مولانا شبلی کے مکتوبات میں تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔قومی وملکی مسائل کا ذکر بھی ،علمی اور اصلاحی مشورے بھی نظر آتے ہیں۔ان میں علمی مسائل پر گفتگو اور مختلف مشاغل کا حال بھی ہے۔مولانا شبلی نعمانی کے مکتوبات علمی اور ادبی رویوں کے حامل ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی

مولانا آزاد کے ہم عصروں میں حالی کے خطوط بھی اِن کی سادہ اور متوازن شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> اِن کے خطوط میں خوش مذاقی اور مدعا نگاری کا پُر لطف آمیزہ موجود ہے۔ ان میں شخصی ادّعا کم ہے۔مکتوب الیہ کا لحاظ زیادہ نمایاں ہے۔حالی کے خط ان کی ذات سے زیادہ اِن کے مکتوب الیہ کے حالات اور ذہنی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں۔[۴۶]

صاف بیانی اور قطعیت اِن کے خطوط کی خصوصیات ہیں۔ سادگی کے ساتھ صاف بیانی اور قطعیت مل کر اِن کے خطوط کو معنی دار بنا دیتے ہیں۔حالی کے خطوں کے مطالعہ سے قلبی کشادگی اور وسعت کی فضا ضرور پیدا ہوتی ہے۔یہ الگ بات ہَے کہ اِن کے خطوط بھی اِن کی نثر کی طرح روکھے پھیکے ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر مکتوب الیہ کو ایک تسلی بخش پیغام تو مل جا تا ہَے۔لیکن اس کے دل میں جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے خط دو آدمیوں کی ذاتی ملکیت تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ نفع عام ذوق عام کی چیز بن جاتے ہیں۔ حالی کے خطوں میں دراصل مقصد اور مدعا ہوتا ہے۔سرسید کی طرح مولانا حالی کے خطوط میں بھی سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے ۔ بے پناہ خلوص اور ہمدردی بھی اِن کے خطوں میں ملتی ہے۔ حالی منکسر المزاج تھے۔ عاجزی اور انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے خطوط میں بھی انکساری کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق مکتوبات حالی سے متعلق لکھتے ہیں:

> جس میں ہمدردی بنی نوع اِنسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہوتو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوئی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنا چاہتے ہوتو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل اِن خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔ جب حیات

جاوید شائع ہوئی تو بعض احباب کی طرف سے اعتراضات آئے۔ اور بعض احباب نے بے اعتنائی اور سردمہری برتی۔ حالی اِن کے رویے پر جو کچھ لکھتے ہیں۔اِس سے ان کی طبیعت کی انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔[۲۷]

حالی لکھتے ہیں:

اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اس کی بایوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہیئے تھا۔مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے۔[۲۸]

حالی اپنے دوستوں کے لیے سب کچھ کرتے ہیں لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ یہ سب کچھ اُنہوں نے کیا ہے۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمھاری سعادت مندی اور کسی قدر تمھاری دانائی کی دلیل ہے۔ بفرض محال میری کوشش کو تمھاری کامیابی میں کچھ دخل بھی ہے تو اس کو تقریباً ایسا سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔[۲۹]

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

حالی کے خط دراصل سرسید کی طرح محض مقصد کے جبر سے پیدا ہوئے ہیں ۔ ان خطوں میں غالب کی سی آرزوئے ہم کلامی اور شبلی کا سا جوش حیات نہیں جس کی نمو رفاقتوں کے جذبات اور تقاضوں کی آبیاری سے ہوتی ہے۔ حالی کی زندگی ہی ایک ایسی جوئے نرم رو سے مشابہ ہے جس کی موسیقی کی دھنیں ذرا نرم اور مدھم سی رہی ہیں۔حالی سے مزاج کا تغزل ان کے خطوں میں کم منعکس ہوا ہے۔ان کے

> یہاں خود نمائی نہیں۔اِن کے خطوں میں حقیقت کی پُر خلوص سادہ بیانی ہے۔اُنہوں نے خط کو نہ فن کا تماشا بنایا ہے، نہ سخن کا پردہ، یعنی ان کے خط نہ فن ہَیں، نہ سخن، محض خط ہیں جو اپنا اصلی فرض (مدّعا کا ابلاغ) نہایت اچھی طرح انجام دیتے ہیں۔ اور اِس سے زیادہ حالی کا اِن سے کوئی مطالبہ بھی نہیں، نہ ہم اس سے زیادہ اِن سے کوئی مطالبہ کر سکتے ہیں۔[۳۰]

مولانا الطاف حسین حالی مکتوب الیہ کے مقام اور رتبے کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔حالی جوش اور جذبے کی بجائے حقیقت اورصداقت سے کام لیتے ہوئے اپنی شخصیت کومخفی رکھتے ہیں۔لیکن یہی تو ان کا فن ہَے کہ وہ نُمود ذات کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔لیکن اِن کےخطوط میں اِن کی سادگی، سنجیدگی، ذہانت اور متانت کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔حالی کے سلجھے ہوئے دماغ کی طرح اِن کےخطوط بھی سلجھے ہوئے پاک صاف اورسنجیدہ ہیں۔ وہ سادگی اور بےتکلفی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس سے تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔وہ اپنے خیال کو الفاظ کا پابندنہیں بناتے بلکہ اِس کے برعکس وہ خیالات کوحسبِ حال الفاظ میں صفائی وصحت کے ساتھ اِس طرح بیان کرتے ہَیں کہ عبارت میں زور بیان اور فصاحتِ زبان کا رنگ نمایاں اور جاذب نظر ہو جاتا ہَے۔

المختصر سرسید اور حالی کے خط ایک وحدت رکھتے ہیں۔سرسید کے ہاں ایک ہی رنگ، ایک ہی جذبہ ملتا ہَے۔ حالی کے خط بھی سرسید کی طرح دلچسپ نہیں کہے جا سکتے۔اِن کےخطوط میں یکساں، دھیما اورسنجیدہ متین رویہ مِلتا ہَے جو اِنسانی سیرت کی نیرنگی اورتنوّع کو ظاہرنہیں کرتا۔

حوالہ جات

١ الطاف حسین حالی مرحوم ،مولانا ، حیات جاوید،ترقی اُردو بیورو ، نئی دہلی ١٩٩٠ء۔١٩١٢ء، ص٤٢٣

٢ الطاف حسین حالی مرحوم ،مولانا ،''حیات جاوید'' ترقی اُردو بیورو ،نئی دہلی، ١٩٩٠ء۔١٩١٢ء ، ص٧٠٣

٣ محمد اسماعیل پانی پتی ، شیخ ،مکتوبات سرسید (جلد اوّل) مجلس ترقی ادب لاہور، ١٩٧٦ء ، ص٢٧٤

٤ ایضا ص ١٢١

٥ طاہرتسیم ،''سرسید اور اُردو صحافت'' مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور (بار اوّل) جون ١٩٠٨ء ، ص ١٠٦

٦ نظیر حسنین زیدی ، ڈاکٹر ، اُردو مکتوب نویسی کے عناصر ،''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین'' ناظم آباد کراچی ،١٩٦٣ء ، ص٨٣۔

٧ ''حیات جاوید''، ص٧٠٤

٨ احمد ندیم قاسمی ، بحوالہ محمد اسماعیل پانی پتی ، شیخ ''مکتوبات سرسید''(جلد اوّل)، مجلس ترقی ادب لاہور ، ١٩٧٦ء ، ص٦

٩ ''حیات جاوید'' ص٧٠٣۔٧٠٤

١٠ علی احمد فاطمی ، بحوالہ نذیر احمد ، پروفیسر ،''غالب کی مکتوب نگاری'' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ، ١٩٦٧ء ، ص٢٧١

١١ اُردو مکتوب نویسی کے عناصر ،''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین'' ص٩٢۔٩٣

۱۲ معین الدین احمد انصاری، ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں''، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹٦۷ء، ص ۱۹۔۲۰

۱۳ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''سر سید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ'' مکتبہ کارواں لاہور، ۱۹٦۰ء، ص ۲۰۰

۱۴ اُردو مکتوب نویسی کے عناصر، ''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین'' ۱۹۸۳ء، ص ۹۳۔۹۴

۱۵ ایضاً

۱٦ سلیمان ندوی، سید، ''مکاتیب شبلی'' (حصہ اوّل) استقلال پریس مسلم مسجد لاہور طبع اوّل ۱۹۸۹ء، ص ھ تا ز

۱۷ ''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین''، ص ۹۴

۱۸ ''مکاتیب شبلی'' (حصہ اوّل) ص ح تا ط

۱۹ 'غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین'' ص ۹۷

۲۰ ''مکاتیب شبلی'' (حصہ اوّل)، ص ط

۲۱ سلیمان ندوی، سید، مولانا، مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) طبع چہارم معارف اعظم گڑھ، ۱۹٦٦ء ص ۷

۲۲ ''مکاتیب شبلی'' (حصہ اول) ص ح

۲۳ کلب علی خاں، فائق، ''کلیات میر'' جلد اول حصہ غزلیات، مجلس ترقی ادب لاہور، نیز نیاز احمد'' کلیات میر'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱

۲۴ ''مکاتیب شبلی'' (حصہ اوّل)، ص ح

۲۵ خلیق انجم، ''شبلی کی علمی اور ادبی خدمات'' انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی، ص۲۳۴

۲۶ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، ''نقوش مکاتیب نمبر'' ۱۹۵۷ء، ص ۳۰

۲۷ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مقدمات عبدالحق ''مقدمہ مکتوبات حالی''، اُردو مرکز لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۳۶۴

۲۸ ایضاً

۲۹ ایضاً ص ۳۶۴

۳۰ سید عبداللہ، ڈاکٹر ''نقوش مکاتیب نمبر'' ص ۳۰۔۳۱

باب سوم

مولوی محمد حسین آزاد سوانح اَور اَدبی خدمات

سوانح محمد حسین آزاد

مولوی محمد حسین آزاد نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ملکی تاریخ کا عبوری دور تھا۔ تہذیبی تصادم عروج پر تھا۔ محمد حسین آزاد کے آباؤ اجداد عہد نادری میں ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اَور جہان آباد میں آباد ہوئے۔آزاد کے خاندان کے ایک بزرگ جن کا نام محمد عاشور تھا، محمد شاہ کے دور حکومت میں کشمیر میں وارد ہوئے اَوران کی وفات پر ان کے بیٹے خلیفہ محمد شکوہ نے شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی میں سکونت اختیار کر لی اَوران کےعلم وفضل کی قدر کی وجہ سے جلد ہی انھیں دربار شاہی میں وظیفہ یاب کی حیثیت سےشرف باریابی حاصل ہو گیا۔[1]

آزاد کے بزرگ اپنی تہذیبی اَورنسلی برتری کو برقرار رکھنا چاہتے تھے ، لہٰذا وہ آہستہ آہستہ اپنے نئے وطن سے مانوس ہوتے گئے۔ خلیفہ محمد شکوہ سے لے کر ان کے پوتے محمد اکبر تک ان کا خاندان ولایتی رہا کیونکہ ان کی شادیاں ایران ہی میں ہوتی تھیں۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر خاندان کا پہلا شخص تھا جس کی شادی ہندوستان میں ہوئی ، گو لڑکی کا خاندان بھی ایرانی تھا لیکن انہوں نے مستقل سکونت ہندوستان میں اختیار کر رکھی تھی۔آزاد کے اور اُن کے خاندان کی زبان فارسی تھی لیکن مقامی لوگوں سے اختلاط اَورضروریات زندگی کی وجہ سے اُردو سے بھی اُن کا لگاؤ بڑھتا گیا۔ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے:

> ’’آب حیات کا پہلا فقرہ اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ آزاد کے دادا خلیفہ محمد اکبر رُک رُک کر اُردو بولتے تھےلیکن آزاد کے والد محمد باقر تک پہنچتے پہنچتے خاندان کی زبان اُردو ہوگئی‘‘۔[۲]

مولوی محمد باقر نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد خلیفہ محمد اکبر سے حاصل کی اَور پھر میاں عبدالرزاق کے درس میں داخل ہوگئے۔میاں صاحب دہلی کے مشہور ومعروف عالم و فاضل تھے اَور کابلی دروازے میں درس دیا کرتے تھے۔درس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی محمد باقر دلی کالج میں داخل ہوئے اَور وہاں سے اپنی تعلیم مکمل کی اَور اس کے بعد وہیں معمولی سرکاری ملازمت پر مامور ہوگئے۔مولوی محمد باقر کی شخصیت اپنے بزرگوں سے کہیں زیادہ وقیع تھی اَور اُنھیں ایک تاریخی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے عہد کی اَدبی ، صحافتی اَور سیاسی زندگی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سرکاری ملازمت میں بھی نمایاں ترقی حاصل کی۔ ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے کالج کا معائنہ کیا تو انھیں خلعت عطا کیا۔ دلی کالج سے مولوی محمد باقر کلکٹری پہنچے۔ یہاں وہ واصل باقی نویس نائب سر رشتہ دار منصرم پڑتال ، سر رشتہ دار بندوبست ، سپر نٹنڈنٹ محکمہ مال اَور آخر میں تحصیلدار رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نجی طور پر صحافت میں بھی مشغول رہے اَورتقریباً سولہ سال کی ملازمت کے بعد سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ کر اپنی تمام تر توجہ صحافت پر مرکوز کر دی۔ مولوی محمد باقر نے پرنسپل دہلی کالج سے وہ چھاپہ خانہ خرید لیا جومشرقی کتابوں اَور انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی اشاعت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔یہ چھاپہ خانہ دو مقاصد کے لیے لگایا گیا تھا ، ایک یہ کہ کالج میں نئے قسم کے نصابات مہیا کیے جائیں اَور دوسرا یہ کہ مغربی سائنس اَور فلسفہ کو اُردو میں تراجم کے ذریعے فروغ دیا جائے۔ان دونوں مقاصد کی ناکامی پر پرنسپل کومجبوراً یہ چھاپہ خانہ اونے پونے بیچنا پڑا جسے مولوی محمد باقر نے خرید لیا۔

چھاپہ خانہ لگنے پر شمالی ہند میں اُردو کے سب سے پہلے اخبار کا اَور ہندوستان کے دوسرے اخبار کا اجراء ۱۸۳۶ء میں ہوا تھا۔[۳] اس کا نام پہلے دہلی اخبار تھا۔ دس مئی ۱۸۴۰ء سے ''دہلی اخبار'' کی بجائے اس کا نام ''دہلی اُردو اخبار'' رکھا گیا۔[۴] کم از کم شمالی ہند کی حد تک یہ اولین اُردو اخبار تھا، جس کا سالانہ چندہ بیس روپے تھا۔سرکاری ملازمت میں ہونے کی وجہ سے اپریل ۱۸۴۸ء تک اخبار پر مولوی محمد باقر کا نام نہ آیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۸ء میں پہلی بار ان کا نام مہتمم کی حیثیت سے شائع ہوا۔[۵] بیس اپریل ۱۸۴۹ء کے بعد محمد حسین آزاد کا نام بحیثیت مہتمم روشناس کرایا گیا۔[۶] مولوی محمد

باقر نے صحافت کا بلند معیار قائم کیا۔ وہ اس پر ہمیشہ قائم رہے کیونکہ وہ ایک حق گو، بے باک، خود دار اَور آزاد خیال اخبار نویس تھے۔ انہوں نے اُردو میں سادہ اَور بے تکلف انداز صحافت کو رواج دیا جس پر آگے چل کر جدید اردو صحافت کی بنیار رکھی گئی۔ محمد حسین آزاد کے خاندان کی مالی حالت بہت اچھی تھی، وہ ایک پڑھا لکھا گھرانہ تھا، اَور ان کے آبا و اجداد کو سوسائٹی میں ایک بلند مقام حاصل تھا اور علم و فضل کے اعتبار سے جانا پہچانا تھا۔ محمد حسین آزاد کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

مولوی محمد شفیع نے اپنے ایک مضمون شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی پنشن کی درخواست کے ساتھ منسلک ایک یاداشت سے یہ معلومات بہم پہنچائی ہَیں:

''مولانا محمد حسین آزاد کے والد ماجد کا نام مولوی محمد باقر، قوم مغل، مذہب شیعہ اَور وطن دہلی تھا۔ تاریخ پیدائش ۵ جون ۱۸۳۵ء اَور قد ۵ فٹ ۳ انچ تھا''۔ [۷]

''آغا محمد باقر نے ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۷ء اَور مادہ تاریخ، تاریخ ظہور اقبال لکھا ہے''۔ [۸]

۱۸ ذوالحجہ ۱۲۴۵ھ، ۱۰ جون ۱۸۳۰ عیسوی کے مطابق ہَے لہٰذا ۱۸۲۷ء صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہَیں:

'' آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو جمعرات کے دن پیدا ہوئے'' ۔ [۹]

محمد اکرام چغتائی لکھتے ہَیں:

آزاد کی تاریخ ولادت وہی ہے جو ان کی لوح مزار پر کندہ ہَے یعنی ۱۸۳۰ء ان کی درخواست برائے پنشن میں یہی سنہ درج ہے، لیکن بعد میں اس کو قلم زد کر کے ۱۸۳۵ء لکھ دیا گیا۔ یہ تحریف پنشن منظور کرانے کی زیادہ سے زیادہ عمر یعنی پچپن کی لازمی شرط کو پورا کرنے کی غرض سے کی گئی۔ [۱۰]

''میاں آفتاب جوئیہ کے مطابق '' آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ء بمطابق ۱۸ ذالحجہ ۱۲۴۵ھ دہلی میں پیدا ہوئے''۔[۱۱]

ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

''بہر حال اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آزاد ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ مطابق دس جون ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے یہی تاریخ پیدائش ان کے مزار پر بھی کندہ ہے''۔[۱۲]

ان تمام ذرائع سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کی عمر چار سال تھی جب ان کی والدہ امانی بیگم کا انتقال ہو گیا۔ اَور آزاد کی پرورش کی بھاری ذمہ داری ان کے باپ مولوی محمد باقر اَور ان کی ہمشیرہ یعنی آزاد کی پھوپھی پر آن پڑی ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد خاندان کے ساتھ ان کی ہمشیرہ بھی لاہور چلی آئیں اَور فروری ۱۸۷۷ء میں وفات پا گئیں۔ آزاد کو اپنی پھوپھی سے بڑا پیار تھا کیونکہ انہوں نے ان کو پالا پوسا تھا۔ آزاد نے اپنی پھوپھی کی وفات پر اپنے ایک شاگرد لالہ دنی چند کو ایک خط لکھا جس میں ان کی محبت اَور احترام کا اظہار ہوتا ہے:

ہمیں ان دنوں صدمہ عظیم ہوا۔ وہ یہ کہ میری پھوپھی صاحبہ جنھوں نے مجھے پالا تھا اَور جو ہمیشہ سے گھر کی مالک تھیں ان کا انتقال ہو گیا۔وہ نہایت نیک نہاد اَور خوش اوقات تھیں اَور ان کے سبب سے دل بڑا قوی رہتا تھا۔گھر میں اندھیرا نظر آتا ہے۔ اَور وحشت ہوتی ہے۔[۱۳]

آزاد کے والد مولوی محمد باقر فقہی مسائل میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔خاندانی روایات کے مطابق مولوی محمد باقر چاہتے تھے کہ آزاد مولوی بنیں۔ دینیات کی تعلیم بھی دلوائی لیکن بعد میں انھیں دہلی کالج میں داخل کروا دیا گیا ۔

جب آزاد دہلی کالج میں داخل ہوئے تو ان کی عمر کم از کم پندرہ برس تھی چنانچہ یکم مارچ ۱۸۴۵ء میں داخل ہوئے۔ مارچ ۱۸۴۸ء سے چھ روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہوگیا۔ جب آزاد دہلی کالج میں داخل ہوئے اس وقت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الوئس اشپرینگر تھے۔ان کا تقرر ۱۹ مارچ ۱۸۴۵ء کو ہوا۔ وہ آسٹریا کے دورافتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر انگلستان ہجرت کرنا پڑی اور وہاں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے شعبہ طب میں ملازمت اختیار کر کے ہندوستان آگئے۔اُن کا شمار انیسویں صدی کے معروف مستشرقین میں کیا جاتا ہے۔خاص طور پر سیرت پاکﷺ اور تنقید حدیث پر ان کی **مفصل** جرمن اور انگریزی تحریریں مستند مانی جاتی ہیں۔ اشپرینگر مشرق ومغرب کے ذہنی اورعلمی اتصال کے حامی تھے اوراپنی زندگی کے اِس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھیں دہلی کالج موزوں ترین درس گاہ نظر آئی۔ان کے پیش رو پرنسپل فرانسیسی نژادفیلکس بوتروس نے جس سوسائٹی کی بنیاد رکھی اس نے زیادہ تر مغربی علوم کی اہم کتابوں کو اُردو میں ترجمہ کرنے کو ترجیح دی اور کچھ ایسی کتابوں کو ان کے ساتھ ساتھ شامل کیا جو طلبہ کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی تھیں۔ عام طور پر یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت زیادہ تر توجہ مغربی علوم فنون کوتراجم کے ذریعے مقبول عام کرنے کی طرف تھی۔ اشپرینگر نے مشرق ومغرب کےعلم وفنون کو ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلامی مشرق کےعلمی اور تاریخی مضامین کی تدوین اورترجمہ میں ہمہ تن مصروف رہے اوراپنی زیرنگرانی چند ایسے رسائل کا اجراء کیا جن سے اُردوصحافت کا آغاز ہوا۔ اس طرح مشرق ومغرب کے ذہنی فاصلوں کوکسی حد تک کم کیا۔ آزاد کے دہلی کالج میں داخل ہونے سے چار سال قبل لیفٹیننٹ گورنر جیمز تھامسن نے مقامی کمیٹی برائے تعلیم کے اراکین کی مشاورت سے کالج کے انتظامی ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں کیں ۔ ان میں ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ مشرقی شعبہ کی عربی کلاس کو دوحصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ سنّی اور دوسرا شیعہ طلبہ کے لیے تھا۔ دونوں کے لیے الگ الگ اساتذہ مقرر کیے گئے۔سنی طالب علموں کو شعبہ کے پرانے استاد مولوی سید محمد پڑھاتے رہے اور شیعہ طالب علموں کو پڑھانے کے لیے قاری سید جعفر علی جار چوی کا تقرر ہوا جو اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

محمد حسین آزادمشرقی شعبہ کی عربی جماعت برائے شیعہ طلبہ میں داخل ہوئے۔سنی اَور شیعہ مسالک کے نصاب میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ تاریخی، اَدبی ، اَور سائنسی کتب مثلاً تاریخ تیموری، مقامات حریری ، انشائے ابوالفضل، مراۃ الاقالیم، اقلیدس اَور براؤن کی جیومیٹری وغیرہ دونوں مسالک میں تھیں۔مختلف درجوں کے شیعہ طلبہ ''درمختار'' اَور ''ہدایہ'' کے بجائے ''شرائع الاسلام''اور ''شرح ملا'' کے کچھ حصے پڑھتے تھے۔یہ تمام نصابی کتب سید قاری جعفر علی پڑھاتے تھے جن سے آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے دیرینہ اختلافات چلے آرہے تھے۔مولوی محمد باقر اَور قاری سید جعفر علی پہلے آپس میں دوست تھے۔بعد میں ان کے درمیان ایک زبردست مباحثہ شروع ہوگیا تھا اَور ایک رسالہ جس کا پورا نام یہ ہے ''رسالہ مسماۃ بارشاد المومنین متضمہ فتاویٰ حضرات مجتہدین بیچ مقدمہ خارج ہو جانے محمد باقر مالک اردو اخبار کے دائرہ ایمان سے بیچ تاریخ پانچویں ماہ رجب ۱۲۷۰ھ کے'' [۱۴] میں باقاعدہ مولوی باقر پر کفر کا فتویٰ عائد کیا گیا تھا۔مولوی محمد باقر کے عقائد کو راسخ العقیدہ شیعہ فاسد خیال کرتے تھے۔یہ اس نزاع کی ابتداء تھی ، اَور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اَور معاملات بھی پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے اختلافات کو اَور بھی ہوا دی۔مولوی محمد باقر کے مخالفین کہتے تھے کہ اُنہوں نے بنی اُمیہ کی تائید اَور بنو فاطمہ کی فضیحت کی ہے۔فتوے کے الفاظ یہ ہیں۔'' اور کبھی سادات فاطمہؑ کی خدمت میں بہتان اَور بے ادبیاں طبع کیں کہ روح مظلومہ فاطمہؑ کو نہایت غضب ناک کیا''۔[۱۵]

مولوی محمد باقر بھی اپنی مخاصمت کا اظہار اپنے جاری کردہ ''دہلی اردو اخبار'' میں کھل کر کرتے تھے۔آزاد بھی اپنے والد کی تحریک پر اس بحث میں شامل ہو گئے اَور کلاس میں مولوی جعفر علی سے چناں وچنیں شروع ہوگئی۔ اب مولوی جعفر علی کو دو محازوں پر مقابلہ کرنا پڑتا ۔شروع شروع میں تو انھوں نے کوئی پروا نہ کی لیکن آہستہ آہستہ وہ بیزار ہونے لگے اَور حالت یہ ہوگئی کہ وہ شپٹا اٹھے اَور آزاد کے خلاف بے اَدبی اَور گستاخی کی شکایت کر دی۔مولوی جعفر علی نے اپنی رپورٹ میں کہا ''یہ لڑکا پڑھنے نہیں آتا ، مجھے پڑھانے آتا ہے'' اور یہ اس وقت ہوا جب فروری ۱۸۴۸ء میں کالج کے پرنسپل اشپرینگر کو شاہان اودھ کے کتب خانوں میں محفوظ خطی نسخوں کی فہرست سازی کے لیے

لکھنؤ جانا پڑا اَور ان کی جگہ جے۔ایچ ٹیلر قائم مقام پرنسپل کے طور پر متعین ہوئے۔ پرنسپل نے رفع شر کے لیے قاری جعفر علی کی کلاس سے آزاد کو اٹھوا کر سنی فقہ کی جماعت میں بھیج دیا جس کے مدرس دوم مولوی سید محمد تھے۔

اس تنازعہ کی شدت آزاد کی تبدیلی جماعت اَور اس کے اصل محرکات کا اندازہ ایک خط سے لگایا جا سکتا ہَے جو قاری جعفر علی کی جماعت اوّل (شیعہ) کے ایک طالب علم خدا بخش نے ۲۴دسمبر ۱۸۴۸ء کو اشپرینگر کو لکھا۔یہ خط جرمنی میں اشپرینگر کے ذاتی کاغذات میں موجود ہے۔ اس خط کے چند متعلقہ اقتباسات یہ ہیں:

> جناب عالی! جس روز سے حضور یہاں تشریف فرما ہوئے ہیں۔ ہم کو محمد باقر کے ہاتھ سے انواع واقسام کی تکلیفیں پہنچی ہیں۔اگر میں اون کا بیان کروں تو ایک کتاب بن جائے شمہ اون میں کا ایک یہ ہَے کہ میرے مدرس مولوی سید جعفر علی صاحب کی بدنامی اپنے اخبار میں سترہ مہینے سے چھاپتا ہَے خصوصاًاس روز سےتو نہایت تنگ کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اون کی بدنامی پرچہ میں چھاپی اَور خود اس کاغذ کو لے کر مدرسہ میں آن موجود ہوا اَور ہر ایک مدرس اَور طالب علم کے رُو برو اوس کو پڑھنا شروع کیا اَور مضحکہ کیا، کیونکہ وہ قائم مقام پرنسپل کے مصاحب ہَیں اَور عہدہ پرنسپلی کو اپنا عہدہ جانتا ہے اَور اکثر زبان پر لاتا ہَے کہ ڈاکٹر اشپرینگر صاحب تو نہیں ہیں۔ اب میں جو چاہوں سو کروا سکتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اوّل تو یہ کیا کہ اپنے بیٹے کو مدرس صاحب موصوف کی جماعت سے بدلوایا اَور بعد اس کے اَور طالب علموں کو نکالنا چاہا۔چنانچہ مشتاق علی طالبعلم کو بھی بدلوایا اَور طالب علموں کو بہت ورغلایا۔مگر اوس کے بہکانے میں کوئی نہ آیا۔ پھر اون کو دھمکا کر کہا کہ امتحان پر میں سب کو خارج کروا دوں گا۔۔۔ طالب علموں میں سے پرنسپل حال نے نو آدمی موقوف وظیفہ سے باغوائے محمد باقر کے کر دیئے۔۔۔غرض کہ ان جماعت کا، جس کو حضور نے بنایا تھا۔ بالکلیہ برباد کر دیا اب مدرس ہمارے

نہایت تنگ ہیں اَور حضور کے آنے کی دعا مانگتے ہیں تا کہ دشمن کے ہاتھ سے نجات پاویں۔[16]

مولوی محمد باقر کے ''دہلی اردو اخبار'' سے متعلق معاصر دو شہادتیں درج کی گئی ہیں:

(۱) دہلی کالج کے اوّل عربی مدرس جعفر علی جو شیعہ ہیں۔ ان کے متعلق ایک خط اس اخبار میں شائع ہوا ہے جس میں جعفر علی کو نا اہل اَور اس عہدے کے لیے نا مناسب گردانا گیا ہے۔[17]

(۲) اڈیٹر اپنی ذاتی مخاصمت کی وجہ سے دہلی کالج کے ایک استاد مولوی جعفر علی پر انتہائی دریدہ دہنی سے ہتک آمیز حملے کرتا رہتا ہَے۔[18]

بقول محمد اکرام چغتائی:

دہلی کے ان دونوں ہم مسالک علماء یعنی مولوی محمد باقر اَور قاری جعفر علی کے مابین تنازعہ ٹیلر کے عہدہ پرنسپل کے دوران اپنی انتہا کو جا پہنچا اَور دونوں کی الزام تراشیوں نے ایک دوسرے کی علمیت اَور شخصیت کو داغدار کر دیا۔ بالآخر باقری اَور جعفری نام کے دو گروہ بن گئے اَور انھوں نے تحریر وتقریر میں دونوں کی کردارکُشی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جنوری ۱۸۵۰ء کو اشپرینگر کے لکھنو سے واپس آتے ہی ٹیلر قائم مقام پرنسپل کے عہدے سے فارغ ہو گیا اَور اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس قضیے کی شدت بھی قدرے کم ہو گئی لیکن پھر بھی مزید چند برسوں تک یہ دونوں گروہ آپس میں نبرد آزما رہے۔[19]

آزاد کو اس قضیے کی وجہ سے اپنی کلاس کی تبدیلی ممکن ہَے اس وقت بُری لگی ہو لیکن اس تبدیلی سے آزاد کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی اَور شیعہ روایات میں گم رہنے کی بجائے انہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ جس سے وہ مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہو کر سوچنے لگے۔ ان کی یہی سوچ قومی رجحانات میں مل کر عالم گیر رواداری کے ان تصورات میں عیاں ہوئی جو ان کی

تحریروں میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔آزاد نے اپنے ایام طالب علمی میں کالج میں بڑی قابلیت کا ثبوت دیا اور عام دلچسپی کے موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ کالج میں مضمون نویسی کے مقابلوں میں آزاد بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ کالج کے قائم مقام پرنسپل جے۔ایچ ٹیلر نے ان کے بارے میں بڑی اچھی رپورٹیں دیں۔اپنی سالانہ رپورٹ بابت (۱۸۴۸۔۱۸۴۹ء) میں آزاد کے مضمون کی خصوصی تعریف کی اور محمد حسین آزاد کو طرز تحریر اور معلومات کے اعتبار سے پہلا انعام دیا گیا۔[۲۰]

اس مضمون کے بارے میں پرنسپل کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔

بہت سی معلومات اس مضمون میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں جو نصاب تعلیم میں شریک نہ تھیں ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق ''دہلی گزٹ'' یا ''دہلی اُردو'' اخبار سے تھا۔ اس لیے اسے اُردو اخبارات کے پڑھنے کی عادت تھی۔ اور ان سے اس نے بہت ہی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں۔[۲۱]

اگلے سال (۱۸۴۹۔۱۸۵۰ء) میں کالج کی مجلس انتظامی کے رکن مفتی صدر الدین آزردہ نے اُردو مضمون نویسی کا پہلا انعام آزاد ہی کو دیا۔مضمون کا موضوع تھا۔ ''اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا ؟۔[۲۲]

ان دنوں ''دہلی اُردو اخبار'' آزاد کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ آزاد اس میں پابندی سے لکھتے تھے۔آزاد نے صدر بورڈ آف ریوینو کے سرکلر نمبر چار کا اُردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ جو مطبع دہلی اُردو اخبار سے طبع ہوا، (۱۸۴۹ء)ممکن ہے اس ترجمہ کی محرک وہ سو سائٹی ہو جو دہلی کالج کے پہلے پرنسپل فیلکس بوتروس نے مغربی علوم وفنون کو اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے قائم کی تھی۔[۲۳]

> اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی کالج نے آزاد کی شخصیت ذہنی نشوونما اور تخلیقی صلاحتیوں کو نکھارنے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور انھیں مغربی افکار سے روشناس کیا۔ کالج نے آزاد میں جرأت و ہمت، خود اعتمادی، آزادہ روی اور زندگی کے بارے میں وسیع النظری پیدا کی۔ نئے عصری تقاضوں کا شعور و آگہی دی۔ تنقیدی صلاحیتوں کو اُبھارا اور ان معلمانِ قوم کا ہم نوا بنایا جن میں سے اکثر ان کے اپنے ہی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ یہ وہی معلمین تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سر رشتہ ترقی کو پھر ہاتھ میں لے کر برصغیر میں نشاۃ الثانیہ کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد کی۔ ایسی کوئی مصدقہ معلومات تو نہیں کہ آزاد نے کس سن میں دہلی کالج سے تعلیم مکمل کی۔ آزاد کے ہم عصر مولوی نذیر احمد دہلوی نے جنوری ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخلہ لیا تھا اور ۱۸۵۴ء میں آٹھ سال میں تعلیم مکمل کر کے کالج سے باہر نکلے۔[۲۴]

اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آزاد ۱۸۵۴ء تک کالج میں پڑھتے رہے ہوں گے۔ اس سے یہ بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ آزاد ۱۸۵۳۔۱۸۵۴ء کے تعلیمی سال میں کالج میں تھے کیونکہ آغا محمد باقر نے لکھا ہے کہ:

> ایک مرتبہ ڈاکٹر مویٹ صاحب کمشنر مدراس کلکتے سے تشریف لائے اور انہوں نے کالج کا معائنہ کیا اور ہر جماعت کا جزوی سا امتحان لے کر ہر طالب علم سے فرداً فرداً پوچھا کہ تم تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کرو گے، ہر ایک نے اپنا اپنا خیال اور ارادہ ظاہر کیا۔ اسی سلسلے میں محمد حسین آزاد کی بھی باری آئی۔ انہوں نے کہا میں تحصیل علم کروں گا اور جو خیالات ہیں اور ہوں گے انھیں اپنے اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔[۲۵]

مسٹر فریڈرک جان مویٹ ایم ڈی ، ایل ایل بی فرسٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ وسیکرٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے دہلی کالج کا یہ معائنہ ۵۴۔۱۸۵۳ء میں کیا جس کا ثبوت ان کے معائنہ کی وہ رپورٹ ہَے جو ان کی تعلیمی رپورٹ بابت ۵۴۔۱۸۵۳ء میں موجود ہے۔[۲۶]

دہلی کالج میں مولوی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اَور خواجہ ضیاء الدین، آزاد کے ہم جماعت تھے۔ کالج کے اساتذہ میں سے آزاد نے صرف منشی فیض پارسا کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ضمنی طور پر اس طرح کہ:

> منشی صاحب مرحوم میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے پھر دہلی کالج سابق میں مدرس سیاق ہوگئے۔ میں نے بھی ابتدائی حساب ان سے سیکھا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں مرے۔[۲۷]

۳۰ اکتوبر ۱۸۵۳ء سے آزاد کا نام پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے دہلی اُردو اخبار میں آنا شروع ہوگیا تھا، یعنی دورانِ تعلیم ہی وہ اخبار کے پبلشر بن گئے تھے اَور یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔

آزاد کے والد اَور ذوق میں آپس میں گہری دوستی تھی۔ یہی وجہ ہَے کہ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آزاد کو استاد شیخ ابراہیم ذوق کی شاگردی بھی نصیب ہوگئی جس نے آزاد کی طبیعت کو جلا بخشی۔ آزاد لکھتے ہیں :

> والد مرحوم کا اَور ان کا آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ پڑھے، ساتھ بڑھے۔ ہر معرکہ میں شریک حال رہے اَور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ اَور جو حال نہیں دیکھے، وہ بھی اس طرح سنے ہَیں گویا سامنے گزر رہے ہیں۔[۲۸]

اُستاد ذوق آزاد کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آزاد بھی شام کو روزانہ استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اَور چھٹی کے روز تو سارا دن ان کا ادھر گزرتا۔ آزاد نے شعر گوئی کی ابتداء بھی ذوق ہی

کے زیر سایہ کی۔ آزاد لکھتے ہیں:

کابلی دروازے کے پاس ہی مکان تھا شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا۔ مضامین کتابی خیالات علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا کیا عرض کروں، فرمایا، میاں اسی طرح آتا ہے۔ ہوں، ہاں، غوں غاں، کچھ تو کہو، کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا: ''سینے سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ'' ذرا تامل کر کے کہا: ہاں درست ہے:

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ [۲۹]

پندرہ سال کی عمر میں آزاد کو استاد ذوق اور اپنے والد کے ساتھ دلی کے مشاعروں میں جانے کا شرف حاصل ہوگیا۔ آزاد سب سے پہلے مشاعرے میں جانے کا حال لکھتے ہیں:

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خان کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔۔۔ بندہ آزاد اس وقت تک ایسے جلسوں میں نہ جا سکتا تھا۔ جب تک کوئی ایسا ہی بزرگ ساتھ نہ ہو۔ اور مشاعرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لیے ہمیشہ اگلے مشاعروں کی باتیں سن کر آرزو مند رہتا تھا۔ میں نے بھی والد مرحوم سے کہا غرض کہ مشاعرے میں گئے۔ [۳۰]

آزاد کو اپنے استاد سے بہت عقیدت تھی۔ بچپن ہی میں استاد ذوق کا کلام جمع کرنا شروع کر دیا تھا تا کہ دیوان ذوق مرتب کر سکے۔ ذوق کی زندگی میں بھی اور ان کے انتقال کے بعد بھی آزاد کو استاد کا اگر کوئی غیر معروف شعر مل جاتا تو وہ اسے لکھ لیتے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب آزاد نے اپنا گھر بار چھوڑا تو ان کے ساتھ بقول آزاد:

فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کچھ

اُٹھا کر لے چلوں ، ان کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی یہ ہی خیال آیا کہ
محمد حسین! زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں
گے ، جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے ، اب اُن کے نام کی زندگی ہے ، اور ہے تو
اُن پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی
جنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر
سے بلکہ شہر سے نکلا۔ [۳۱]

اِن بائیس نیم جانوں کے علاوہ اگر کوئی اثاثہ ان کے ہمراہ تھا تو صرف استاد ذوق کا کلام تھا۔استاد ذوق کے انتقال (۱۲۷۱ھ) کے بعد آزاد ، شاعرحکیم آغا جان عیش سے فیض یاب ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ تقریباً 2 سال تک جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء تک آزاد اخبار اَور اس کے پریس سے بھی وابستہ رہے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولوی ممتاز علی کے بقول مولانا آزاد دہلی کی کچہری میں روز نامچہ نویس ہو گئے۔ [۳۲]

ڈاکٹر اسلم فرخی اس کی تردید کرتے ہَیں اَور لکھتے ہَیں :

۳۰ اکتوبر ۱۸۵۳ء سے دہلی اُردو اخبار پر آزاد کا نام پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے آنا
شروع ہوا اَور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک جاری رہا۔ اگر آزاد سرکاری ملازم ہوتے
تو ان کا نام اخبار پر نہیں آ سکتا تھا لیکن ان کا نام اخبار پر برابر آتا رہا جس سے
یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہَے کہ آزاد کا کچہری میں روز نامچہ نویس ہونا قرین قیاس
نہیں۔ [۳۳]

اس کے علاوہ دوسری دلیل ڈاکٹر اسلم فرخی یہ دیتے ہیں:

آزاد گھر کا مطبع اَور اخبار چھوڑ کر ملازمت کی تگ و دو کرتے بھی تو کس لیے؟
بچپن ہی سے انھیں مطبع کا انتظام سونپ دیا گیا تھا اَور تعلیم سے فارغ ہونے کے

> بعد انھیں اس کی ترقی میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔ پھر یہ کہ انھیں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ اَور یہ شوق پریس اَور اخبار ہی کے ذریعے نشو ونما پا سکتا تھا نہ کہ کچہری کی روز نامچہ نویسی سے۔[۳۴]

ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہ تو لکھا ہَے کہ اگر آزاد سرکاری ملازم ہوتے تو ان کا نام اخبار پر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن یہ ثابت نہیں کیا کہ اس وقت میں سرکاری ملازم پر یہ پابندی تھی کہ وہ اپنا نام پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ضروری نہیں کہ مطبع کا انتظام سو فیصد آزاد پر موقوف ہو اَور نہ ہی یہ بات کہی جا سکتی ہَے کہ لکھنے پڑھنے کے شوق کے ساتھ ساتھ کوئی اَور کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لیے ڈاکٹر اسلم فرخی کی یہ تردید سو فیصد درست نہیں ہے۔

محمد اکرام چغتائی لکھتے ہَیں:

> بلاشبہ دہلی کالج نے آزاد کی ذہنی نشوونما، شخصیت اَور تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔وہ یہاں کی مجموعی علمی فضا سے متاثر ہوئے۔ نئے مغربی علوم سے شناسائی ہوئی اَور ان کی وساطت سے انھیں نئے عصری تقاضوں کا شعور حاصل ہوا لیکن حیرت ہَے کہ انہوں نے بعد کی تحریروں میں اپنی اس ابتدائی درس گاہ، وہاں کے علمی ماحول اَور اپنے اساتذہ کا انتہائی اختصار سے ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد کے ایک ملاقاتی بالمکند گپتا نے ان کے ایک ہم جماعت مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی زبانی یہ لکھا ہَے کہ ''آزاد'' کالج کے امتحانوں میں جواب مضمون لکھتے تھے۔ سب طلباء سے اوّل رہتے تھے۔ ذوق کے شاگرد رشید تھے۔ اردو کی نظم ونثر لکھنے میں ان کو استعداد کالج ہی میں حاصل ہو گئی تھی۔ وہ کالج چھوڑ کر دہلی کی کچہری میں روزنامچہ نولیس ہوئے۔[۳۵]

''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' کے عنوان سے ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو آزاد کی ایک نظم دہلی اردو اخبار میں شائع ہوئی جو غالبًا آزاد کی سب سے پرانی نظم ہے۔[۳۶] اس نظم میں فارسی کا غلبہ ہَے ۔

فارسی ترکیبوں کی فراوانی ہَے۔بعض اشعار اردو کی بجائے خالصتاً فارسی میں ہیں۔ فارسی کے اس انداز نے ان اشعار کو گراں بار کر دیا ہَے لیکن روانی اَور بے ساختگی موجود ہے۔اسے استاد ذوق کی تربیت اَور حضوری کا فیض سمجھا جا سکتا ہے۔اس نظم سے آزاد کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہَے اَور پتہ چلتا ہَے کہ اس عمر میں ان کے یہاں فنی پختگی کس قدر تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آزاد نثر بھی لکھ رہے تھے۔اگر چہ اس بارے میں قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن دہلی اُردو اخبار کی بعض خبروں سے یہ اندازہ ہوتا ہَے کہ یہ آزاد کی تحریریں ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہَیں :

''ان تحریروں میں وہ رچا ہوا اسلوب تو نہیں جس نے آزاد کو آقائے اردو بنا دیا لیکن اس رچے ہوئے اسلوب کی ابتدائی شکل اَور ہلکا سا عکس ضرور نظر آتا ہے''۔[۳۷]

یہ درست ہَے کہ یہ وہ رچا ہوا اُسلوب نہیں جو آزاد کی انشاء پردازی کا خاصا ہَے لیکن اس اسلوب کا نقش اولین ضرور ہے۔آزاد اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اَور بروئے کار لانے میں مصروف تھے۔

ڈاکٹر محمد صادق اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

غرض ہم آزاد کو عالم جوانی میں کچھ اس طرح تصور کرتے ہَیں: ایک ہمہ تن شوق ، سراپا نظر ، تجسس پسند ، نوجوان جو اکیلا یا دوسروں کے ہمراہ ، شہر کے مختلف مقامات پر آتا جاتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوقین، ملنسار ، تخیل کا تیز اَور ذکی الحس جس نے یقیناً اس ابتدائی زمانے ہی میں شعرا کے متعلق مواد جمع کرنا شروع کر دیا ہو گا بعینہ جس طرح والٹر سکاٹ نے شباب ہی میں اپنے وطن کے منظوم عوامی قصے کہانیاں جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔[۳۸]

۱۸۵۷ء سے پہلے آزاد شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ البتہ ان کی شادی کی صحیح تاریخ اَور سن کے بارے میں حتمی طور پر نہیں بتایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

جنگ آزادی سے پہلے آزاد کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہَے کہ ان کی شادی ایک گھوڑوں کے سوداگر، مرزا عسکری کی صاحب زادی سے ہوئی تھی غالباً یہ اس زمانے کا واقعہ ہو گا جب وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اخبار نویسی میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ''دہلی اردو اخبار'' کا واحد پرچہ متعلقہ ستمبر۱۸۵۴ء سے جو ہمارے پاس ہے، پتا چلتا ہے کہ آزاد نے اس پرچے کی چھپائی اَور اشاعت کا سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔[۳۹]

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی:

۱۸۵۷ء سے کچھ سال پہلے آزاد تاہل کی زنجیر میں بھی جکڑ دیئے گئے تھے۔ ان کی شادی کی صحیح تاریخ متعین کرنا ممکن نہیں صرف قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ہنگامے میں جب خاندان کے سب افراد گھر چھوڑ کر نکلے تو ان میں آزاد کی دو لڑکیاں بھی تھیں، بڑی لڑکی کی عمر چھ سات برس کی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا ہَے کہ آزاد کی شادی ۱۸۵۷ء سے آٹھ نو سال پیشتر اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ہوئی ہو گی۔[۴۰]

بہر حال اس سے یہ پتہ چلتا ہَے کہ آزاد کی شادی ۱۸۵۷ء سے پہلے ہوگئی تھی۔آزاد رفتہ رفتہ اَدبی دنیا میں قدم رکھ ہی رہے تھے کہ دہلی کے حالات دگرگوں ہو گئے۔ ان کی اَدبی زندگی کا آغاز حقیقی معنوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو بغاوت کے الزام میں انگریزوں نے گرفتار کرلیا۔ یہ گرفتاری ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی کیونکہ انگریزوں نے ان کو بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی تھی۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

مسٹر ٹیلر اَور مسٹر اسٹینیر جان بچا کر بھاگے اَور میگزین سے صحیح سلامت باہر نکل آئے لیکن ہوش و حواس باختہ، حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ہر سمت موت کھڑی نظر آتی تھی۔ بہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اَور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔اس نے انھیں محمد باقر صاحب مولوی محمد حسین آزاد کے والد کے گھر پہنچا دیا۔مولوی محمد باقر سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ انہوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے روز جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام ہوگئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا مگر ان کا بڑا افسوس ناک حشر ہوا۔غریب بیرم خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اَور اتنے لٹھ برسائے کہ بیچارے نے وہیں دم دے دیا۔ بعد میں مولوی صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھائے گئے اَور ان کا کوئی عذر نہ چلا۔[۴۱]

آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

''قصور صرف اتنا ہَے کہ مولانا عمائدِ شہر میں سے تھے اَور مسلمان تھے۔ پھر قلعہ معلٰی سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتے تھے۔بس یہی ان کے سب سے بڑے جرم تھے''۔[۴۲]

ڈاکٹر محمد صادق مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام کے علاوہ مولوی محمد باقر کی سزا کی ایک وجہ یہ بھی بتاتے ہَیں:

مولوی محمد باقر کی سزایابی کی مسلمہ وجہ یہ بھی بیان کی جاتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کے چوٹی کے صحافی تھے، جن کو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ انتہائی ہمدردی تھی۔ بلاشبہ یہ امر قابل تسلیم ہَے کہ اس زمانے کے معیار انصاف کے مطابق اتنی ہی بات ان کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے کافی تھی لیکن ہمیں تلاش و تفحص سے ایسے کوائف

بھی دستیاب ہوئے ہیں جن سے مولوی محمد باقر ہمارے نقطہ نظر میں شہادت کے مستحق ٹھہرتے ہیں لیکن سرکار برطانیہ کی رعایا ہونے کے لحاظ سے مورد الزام۔ یہ شہادت اس رسالے سے فراہم ہوئی ہے جو انگریزوں کے ایک اشتہار یا اعلان کے جواب میں اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ دہلی پر آخری حملہ کرنے والے تھے۔ اس اشتہار کا مطلب باغیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ اس میں قطعی طور پر یقین دلایا گیا تھا کہ انگریزوں کی مہم آرائی کا مقصد ہندؤں کی گوشمالی ہے۔ نیز کارتوسوں میں جو چکنائی استعمال کی گئی تھی وہ سور کی چربی سے نہیں بلکہ گائے کی چربی سے حاصل کی گئی تھی۔ جوابی اشتہار، جس میں انگریزوں کی مصالحانہ تجویز کو شدت سے رد کیا گیا تھا اور ان کے خلاف جہاد کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ''اردو اخبار'' میں شائع ہوا تھا۔ رسالے کا عنوان ہے:

رسالہ ہادی العباد فی جواز الجہاد الی یوم التناد متضمن جواب با صواب در رد اشتہارمکاران جعل ساز عدومبین دین خاتم النبیین ۔نوک زدہ خامہ جناب استادی محمد ابن محمد در ۱۲۷۴ھ مطبع دہلی ''اردو اخبار'' ملقب بہ خطاب اخبارظفر من اہتمام سید عبد اللہ ۔

اس سلسلے میں ''اردو اخبار'' کا ذیلی عنوان ''اخبارظفر'' خاص معنی رکھتا ہے۔ یہ اردو اخبار کے اس واحد نسخے کی لوح پر جو ہمارے پاس ہے درج نہیں۔ یہ گمان غالب یہ ذیلی عنوان جنگ آزادی کے دوران اس وقت اختیار کیا گیا تھا جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا سیلاب پورے چڑھاؤ پر تھا، اور اس سے اس کے مدیر کی قلعہ دہلی سے وابستگی قطعی طور پر ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ فتوے کا پورا متن یہ ہے:

استفسار: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں؟ اس صورت میں اب اس

شہر والوں پر جہاد فرض ہَے یا نہیں ؟ اَور اگر فرض ہَے تو فرض عین ہَے یا نہیں ؟ اَور جو لوگ شہروں اَور بستیوں میں رہنے والے ہَیں ، ان کو بھی جہاد فرض ہَے یا نہیں ؟ بیان کرو ۔

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہَے اوپر اس شہر کے تمام لوگوں کے اَور استطاعت ضرور ہَے اس کی فرضیت کے واسطے ۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اَور لڑائی کی ہے اَور بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اَور مہیا اَور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا ؟ اَور اطراف و احوال کے لوگوں پر ، جو دور ہیں، باوجود خبر کے فرض کفایہ ہَے ۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اَور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا ۔

بلا لحاظ اس امر کے کہ فتوے کا مصنف کون تھا، اس پُر آشوب دور میں مطبع دہلی سے اس کی محض اشاعت ہی مالک کی سزائے موت کے لیے کافی دلیل تھی لیکن اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہَے کہ محمد ابن محمد ، مولوی باقر کا اپنا فرضی یا تصنیفی نام تھا۔ نیز مستند تاریخی شواہد سے یہ بھی پتا چلتا ہَے کہ مولوی باقر نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ان دلائل و شواہد کے بعد مولوی محمد باقر کی سزا یابی پر مزید غور کرنا بے کار ہے۔ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ انھیں پھانسی کیوں دی گئی اَور ان کی جائیداد کیوں ضبط کی گئی، بلکہ حیرت اس پر ہَے کہ آزاد جو اس وقت اخبار کے مدیر تھے، کیسے جان بچا کر نکل گئے ۔[۴۳]

ان دلائل و شواہد کو مزید تقویت ''ڈاکٹر اسلم فرخی'' کے اس بیان سے ملتی ہَے لکھتے ہَیں:

بہر حال اتنا ضرور کہا جا سکتا ہَے کہ مولوی محمد باقر کو جو سزا ملی اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ٹیلر کے قتل سے ضرور تھا ۔ اس سلسلے میں دہلی اردو اخبار بابت ۱۷ مئی ۱۸۵۷ کا یہ اقتباس بھی قابل توجہ ہے:

سنا گیا ہے کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں میگزین بند تھے اس دن تک کچھ آب و دانہ باقی تھا اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم سہ شنبہ دوپہر اسی تھانہ کے علاقہ میں مارے گئے۔ یہ شخص مذہب عیسوی میں نہایت متعصب تھا اور اکثر ناواقف لوگوں کو اغوا کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر چمن لال کا خون اسی کی گردن پر رہا۔ عجب شان ایزدی ہے کہ یہ شخص نہایت مالدار تھا۔ قریب دو لاکھ کے روپیہ اس کا بنک کلکتہ و دہلی میں جمع تھا اور چند بنگلہ وغیرہ کرایہ کثیر کے چھاؤنی میں تھے اور یہ روپیہ بھی اس قدر سعی و کوشش سے جمع کیا تھا کہ صرف ڈیڑھ آنہ یا چار پیسے روز اپنی ذات کے صرف طعام میں لاتے تھے اور باقی سب داخل بینک دن رات میں جو وقت فرصت ہوتا تھا اسے حساب کتاب زر بینک میں صرف کرتے تھے۔ کپڑے بھی صرف ضرورتاً قابل جلسہ اہل جلسہ کے پہنتے تھے لیکن قابل عبرت ہے حال دنیائے دون کا کہ باوجود اس زر کثیر کے دن بھر لاشہ برہنہ خاک و خون میں غلطاں پڑا رہا۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ فقیری لباس اس وقت تھا اور منہ پر خاک ملی ہوئی تھی۔

یہی بیان مولوی محمد باقر کی گرفتاری کے لیے کافی تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اخبار کا نام بدل کر ''اخبار الظفر'' کر دیا تھا ان کے اخبار اور پریس میں انگریزوں کے خلاف چیزیں چھپتی تھیں ، پھر یہ کہ انھیں بادشاہ کا قرب بھی حاصل تھا۔تقرب شاہی کے ثبوت میں ہمیں جیون لال کے روز نامچہ غدر میں یہ عبارت ملتی ہے۔

۱۶ مئی ، آج کے دن بادشاہ نے مولوی محمد باقر اور مولوی عبد القادر کو بار یاب ہونے کی عزت بخشی کیونکہ انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت ذہانت اور بہادری سے سر انجام دیا تھا۔موخر الذکر نے اطلاع دی کہ میں ایسے انتظامات مکمل کر رہا ہوں جس کی وجہ سے باغی خود بخود شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ بادشاہ

نے مولوی محمد باقر کو خلعت عطا کیا اَور مولوی عبد القادر کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شاہی ہودے میں بٹھا کر ان کے گھر روانہ کیا۔[۴۴]

ذرائع سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مولوی محمد باقر کو سر برآوردہ باغیوں میں شمار کیا گیا تھا اَور دہلی پر قبضہ کرتے ہی انگریزوں نے مولوی محمد باقر کو گرفتار کر لیا۔ محمد حسین آزاد بھی انگریزوں کے عتاب میں آ گئے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا بیان ملاحظہ کیجئے:

مولوی محمد حسین کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا ۔مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی تھی اَور ان پر بھی قوی شبہ تھا ۔مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اَور کئی سال تک سر زمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے۔[۴۵]

مولوی عبدالحق کا یہ بیان درست نہیں کہ آزاد بھاگ کر ایران چلے گئے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں نے عام معافی کا اعلان کیا تو اس وقت آزاد بقول اپنے لکھنؤ میں تھے۔[۴۶]

آغا باقر کا یہ بیان بھی اِس بات کی تائید کرتا ہے کہ:

مولانا روتے دھوتے صبر کی سل سینے پر رکھے پریشان حال دہلی سے روانہ ہو گئے۔ سر پر اُستاد کے کلام کا پلندہ تھا۔ یہی بھرے گھر میں سے اُٹھایا تھا کہ اگر ان کا کلام برباد ہو گیا تو اُن کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔ دریا کے پُل کے قریب پہنچے تھے کہ ایک گورے نے للکارا ''او بڈھا اِدھر آؤ'' پلندہ کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا اس میں کیا ہے؟ مولانا ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ اس نے سنگین سے پلندہ اتار پھینکا۔ کاغذات تتر بتر ہو گئے۔ اس نے دیکھ کر کہا ''جاؤ بھاگ جاؤ'' مولانا نے جلدی جلدی منتشر کاغذات اکٹھے کئے اور پلندہ سر پر رکھ دریا پار اُتر گئے۔ جیب میں ایک کوڑی نہ تھی جگہ جگہ مسجدوں اور سراؤں میں ٹھہرتے، محنت مزدوری کرتے۔ آخر چلتے چلتے لکھنو جا پہنچے۔[۴۷]

دہلی سے نقل مکانی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی ، بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں۔[۴۸]

آغا باقر اس کے متعلق لکھتے ہیں:

جب دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مولانا باقر مسٹر ٹیلر کی ہدایت کے بموجب ان کے کاغذات لے کر انگریز حاکم کے پاس پہنچے۔ وہ کاغذات دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور پوچھا۔مسٹر ٹیلر کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا انہیں تو لوگوں نے مار دیا۔ اس نے حکم دیا ، انہیں گرفتار کر لو اور گھر لوٹ کر ضبط کر لو۔ اِدھر مولانا گرفتار ہوئے اُدھر کامیاب سپاہی گھر میں گھس آئے ۔گھر میں **۲۲** نیم جان تھے۔سنگینیں دکھا کر انہیں گھر سے نکال دیا اور تمام املاک بحقِ سرکار ضبط ہو گئی۔[۴۹]

آزاد اپنے کنبے کے ان افراد کے ہمراہ دھوبی واڑے کی گلی میں پہنچ گئے۔[۵۰] اور شہر سے باہر نکلنے کی تدبیریں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک گولہ زمین پر آگرا۔ اس وقت مولانا آزاد کی ایک ڈیڑھ برس کی بچی تھی جو دھماکے سے بے ہوش ہوگئی اور صدمہ کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے دم دے دیا۔اور خدا کو پیاری ہوگئی۔محمد حسین آزاد نے اپنے کنبے کے باقی ماندہ افراد کو سونی پت روانہ کر دیا۔اور خود اپنے والد سے آخری ملاقات کرنے کے لئے دہلی واپس آگئے۔

چونکہ محمد حسین آزاد انگریزوں کے زیر عتاب بھی تھے۔اس طرح ان کی جان کو خطرہ تھا۔ دہلی پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط قائم ہو چکا تھا۔ایسے میں آزاد کا اپنے باپ سے ملنا مشکل تھا۔ اس سلسلے میں آزاد نے اپنے باپ کے دوست سے مدد لی جس کی تفصیل آغا محمد باقر یوں بیان کرتے ہیں :

آخر آزاد کو ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا کہ وہ مولانا محمد باقر کا بہت دوست تھا۔۔۔ اس کے پاس پہنچے اس نے وعدہ کیا کہ جس طرح بھی ہو گا میں تمھاری مدد کروں گا چنانچہ اس نے سب سے پہلے یہ مشورہ دیا کہ اپنا لباس تبدیل کرو اَور میرے سائیس کا لباس پہنو ۔۔۔ آزاد نے اسی پر عمل کیا کہتے ہَیں پہلے اس نے خود دہلی دروازے کے باہر جا کر باغی قیدیوں کا معائنہ کیا کہ لق و دق میدان میں پڑے تھے۔ چاروں طرف سنگین فوجی پہرہ تھا کہ کوئی جان بچا کر نکلنے نہ پائے جرنیل سردار نے واپس آ کر آزاد کو ان حالات سے آگاہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دوسرے روز جرنیل صاحب اپنے گھوڑے پر چلیں اَور آزاد بحیثیت سائیس کے اس کے ساتھ ساتھ دوڑیں اَور اس طریقے سے قیدیوں تک پہنچ جائیں ۔ دوسرے روز اسی تجویز پر عمل ہوا۔ آزاد سائیس کا لباس پہنے جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلے اَور آخر اس مقام تک پہنچے جہاں باغی قیدی اپنی زندگی کی آخری سانس گذار رہے تھے۔ کوئی بھوک سے رو رہا تھا۔ کسی کو موت اَور بربادی کا الم نیم جاں کیے تھا۔ بہت سے بےفکرے اس عالم میں بےفکر تھے۔ شطرنج اَور چوسر اَور گنجفے کی بازی لگ رہی تھی۔ انھیں لوگوں میں ایک طرف کو ایک مرد خدا خلوص دل سے عبادت میں مشغول تھا۔ یہی آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے (مولانا محمد باقر کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی)۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا لاڈوں کا پالا جگر گوشہ سائیسوں کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گذری۔ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو گئی۔ جب نظر نے یاوری کی تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہَیں کہ بس آخری ملاقات ہو گئی۔ اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہَے کہ ایسی حالت میں اپنے اَور اکلوتے بیٹے کے لیے کیا کیا دعائیں مانگی ہوں گی۔ آزاد نے اس

وقت لاکھ ضبط کیا لیکن نہ ہو سکا اَور وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے اَور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک کہ شاہ جہاں آباد کی یہ مقدس اَور معصوم روحیں قفس عنصری میں قید رہیں۔[۵۱]

غدر کے بعد آزاد تقریباً ڈیڑھ دو سال تک آوارہ اَور سرگرداں در در کی خاک چھانتے رہے۔ زندگی پر ہر وقت موت کے بادل منڈلاتے رہے۔ان پریشانیوں اَور خوف نے ان کی باقی ماندہ زندگی پر گہرے اثرات ڈالے بقول ڈاکٹر محمد صادق:

ان مصیبتوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا جوانی کی ساری امنگیں اَور ولولے بجھ کر رہ گئے۔غدر سے پہلے وہ بڑے ہشاش بشاش، زندہ دل اور ملنسار تھے۔اب خاموش اَور عزلت پسند ہو گئے۔مولوی خلیل الرحمٰن کہتے ہیں۔''ایام غدر کے مصائب کا طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر تھا۔ نہ پوچھیے۔ میں نے صبح کی ہوا خوری یا شام کی فرصت میں بارہا چھیڑا اَور انجام آنسوؤں پر ہوا''۔[۵۲]

۱۸۵۷ء کے غدر کے ڈیڑھ دو سال بعد آزاد نے پنجاب کا رخ اختیار کیا۔ جالندھر میں ڈاکٹر سٹائین کے ہاں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد ریاست جنید چلے گئے، وہاں بھی دس ماہ تک رہے اَور پھر ۱۸۵۹ء میں جگراؤں میں مولوی رجب علی ارسطو جاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۶۵ء تک مولوی رجب علی کے اخبار''مجمع البحرین'' میں بحیثیت پرنٹر پبلشر فرائض انجام دیتے رہے۔

جگراؤں پہنچ کر آزاد نے اپنے کنبے کے افراد (جو ابھی تک سونی پت میں تھے) کو بھی بلا لیا تھا لیکن جگراؤں میں آزاد ایک سال سے زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے۔آزاد محکمہ تعلیم میں ملازمت کے خواہاں تھے۔ وہ اس سلسلے میں کوشش کر رہے تھے ۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب نے انھیں ڈائریکٹر تعلیمات کپتان فلر کے نام ایک تعارفی خط بھی لکھ کر دیا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں جب آزاد ابھی جگراؤں ہی میں رہائش پذیر تھے، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب سے لدھیانہ میں خود ملے تھے

اَور اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ اس کے بعد وہ پھر ۱۸۶۱ء میں دوبارہ ڈائریکٹر تعلیمات سے ملے اَور ایک درخواست بھی پیش کی۔ درخواست کی عبارت درج ذیل ہے:

بنام میجر فلر ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب

بحضور لامع النور، سکندر ارسطو فطرت، آصف سلیمان رفعت صاحب خداایگان خداوند، مراتب ارجمند، دام اقبالہم وضاعف اجلالہم!

تسلیم وآداب سر اَدب سے بجا لا کر عرض رسا ہے:

حضور کو یاد ہوگا کہ ماہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں حضور دورے سے مراجعت فرما کر تشریف لائے اَور ڈاک بنگلہ لودھیانے میں رونق افروز ہوئے تو فدوی بھی شرف اندوز ملازمت ہوا تھا۔ اس وقت فدوی پرنٹر و پبلشر مطبع مجمع البحرین میں تھا کہ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر نے بنا کیا۔ فی الحال بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں اَور محکمہ محتشمہ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر بہادر میں سر رشتہ دار ہے چونکہ حضوری و خدمت حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے اس قسم کے فوائد متصور ہیں۔ جن سے خلق خدا رضا مند ہو۔ اَور واسطے ہمیشہ کے نام نیک یادگار رہے۔اس واسطے فدوی بھی آرزو مند قدم بوسی حضور کا ہے۔ امیدوار ہوں کہ بہ نظر علم پروری و جوہر شناسی اپنے وقت فرصت سے فدوی کو مطلع فرمایئے کہ حاضر حضور ہو کر دولت لازوال حاصل کروں۔ فقط زیادہ آداب۔

آفتاب دولت واقبال تاباں رہے!

فدوی محمد حسین
سر رشتہ دار محکمہ محتشمہ
جنرل پوسٹ ماسٹر لاہور، پنجاب
۲۵ مئی ۱۸۶۱ء [۵۳]

اس وقت تو ملاقات کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ اَور نہ ہی درخواست پر کوئی عمل در آمد ہوا۔ البتہ بعد میں ۱۸۶۴ء میں آزاد کو محکمہ تعلیم میں معمولی سی نوکری مل گئی۔مولانا کے بہنوئی سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر تھے کچھ عرصہ کے لیے مولانا اپنے بہنوئی کے پاس سیالکوٹ آئے اَور وہاں سے کشمیر کی

سیر کا قصد کر لیا۔ کشمیر کی سیر سے واپس آئے تو سیالکوٹ ہی میں رہنا شروع کر دیا۔ اور وہاں پرانی اور نایاب کتابوں کی تجارت شروع کر دی۔ اس کے بعد جب ان کے بہنوئی کا تبادلہ لاہور ہو گیا تو مولانا بھی اُن کے ساتھ لاہور آ گئے۔ یہاں رجب علی ارسطو جاہ گورنر پنجاب سر ہنری لارنس کے میر منشی تھے۔ ان کی خط و کتابت تمام کی تمام فارسی میں ہوتی تھی۔ ارسطو جاہ نے یہ کام مولانا آزاد کو سونپ دیا۔ اس دور میں آزاد نے لاتعداد فرمان اور چٹھیاں فارسی میں لکھیں۔ اسی زمانے میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں کچھ عرصہ بغیر تنخواہ کے کام کیا۔ آخر ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء سے تیس روپے ماہوار پر ڈیڈ لیٹر آفس میں ملازم ہو گئے یہاں وہ ڈاک خانے کے اعلانات کا ترجمہ کرتے تھے۔ دسمبر ۱۸۶۲ء میں دو سال کی ملازمت کے بعد انھیں ملتان لائن میں بحیثیت اوورسیئر تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں آزاد کی تنخواہ زیادہ تھی لیکن آزاد کو لاہور سے باہر جانا پسند نہ تھا۔ اس لیے استعفیٰ دے دیا۔

۱۸۶۴ء میں محکمہ تعلیم میں آنے کے بعد آزاد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس سے پہلے مولانا سکشا سبھا (لاہور کی تعلیمی انجمن) کے لیے آئینہ صحت تصنیف کر چکے تھے۔ یہ کتاب اُنھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے لکھی تھی۔ ڈائریکٹر تعلیم نے اسے بہت پسند کیا اور بہت سراہا اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس پر حکومت سے انعام دلوائیں گے۔ مولانا آزاد "سکشا سبھا" کے سرگرم رکن تھے۔ نمائش پنجاب کے لیے اُنہوں نے ورنا کیولر کی فہرست اور دوسری اشیاء جو نمائش کے لیے ضروری تھیں ان کی تفصیل نہایت محنت اور جانفشانی سے تیار کی۔ ۱۸۶۴ء میں آزاد نے نئے انداز سے عربی کی گرامر تصنیف کی۔ اس کے بعد علم منطق پر ایک رسالہ مغربی انداز میں لکھنے کی اپنے محکمہ سے اجازت مانگی۔

ان کی ادبی سرگرمیوں کا ایک حاصل "نصیحت کا کرن پھول" ہے، جو انھوں نے ۱۸۶۴ء میں لکھی۔ یہ کتاب پنڈت من پھول کے نام سے مناسبت رکھتی ہے۔ جو آزاد کے مربی اور گورنر پنجاب کے میر منشی تھے۔ اس کتاب میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر لائٹنر لاہور کالج کے پرنسپل کے طور پر خدمات انجام

دینے لگے جنھوں نے طالب علموں میں علم و اَدب کی لگن پیدا کر دی۔انہی دنوں آزاد کی ملاقات ڈاکٹر لائٹر سے ہوئی۔ ڈاکٹر لائٹر آزاد کی ذہانت اَورعلمی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔آزاد اس وقت ملازمت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو اُردو پڑھانے کا کام بھی کرتے تھے۔یہی چیز ان کوڈاکٹر لائٹر کےقریب لانے میں معاون ثابت ہوئی ۔

۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو ایک انجمن'' مطالب مفیدہ پنجاب'' المعروف بہ انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی اور مولانا اس کے ممتاز رکن بنے ۔ بعد میں اس کے سیکرٹری منتخب ہوگئے ۔انجمن نے اپنا رسالہ مطالب مفیدہ اشاعت کے لیے جاری کیا تو آزاد اس کے ۵۰ (پچاس) روپے ماہوار پر ایڈیٹر ہوگئے ۔گیارہ فروری ۱۸۶۵ء کے جلسہ عام میں انہوں نے اپنا پہلا مضمون ''درباب رفع افلاس ''پڑھا اَور اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ رسالے میں انجمن کی روئداد اَور وہ مضامین شائع ہوتے تھے جو انجمن کے جلسوں میں پڑھے جاتے۔آزاد کی ان تھک کوششوں سے انجمن اَور اسکا رسالہ بہت مقبول ہوا آزاد انجمن کے جلسوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھا رہے تھے کہ ۱۸۶۵ء میں آزاد بخارا روانہ ہو گئے ۔

دراصل آزاد انگریزی حکومت کے ایما پر وسط ایشیا میں گئے۔ حکومت ہند نے پنڈت من پھول ، منشی فیض بخش پشاوری ، کرم چند نند رام اور محمد حسین آزاد کو وہاں کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا ۔ پنڈت من پھول اِس مشن کے سربراہ تھے۔

آغا محمد باقر آزاد کے اِس سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ۱۸۶۵ء میں حکومت ہند نے ایک مشن سنٹرل ایشیا کی سیاسی حالت کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا ،مولانا بھی اس کے رُکن تھے اس کے دوممبر افغانستان کی حدود سے آگے نہ جا سکے۔ قدم قدم پر جان کا خطرہ تھا اَور راستوں کا حال معلوم نہ تھا لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری۔ سفر کا شوق ،علمی تحقیقات اَورمعلومات مہیا کرنے کا جذبہ ان کے قدم آگے ہی بڑھاتا رہا۔ افغانستان میں سفر کرنے کے لیے پشتو

> سیکھی ، ترکی زبان میں شُدبُد پیدا کی۔ وہ جہاں جاتے وہاں کے لوگوں میں اس طرح گھل مل جاتے کہ وہ انھیں اپنا آدمی سمجھتے۔ سفر کرتے کرتے وہ روس کے علاقے میں جا پہنچے۔ حکومت ہند کو مدتوں سے خطرہ تھا کہ روس ہندوستان پر حملہ کر دے گا اُنھوں نے روس کی فوجی طاقت کا پتہ لگایا۔فوجی چوکیاں دیکھیں۔ آنے جانے کے راستوں کا جائزہ لیا۔ کئی جگہ مصیبتوں میں گھر گئے کہیں وحشیوں کے ہاتھوں میں پھنس گئے ، کہیں کافر سمجھ کر پکڑ لیا گیا اَور قتل کا فتویٰ بھی صادر ہو گیا۔ کہیں جاسوس جان کر دھر لیے گئے۔ مولانا کمال ہمت اَور استقلال سے ان تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرتے رہے ، زندگی باقی تھی اس لیے ہر جگہ کسی نہ کسی ترکیب سے جان بخشی ہو گئی۔ اِدھر عزیز و اقربا ان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ ڈیڑھ سال بعد بخیریت واپس آ گئے۔[۵۴]

بہر حال مولانا آزاد نے واپس آ کر ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب میں ملازمت کرنی شروع کر دی اَور لیکچر دینا شروع کر دیئے۔

۲۲ جون ۱۸۶۸ء تک آزاد لکچر دیتے رہے جنھوں نے انجمن میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ۱۸۶۷ء میں آزاد کو حسن خدمات کے صلے میں ایک Trinket عطا ہوا۔انجمن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اَور آزاد اپنی ہر دل عزیزی کے باوجود انجمن کی ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ محکمہ تعلیم ہی کو ہر لحاظ سے ترجیح دیتے تھے اَور اپنے لیے پسند کرتے تھے۔ چنانچہ جون ۱۸۶۸ء میں ناظم تعلیمات نے آزاد کو مری بلا لیا۔ اس طرح آزاد انجمن کے فرائض سے الگ ہو گئے۔ اسی زمانے میں آزاد نے اپنی مشہور تصنیف ''آبِ حیات'' کی داغ بیل بھی ڈالی۔۱۸۶۸ء میں دراصل انھیں مسٹر پیرسن کی اعانت پر مامور کیا گیا تا کہ وہ درسی کتب کے مرتب کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ پیرسن کی اعانت اَور قلمی رفاقت کے بعد آزاد سرکاری اخبار کے سرکاری ایڈیٹر مقرر کر دیئے گئے۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ انگریزوں کو اردو بھی پڑھاتے تھے۔۱۸۶۸ء میں انہوں نے ہنری کیلی اَور ایک دوسرے انگریز کو اردو ، فارسی پڑھائی۔ اردو اَور فارسی کی ریڈریں بھی اس زمانے

میں تیار ہوئی تھیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''یہ کام بڑا مشکل تھا بوڑھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ شب و روز اِسی خیال میں رہتا تھا کام کرنے کا زمانہ اَور تمام دماغی صلاحیتیں اس کام میں صرف ہوگئیں۔ جب کہیں جا کر بچوں کے لیے یہ کھلونے تیار ہوئے''۔[۵۵]

اس کام سے آزاد کو کوئی مالی فائدہ تو نہ ہوا البتہ قوم کے لیے تعلیم کی بُنیاد مہیا ہوگئی جس سے آزاد کو اَدبی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۸۶۸ء ہی میں آزاد نے قصص ہند حصہ دوم مرتب کی اَور ساتھ ہی فارسی قواعد بھی مرتب کی جس پر انھیں دس نومبر ۱۸۶۹ء کو ایک خط کے ذریعے سے مبلغ دو سو روپے بطور انعام عطا ہوئے۔اسی طرح ''دختر کشی'' پر مقالہ لکھنے اور دوسرے نمبر پر آنے پر آزاد کو دو سو روپے انعام ملا ۔۱۸ اٹھارہ مئی ۱۸۶۹ء کو آزاد نے ایک سپاس نامہ ڈاکٹر لائٹر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس سپاس نامے کے چیدہ چیدہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

یہ عجیب موقع ہے کہ جس میں ہم آپ کو تہنیت و مبارک باد دیتے ہیں اور اپنے دل ، دردِ حسرت سے آب آب ہوتے ہیں۔تہنیت تو اس لئے کہ آپ کو ملک سلیمان حاصل ہوتا ہے اور دردِ حسرت یہ کہ آپ جیسے محسن و مربی ، شفیق خاص و عام سے جدا ہوتے ہیں۔ ہم آپ کی کون کون سی بات کو یاد کریں اور کیا کیا اوصاف و محاسن بیان کریں۔ اگر یہ کہیں کہ پانچ برس کے عرصے میں لاہور کالج کی پرنسپل شپ کا حق خوب ادا کیا تو کیا بڑی تعریف ہوئی کہ اکثر ملازم سرکاری اپنا فرض پورا کرتے ہیں ، اگر کہیں کہ آپ کے طلبا نے بھی ترقی کی ہےتو مدرس کا کام یہی ہے ، انصاف یہ ہے کہ آپ نے نہ فقط شاگردوں کو بلکہ تمام پنجاب کو سکھایا اور کر دکھایا کہ انسانیت اور مروّت کیا شے ہے اور بامروت انسان کو کیا کرنا چاہیئے۔

ہمارے قدیم علوم کیا عربی کیا سنسکرت ، چراغ سحری ہو گئے تھے۔ آپ نے کہ روشن ضمیر اسم با مسمّی ہیں ، بجھے ہوئے چراغوں کو اس طرح سے روشن کیا ہے کہ چند روز میں سارے ہندوستان کو روشن کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب ! آپ کا شکریہ ایک ایک صفحہ دل پر نقش ہے ، نہ مٹے گا اور جان کے ساتھ جائے گا۔ جو کچھ دلوں میں ہے نہ بتا سکتے ہیں نہ دکھا سکتے ہیں ، مگر دل سینوں میں لوٹتے ہیں۔ جس آواز نے زمانے کو خاموش کر دیا وہ آواز نہ سنائی دے گی ، ہم پکاریں گے اور جواب نہ پائیں گے ، سننے کی نعمت سے ہمارے دل اور کان کا حصّہ ہو چکا۔ اب جن کا حصّہ ہے ان کے خوشا نصیب۔

آپ کی شفقت اور نیکیوں کے نقش دل پر کندہ ہیں ، مرتے دم تک دلوں سے نہ بھولیں گے۔ ڈاکٹر صاحب آپ بھی ہمیں نہ بھولئے گا اور ہمیں بھی یقین واثق ہے کہ آپ نہ بھولیں گے ، دنیا میں لوگ کہتے ہیں کہ محبت پیدا نہیں ، یہ سب باتیں ہیں ، ڈاکٹر صاحب محبت والے پیدا نہیں ، ایک دن وہ تھا کہ آپ ہم کو سکھلاتے تھے اور لوگوں کے لیے مضمون لکھاتے تھے، افسوس کہ آج آپ کی رخصت کا مضمون ہم کو لکھنا پڑا۔ کاش یہ قلم ٹوٹ جاتا اور زبان بند ہو جاتی۔ جو آگ دل میں بھڑکی ہے اگر چہ فرو نہیں ہوتی مگر اب اس داستان غم کو دعا پر ختم کرتے ہیں۔[۵۶]

اس سے آزاد اور لائٹنر کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دور تک آزاد کا اَدبی اُسلوب پختگی اختیار کر چکا تھا۔

۱۸۶۹ء میں مولانا آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر عربی تعینات کر دیئے گئے تھے۔ان کا یہ تقرر پچھتر روپے ماہوار پر تھا اَور عارضی تھا۔ ۱۸۷۰ء میں آزاد اسی ملازمت پر ایک سو پچاس روپے ماہوار پر مستقل ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت ملنے کے بعد آزاد

کی زندگی کا بہترین اَور سنہری دور شروع ہوتا ہے۔جس سے ایک تو ان کا اپنے ہمعصروں میں وقار بڑھ گیا اَور دوسرا یہ کہ معاشی اُلجھنوں سے نجات مل گئی۔ عارضی ملازمتوں سے چھٹکارہ مل گیا لیکن یہ بہترین دور زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ گورنمنٹ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد آزاد کی صحافتی سرگرمیاں برقرار رہیں ، سرکاری اخبار بند ہو جانے پر انجمن پنجاب نے ہمائے پنجاب کے نام سے ایک اخبار شائع کرنا شروع کر دیا۔۱۸۷۰ء میں اس کی ادارتی ذمہ داریاں آزاد کو سنبھالنا پڑیں۔جس کی آزاد نے باقاعدہ اجازت لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے لی۔ ۱۸۷۱ء میں ہما میں سیالکوٹ کے ایک نامہ نگار کا خط بابت'' بعنوان حال چوری ملازمین محکمہ ڈاک'' شائع ہوا ، اس خط کی اشاعت پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اَور لائٹنر نے آزاد کو لکھا کہ اخبار کا چارج منشی محمد لطیف کو دے دیا جائے۔ اٹھارہ فروری ۱۸۷۱ء کو منشی محمد لطیف ''ہمائے پنجاب'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اَور یہاں ہی سے آزاد اَور لائٹنر کے تعلقات بگڑ نے شروع ہو گئے۔ ایک اَور وجہ تعلقات کشیدہ ہونے کی کتاب ''سنین الاسلام'' ہَے جو ڈاکٹر لائٹنر اَور آزاد کے اشتراک سے مرتب ہوئی تھی ، جبکہ سنین الاسلام کا دوم حصہ مولوی کریم الدین انسپکٹر مدارس کے اشتراک سے لائٹنر نے مرتب کیا۔

لائٹنر اَور آزاد کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ لائٹنر نے موقع بہ موقع آزاد کو زک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اَور آزاد بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔اس کے باوجود کہ آزاد کے تعلقات ڈاکٹر لائٹنر سے اچھے نہ تھے، مولانا آزاد نے گورنمنٹ کالج میں بڑا اچھا وقت گزارا۔درس و تدریس کی خدمات دلچسپی سے انجام دیتے رہے اَور ساتھ ساتھ اَدبی مشاغل بھی جاری رکھے۔اس دور میں آزاد کا اہم ترین کارنامہ سخن دان فارس ہَے۔سخن دان فارس کا دوسرا حصہ گیارہ لیکچروں پر مشتمل ہے جو بقول آغا محمد باقر ۱۸۷۴ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں دیے گئے تھے۔ ۱۸۷۴ء آزاد کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہَے۔ ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء میں انہوں نے نظم کے مشاعرے کا ڈول ڈال کر اُردو شاعری کو طرح نو سے روشناس کرایا۔

۱۸۷۵ء اَور ۱۸۷۶ء میں آزاد نے نیرنگ خیال اَور آب حیات کے متفرق اجزا انجمن مفید عام قصور کے رسالے میں شائع کرنے شروع کر دیئے اَور ۱۸۸۰ء میں آب حیات اَور نیرنگ خیال کتابی صورت میں شائع ہوگئیں۔۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۶ء تک آزاد کی زندگی بڑی مصروف رہی۔ ایک طرف کالج کا کورس بنانے کی ذمہ داری نبھانا تھی اَور دوسری طرف دربار اکبری کی ترتیب میں مصروف تھے۔۴ جون ۱۸۸۴ء کو آزاد پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رکن بن گئے۔

آزاد نے کم و بیش پندرہ سال گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت کی۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۸۸۴ء میں وہ یونیورسٹی (اورنٹیل کالج) سے منسلک ہوگئے۔۱۸۸۴ء کے آخر یا ۱۸۸۵ء کے شروع میں آزاد کی چہیتی بیٹی امۃ السکینہ کا انتقال ہوگیا، جس کا صدمہ وہ برداشت نہ کر پائے۔چنانچہ تیس ستمبر ۱۸۸۵ء کو وہ ایران کی سیر کے لیے روانہ ہوگئے۔گیارہ ماہ سیر ایران میں بسر کیے، اَور واپسی پر درس و تدریس کا سلسلہ پھر جاری ہوگیا۔

۱۴ فروری ۱۸۸۷ء کو آزاد کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔اسی عرصے میں آزاد نے دیوان ذوق کی تدوین شروع کردی تھی۔آزاد کا دماغ بیٹی کی موت پر پہلے ہی وقتی طور پر توازن کھو بیٹھا تھا۔ دیوان ذوق کی ترتیب میں دن رات کی محنت نے اَور زیادہ دماغ پر اثر کرڈالا۔آزاد کو خونی بواسیر کا عارضہ بھی لاحق ہوگیا ہوا تھا جس سے اکثر خون ضائع ہوجاتا۔اِن تمام تکلیفوں کا اثر آزاد کی دماغی حالت پر ہوا۔ نتیجتاً وہ اکثر لاہور کے باغوں میں ٹہلتے رہتے اَور چلتے چلتے میلوں تک چلے جاتے۔گھر والوں کوخبر نہ ہوتی۔گھر میں بھی آکر پلنگ پر لیٹے رہتے اَور گھنٹوں کسی سے بات چیت نہ کرتے۔کالج کے وقت پر تیار ہوتے اَور پڑھانے چلے جاتے۔ مولانا کا ان دنوں فقیروں سے بھی ملنا جُلنا ہوگیا۔ ایک مجذوب ''نواں کوٹ'' میں رہتے تھے آزاد اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ۱۸۸۹ء میں ایک دن کالج سے فارغ ہوکر گھر جانے کی بجائے سیدھے اُس مجذوب کے پاس پہنچ گئے۔انہوں نے کہا دلی جانے کا حکم ہوگیا ہے۔مولانا وہاں سے بغیر کسی کو بتائے پیدل دلی روانہ ہوگئے۔ راستے میں اپنی چہیتی بیٹی کا خیال آیا تو پٹیالے کی طرف چل دیے۔ لاہور میں ڈھنڈیا

پڑ گئی لیکن پتہ نہ چلا۔آخر کار معلوم ہوا کہ آزاد پٹیالے پہنچے ہوئے ہیں۔پٹیالہ سے مولانا دہلی گئے اَور وہاں پر کچھ دیر منشی ذکاء اللہ کے ہاں ٹھہر کر لاہور آ گئے۔ ایسی حالت میں آزاد کے لیے اپنی ملازمت کو برقرار رکھنا مشکل تھا۔ اس لیے پنشن کی بھاگ دوڑ شروع کر دی گئی۔ ان کی پنشن کے بارے میں محمد اکرام چغتائی لکھتے ہَیں:

آزاد کی زندگی کے آخری بیس سال عالم جنون میں گزرے۔ بیچ بیچ میں ہوشمندی کے لمحات بھی آتے رہے لیکن ان جنونی کیفیات میں بھی ان کی تالیفات کا سلسلہ جاری رہا۔ جو ان کے قلم کے ساتھ دیرینہ اَور گہری وابستگی کا مظہر ہے۔ اس قلمی مشقت، گونا گوں اَدبی مشاغل، تدریسی مصروفیات اَور بعض ذاتی صدمات نے ان کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا اَور علالت کے باعث انھیں اپنی ریٹائرمنٹ سے قبل طویل رخصت پر جانا پڑا۔ یہ ۵ جون ۱۸۹۰ کا واقعہ ہے تقریباً ۲ سال بعد آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم ابرو (۱۸۶۳۔۱۹۲۰) نے جو پنجاب چیف کورٹ میں مترجم تھے، والد کی پنشن و اگزار کرانے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ کیونکہ آزاد کی جسمانی اَور دماغی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ خود ان جھمیلوں میں پڑتے۔اس ضمن میں پہلی درخواست ۶جنوری ۱۸۹۲ء کو ڈائریکٹر تعلیم عامہ پنجاب کے نام بھجوائی گئی اَور تقریباً دس ماہ کی دفتری کاروائی کے بعد آزاد کو پہلے پچاس روپے اَور پھر لیفٹیننٹ گورنر کی خصوصی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار پنشن کا مستحق قرار دیا گیا۔ اور انہیں یہ رقم وفات (۱۹۱۰ء) تک باقاعدگی سے ملتی رہی۔ اس پنشن ریکارڈ کو ایک نظر دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعلقہ محکمہ کے افسران آزاد کی سرکاری ملازمت کا آغاز مئی ۱۸۷۰ء سے کرتے تھے کیونکہ اس تاریخ کو وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ عربی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوئے۔

اس سے قبل جنوری ۱۸۶۴ء سے وہ جتنی مدت مختلف حکومتی محکموں میں ملازم رہے اسے پنشن کا مستحق قرار نہیں دیا جاتا تھا۔بالآخر لیفٹیننٹ گورنر نے آزاد کی علمی اَدبی اَور سیاسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تقریبا سوا پانچ سال کی اس مدت کو

بھی سرکاری ملازمت میں شامل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اسی میں وہ آٹھ ماہ پانچ دن ۲۳ جولائی ۱۸۶۵ء تا ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء کی مدت بھی شامل تھی۔ جب وہ محکمہ امور خارجہ کی جانب سے کسی کار خاص پر متعین ہو کر وسط ایشیا کے سفر پر روانہ ہوئے۔[۵۷]

آزاد پنشن کی منظوری اَور وصولی سے پہلے ہی ہوش و حواس کھو چکے تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

ضلع لاہور کے جج W.A. Harri ۱۸۵۸ء کی دفعہ ۳۵ کے تحت اپنے حکم مورخہ تین مئی ۱۸۹۰ء کے ذریعے آزاد کو دیوانہ قرار دے چکے تھے۔ آغا محمد ابراہیم ان کی جائیداد کے متولی اَور سردار نریندر سنگھ آنریری اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور ان کی ذات کے نگران مقرر ہوئے تھے۔[۵۸]

آزاد کی دیوانگی کے مختلف اسباب تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

اسباب جنون کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں آزاد کی پوری زندگی پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک کے پورے عرصے میں آزاد مطمئن مسرور اَور فکروں سے خالی نظر نہیں آتے۔ ۱۸۵۷ء نے انہیں شدید ذہنی، روحانی اَور مادّی اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے سانحات ایسے تھے وہ کہ آزاد پھر ان کے ماتم دار رہے۔ باپ کا قتل ہو جانا، شیر خوار بچی کا توپ کے دھماکے سے دم توڑ دینا، عزیزوں کی جدائی، بادیہ پیمائی اورغریب الوطنی، یہ سب باتیں ایسی نہیں کہ کوئی انسان بھی اُنھیں بُھلا دے۔[۵۹]

عالم جنون ہی میں آزاد نے دہلی اَور علی گڑھ کا سفر بھی کیا اَور اِسی حالت میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ جو آزاد کی علمی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ۱۹۰۹ء میں بواسیر کا عارضہ شدت اختیار کر گیا۔ چھ مہینے بے حد خون ضائع ہوا۔ کھانا ترک کر دیا صرف چائے پیتے تھے۔ یکم مئی سے چائے بھی چھوڑ دی۔ آزاد اِسی عالم دیوانگی میں بائیس ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو عاشورے کی شب قیدِ حیات سے

آزاد ہوکر اپنے حقیقی رَب سے جا ملے۔ آزاد کربلا گامے شاہ لاہور میں دفن ہیں جو مزار داتا گنج بخش کے قریب ہے۔ آزاد پستہ قد اَور دُہرے بدن کے قوی ہیکل اِنسان تھے۔ لمبی ناک بڑی بڑی روشن آنکھیں، گھنی اَور گول داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، چوڑا اَور بھرا سینہ تھا۔

بقول آغا محمد باقر:

آزاد کا لباس بالکل مولویانہ اَور قدیمانہ وضع کا ہوتا تھا وہ ہمیشہ بر کے پانچے کا لٹھے کا پاجامہ اَور لٹھے ہی کا مغلی گریبان کا کرتا پہننے کے عادی تھے۔ ادھیڑ عمر میں ایک مرتبہ شو بھی پہنا لیکن وہ عام طور پر سلیم شاہی کی نری کی جوتی پہنا کرتے، گرمیوں میں نین سکھ کا انگرکھا پہن کر اس پر سفید نین سکھ کا چغہ چوگوشیہ ٹوپی تن زیب کی اَور اس پر سفید صافہ بائیں جانب سے باندھتے۔ سفید جرابیں پہننے کا بہت شوق تھا اس لیے جرابیں ہمیشہ سفید ہی ہوتی تھیں، قدیم وضع کے مطابق گلے میں سفید لٹھے کا رومال بھی باندھتے تھے۔ سردیوں میں پائجامے کو پنڈلیوں پر لپیٹ کر پشمینے کے ساق بند باندھا کرتے تھے۔ اگر زیادہ سردی ہوتی تو کشمیرے کی نیم آستین پہنتے۔ سخت سردیوں میں روئی کا کوٹ بھی پہن لیتے ورنہ نیم آستین پر فرغل پہنتے، سر پر بجائے ململ کے صافے کے سفید یا فاختائی رنگ کا کشمیری صافہ باندھتے، پاؤں میں وہی سفید اُونی جرابیں اَور دیسی جوتا ہوتا۔ کشمیری کام کیا ہوا چغہ بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ (تقریباً بیس) ۲۰ برس تک مجنوں رہے لیکن شاید کسی نے ان کو سوائے اِس لباس کے کسی اَور لباس میں دیکھا ہوگا۔ جب بھی گھر سے باہر نکلتے ہمیشہ اِسی لباس میں نکلتے ہاں دیوانے پن کے زمانے میں جرابیں نہیں پہنتے تھے۔[٦٠]

نماز روزے کے پابند تھے۔ اپنی سالگرہ بڑے شوق سے مناتے تھے۔ آزاد کی شادی ۱۸۵۷ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ ان کی بیوی کا نام آغائی بیگم تھا اَور وہ آزاد کی وفات سے پانچ چھ برس پہلے انتقال کر گئی تھیں۔ آزاد کے ہاں کل سولہ بچے ہوئے جو سب مر گئے صرف آغا محمد ابراہیم اکلوتے زندہ بچے۔ آزاد اِن کو ابرو کہہ کر پکارتے تھے۔ آزاد کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی آزاد

نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ لاہور میں گزارا تھا۔ وہ شروع میں مستی دروازے میں عام سے مکان میں رہتے تھے۔ کچھ دیر بنگلہ ایوب شاہ میں رہے۔ پھر اپنے بنائے ہوئے کتب خانے میں رہے اَور آخری عمر میں اکبری منڈی میں اپنے بیٹے کے گھر میں رہے۔

آزاد کے اپنے حلقہ احباب کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی اور سرسید احمد خاں کے ساتھ بھی بڑے گہرے تعلقات تھے۔ آزاد کے حلقہ احباب میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ شاگردوں کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ مخلص تھے، ان کے ساتھ پیار محبت سے پیش آتے، مشکلات میں اُن کا ساتھ دیتے، جہاں تک ہوسکتا اُن کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے اَور ان کا مستقبل سنوارنے کے لیے ضرورت پڑنے پر تگ و دو بھی کرتے تھے۔ ہر شخص سے آزاد ہمدردی رکھتے تھے۔ آزاد کو اپنے طالب علموں سے بہت محبت تھی۔ جہاں کہیں رہنے کے لیے گھر لیتے وہاں پر سب سے پہلے اپنے طالب علموں کا خیال کرتے کہ اُن کے پڑھنے لکھنے کے لیے اِس گھر میں جگہ ہَے پھر گھر لیتے۔ مستحق طالب علموں کو نوازتے اَور اِس میں یہ تمیز نہ کرتے کہ یہ ہندو ہَے یا مسلمان ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھتے۔ جب گھوڑے پر سوار ہوکر آزاد کالج جاتے تو اِن کے دائیں بائیں طالب علم چلتے تھے اَور اِن کے ساتھ علمی باتیں کرتے جاتے۔ طالب علم آپ سے ہر طرح کا سوال کرتے اَور مولانا ہر ایک کو اُس کے سوال کا جواب دیتے۔ آزاد اپنے قابل شاگردوں کے کمالات کا بھی اعتراف کرتے تھے۔ آزاد کے تلامذہ میں سید ناصر نذیر فراق دہلوی اَور مولوی سید ممتاز علی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آزاد بحیثیت اِنسان شگفتہ مزاج اَور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی اَور اپنے گھر بار کو اُجڑتے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا لیکن اِس کے باوجود وہ خوش دل اَور خوش مزاج اِنسان تھے۔ خوش دلی اَور خوش مزاجی اِن کی طبیعت کی نمایاں خوبی تھی۔ وہ زمانے کے غم کو ہنس کر ٹالنا چاہتے تھے لیکن تقدیر اِن کا ساتھ نہ دے سکی۔ آخر کارِ غمِ روزگار نے اِن کے دل و دماغ پر تسلط کرلیا۔ آزاد ہر کہیں اپنی اِن خصوصیات کی وجہ سے نمایاں ہَیں خواہ دوست و احباب میں ہوں۔ جلسوں، انجمنوں یا اپنے طالب علموں میں، شخصیت کی یہ جھلک اِن کی جا بجا تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہَے۔ آزاد کی شخصیت کی دوسری خوبی انکساری اَور عاجزی

ہے۔آزاد ہر کسی سے جھک کر ملتے تھے۔منتقم مزاج بالکل نہیں تھے۔عفو و درگزر سے کام لیتے۔ وہ نقصان برداشت کر لیتے لیکن دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ دشمن کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے بلکہ معاف کر دیتے۔ اعلیٰ ظرف اِنسان تھے۔ کتابوں سے عشق کرتے تھے۔ تحریروں میں حُسن ظاہری کے بہت قائل تھے۔خوش نویسی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اَور تحریروں کو حسین بنانے کے لیے مختلف رنگوں کی روشنائیاں اَور پنسلیں استعمال کرتے تھے۔ اِن کی تحریر کی سطریں سیدھی ، حرف واضح ، روشن ہوتے اَور عبارت گنجلک کے عیب سے پاک ہوتی تھی۔ آغا محمد باقر اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''وہ اپنی تحریروں کو اِس طرح دیکھتے تھے جس طرح ایک کامیاب مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھتا ہے اَور جہاں کوئی سقم پاتا ہے موقلم سے اُسے درست کر دیتا ہے''۔[۶۱]

آغا محمد باقر، آزاد کے کھانے کی عادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

مولانا سرِ شام کھانا کھا لیتے اَور دیر تک ٹہلتے رہتے۔ کھانوں میں پلاؤ، کباب اَور تخمجن بہت مرغوب تھا۔سفر میں عموماً کباب اَور نان کھاتے تھے۔ پھلوں میں انگور، سردہ ، آم اور سیب زیادہ پسند تھے۔ جب بیدانے کا موسم آتا تو روزانہ صبح دِل بھر کر بیدانہ کھاتے۔ کھانے کے ساتھ دہی کا ہونا لازم تھا۔ شب برات آتی تو ہمیشہ کہتے کہ میری فاتحہ شب برات کی شام کو پلاؤ پر دیا کرنا۔[۶۲]

یوں تو آزاد نے زندگی کی بہاریں بھی لوٹیں اَور غموں کے پہاڑ بھی برداشت کیے۔لیکن بحیثیت مجموعی آزاد کی زندگی میں غموں کا پلہ بھاری رہا۔کم و بیش زندگی کے بیس (۲۰) سال عالم وارفتگی میں بسر ہو گئے اَور آخر کار اِسی وارفتگی میں اِس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

توقیت محمد حسین آزاد

☆ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء بمطابق ۱۸ ذالحجہ ۱۲۴۵ھ مولانا محمد حسین آزاد پیدا ہوئے۔[۶۳]

☆ (۱۸۳۴ء میں والدہ امانی بیگم کی وفات) دہلی میں۔[۶۴]

☆ ۱۸۳۶ء آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا اُردو اخبار'' دہلی اخبار'' ہفتہ وار نکالا۔ اور یہ ہندوستان کا دوسرا اخبار تھا۔[۶۵]

☆ ۱۸۴۰ء'' دہلی اخبار'' کی بجائے'' دہلی اُردو اخبار'' نام رکھا گیا۔[۶۶]

☆ ۱۸۴۵ء مولانا آزاد نے مکتبی تعلیم سے فارغ ہوکر دہلی کالج میں داخلہ لیا۔

☆ ۱۸۴۸ء مولوی باقر کا نام پہلی بار دہلی اُردو اخبار میں مہتمم کی حیثیت سے آیا۔[۶۷]

☆ یکم مارچ ۱۸۴۸ء آزاد کا چھ روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا

☆ ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۳ء آزاد تعلیم حاصل کرنے کے دوران'' دہلی اُردو اخبار'' کے پرنٹر اور پبلشر بن گئے۔ اور ۱۸۵۷ء تک آزاد اِس فرض کو نبھاتے رہے۔[۶۸]

☆ ۱۸۵۴ء میں آزاد نے دہلی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی۔

☆ ۱۸۵۴ء اُستاد ذوق وفات پا گئے۔[۶۹]

☆ ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو آزاد کی سب سے قدیم نظم'' تاریخ انقلاب عبرت افزا'' کے عنوان سے شائع ہوئی'' دہلی اُردو اخبار میں''۔[۷۰]

☆ ۱۸۵۷ء جنگ آزادی آپ کے والد مولوی محمد باقر کو بغاوت کے الزام میں شہید کر دیا گیا۔[۷۱]

☆ ۵۸۔۱۸۵۷ء امن و عافیت کی تلاش میں لکھنو ، مدراس، جالندھر وغیرہ شہروں کا سفر کیا

☆ ۹ فروری سے ۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء تک ریاست جنید کے راجہ سروپ سنگھ کی ملازمت بہ صیغہ محافظ دفتری فوجداری کی۔

☆ نومبر ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۰ء تک ارسطو جاہ مولوی رجب علی کے اخبار ''مجمع البحرین'' میں بحثیت پرنٹر پبلشر فرائض انجام دیتے رہے۔[۴۲]

☆ ۶۱۔۱۸۶۰ء میں سیالکوٹ اور کشمیر گئے

☆ ۱۸۶۱ء میں محکمہ جنرل پوسٹ ماسٹر میں بغیر تنخواہ کے سر رشتہ داری۔[۴۳]

☆ گیارہ جولائی ۱۸۶۱ء کو باقاعدہ طور پر بمشاہرہ ۳۰ تیس روپے ماہوار پر ڈیڈ لیٹر آفس میں ملازم ہوگئے۔جس کی منظوری ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء سے ہوئی۔[۴۴]

☆ دسمبر ۱۸۶۲ء میں ملتان لائن پر بحثیت اوورسیئر تبدیل کر دیا گیا۔جس پر آزاد نے استعفیٰ دے دیا۔اور لاہور ہی میں رہنا پسند کیا۔

☆ ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب نے انھیں ڈائریکٹر تعلیمات کپتان فلر کے نام تعارفی خط لکھ کر دیا۔[۴۵]

☆ ۱۸۶۳ء آغا محمد ابراہیم (ان کے بیٹے) پیدا ہوئے

☆ ۱۸۶۴ء میں آزاد کو محکمہ تعلیم میں معمولی سی ملازمت مل گئی۔[۴۶]

☆ ۱۸۶۴ء میں عربک گرامر تصنیف کی۔

☆ ۱۸۶۴ء میں ''نصیحت کا کرن پھول'' کی تصنیف مکمل ہوئی ۔[۷۷]

☆ ۱۸۶۴ء گورنمنٹ کالج لاہور کا قیام عمل میں آیا

☆ ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء ''انجمن مطالب مفیدہ پنجاب'' کی بنیاد رکھی گئی ۔[۷۸]

☆ ۱۱ فروری ۱۸۶۵ء انجمن نے اپنا رسالہ ''مطالب مفیدہ'' اشاعت کے لیے جاری کیا تو آزاد اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔

☆ ۱۱ فروری ۱۸۶۵ء کے جلسہ عام میں آزاد نے اپنا پہلا مضمون ''درباب رفع افلاس'' پڑھا

☆ ۱۸۶۵ء میں آزاد تین آدمیوں کے ساتھ (پنڈت من پھول ۔منشی فیض بخش پشاوری ، اور کرم چند نند رام) انگریزی حکومت کے ایماء پر وسط ایشاء کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے بخارا روانہ ہوگئے ۔[۷۹]

☆ مارچ ۱۸۶۷ء میں آزاد انجمن پنجاب کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور لیکچر دینا شروع کر دیئے ۔[۸۰]

☆ ۲۴ جون ۱۸۶۸ء تک آزاد لیکچر دیتے رہے ۔

☆ ۱۸۶۷ء میں آزاد کو حسن خدمات کے صلے میں ایک Trinket عطا ہوا ۔[۸۱]

☆ جون ۱۸۶۸ء میں ناظم تعلیمات نے آزاد کو مری بلا لیا ۔

☆ ۱۸۶۸ء میں درسی کتب کی ترتیب اور محکمہ تعلیم کے دوسرے کاموں کے لیے مسٹر پیرسن کی معاونت پر مامور ہو گئے ۔[۸۲]

☆ ۱۸۶۸ء میں ہنری کیلری اور ایک دوسرے انگریز کو اُردو فارسی پڑھائی

☆ ۱۸۶۸ء اُردو اور فارسی کی ریڈریں تیار کیں۔

☆ ۱۸۶۸ء ''قصص ہند'' حصہ دوم مرتب کی

☆ ۱۸۶۸ء فارسی قواعد مرتب کی

☆ ۱۸۶۹ء آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں پچھتر (۷۵) روپے ماہوار پر عربی کے عارضی اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔[۸۳]

☆ ۱۸۷۰ء عربی کے ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپے ماہوار پر مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر بن گئے۔[۸۴]

☆ ۱۸ مئی ۱۸۶۹ء کو آزاد نے ایک سپاس نامہ ڈاکٹر لائٹنر کی خدمت میں پیش کیا۔

☆ ۱۰ نومبر ۱۸۶۹ء فارسی قواعد مرتب کرنے پر مبلغ دو سو روپے بطور انعام عطا ہوئے۔

☆ ۱۸۶۹ء دُختر کشی'' پر مقالہ لکھنے کے سلسلے میں آزاد دوسرے نمبر پر آئے۔ اور دو سو روپے انعام مِلا۔

☆ ۱۸۷۰ء ''ہمائے پنجاب'' اخبار کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

☆ ۱۸ فروری ۱۸۷۱ء'' ہمائے پنجاب'' اخبار سے مستعفی ہو گئے۔

☆ ۱۸۷۲۔۱۸۷۴ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں گیارہ لیکچر دیئے۔ جو سخن دان فارس کے دوسرے حصے میں ہیں۔

☆ ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء نئی نظم کے مشاعرے کا ڈول ڈالا۔[۸۵]

☆ ۱۸۷۵۔۷۶ء نیرنگِ خیال اور آب حیات کے متفرق اجزاء ''انجمن مفید عام'' قصور کے رسالے میں شائع کرنے شروع کر دیئے۔

☆ ۱۸۷۵۔۷۶ء آزاد کے بیٹے محمد باقر اور خلیفہ محمد اکبر نے وفات پائی۔

☆ ۱۸۷۶ء سخن دان فارس کا پہلا حصہ کتابی صورت میں شائع ہوا

☆ ۱۸۸۰ء آب حیات اور نیرنگِ خیال حصہ اوّل کتابی صورت میں شائع ہو گئیں۔

☆ ۴ جون ۱۸۸۴ء آزاد پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رُکن بنے۔

☆ ۱۸۸۴ء بیرون دہلی دروازہ لاہور کتب خانہ آزاد تعمیر کروایا۔

☆ ۱۸۸۴ء اورنیٹل کالج گورنمنٹ کالج سے علیحدہ ہو گیا۔

☆ اکتوبر ۱۸۸۴ء پنجاب یونیورسٹی (اورنٹیل کالج) سے منسلک ہو گئے۔

☆ ۱۸۸۴ء کے آخر یا ۱۸۸۵ء کے شروع میں آزاد کی چہیتی بیٹی امۃ السکینہ کا انتقال

☆ ۱۸۸۵ء میں ذہنی توازن کا بگڑنا

☆ ۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء کو آزاد اپنے آباؤ اجداد کے وطن ایران کی سیر کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆ ۱۴ فروری ۱۸۸۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر آزاد کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔

☆ ۱۸۸۷ء دیوان ذوق کی ترتیب شروع کر دی۔

☆ ۱۸۸۷ء متصل درگاہ شاہ محمد غوث بیرون دہلی دروازہ کتب خانہ آزاد کی تعمیر۔

☆ ۱۸۸۹ء لاہور سے پٹیالہ، دہلی اور علی گڑھ تک کا پیدل سفر کیا۔

☆ ۵ جون ۱۸۹۰ء آغا محمد ابراہیم ابرو نے آزاد کی پنشن کی تگ و دو شروع کر دی۔

☆ ۳۰ مئی ۱۸۹۰ء آزاد کو عدالتی حکم کے تحت دیوانہ قرار دیا گیا۔

☆ ۱۸۹۱ء دیوانِ ذوق کی اشاعت

☆ ۶ جنوری ۱۸۹۲ء ڈائریکٹر تعلیم عامہ پنجاب کے نام پنشن کی درخواست بھیجی گئی۔

☆ ۳۰ اگست ۱۸۹۲ء آزاد کو پہلے ۵۰ پچاس روپے ماہوار اور پھر لیفٹیننٹ گورنر کی خصوصی سفارش پر پچھتر (۷۵) روپے ماہوار پنشن کا حق دار ٹھہرایا گیا۔

☆ ۱۸۹۷ء نظم آزاد کی اولین اشاعت۔ زیر اہتمام آغا محمد ابراہیم

☆ ۱۸۹۷ء دربار اکبری کی اولین اشاعت۔ زیر اہتمام میر ممتاز علی

☆ ۱۹۰۱ء اندرون اکبری منڈی لاہور میں آزاد منزل کی تعمیر۔

☆ ۱۹۰۹ء بواسیر کا عارضہ شدت اختیار کر گیا۔

☆ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو لاہور میں وفات پائی اور گامے شاہ لاہور (کربلا) میں دفن ہوئے۔[۸۶]

آزاد کی ادبی خدمات

آزاد کو علم کی اشاعت کا ذوق بچپن ہی سے تھا کیونکہ یہ شوق اِن کا خاندانی ورثہ تھا۔ اُن کے دادا مولوی محمد اکبر عالم دین تھے اور مکتب میں درس دیا کرتے تھے۔ آزاد نے بھی ابتدائی درسی کتابیں اپنے دادا ہی سے پڑھیں۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر شمالی ہند کے اولین اخبار نویس تھے۔ مولوی محمد باقر بھی عالم اور مجتہد تھے۔ مولوی محمد باقر دہلی کالج میں تدریس کے فرائض پر مامور تھے۔ اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوق ان کے والد کے ہم درس اور عزیز دوست تھے ان کے والد دہلی اُردو اخبار پریس کے مالک تھے چونکہ آزاد کے دادا اور والد دونوں درس و تدریس سے وابستہ رہ چکے تھے اس طرح آزاد کے گھر کی فضا علمی اور ادبی تھی۔ مولانا آزاد نے بھی اسی علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ ذرا بڑے ہوئے تو اُستاد ذوق کی شاگردی میں آ گئے۔ اُستاد ذوق بھی اِن کے ساتھ بڑی نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ آزاد دہلی کالج میں زیر تعلیم رہے۔ کالج میں انھیں دو مرتبہ بہترین مضمون لکھنے پر انعامات ملے۔ ایک دفعہ ایک انگریز ممتحن ڈاکٹر مویٹ نے آزاد سے پوچھا کہ تم تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا کرو گے تو آزاد نے جواب دیا ''میں تحصیل علم کروں گا اور جو خیالات ہیں اور ہوں گے اُنھیں اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔'' اِس جواب سے آزاد کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اشاعتِ علم کی اُنھیں کتنی لگن تھی اس کا ذکر محمد حسین آزاد نے یوں کیا ہے:

> مجھے یاد ہے اور میرے ہمدرس بھائیوں کو یاد ہوگا کہ جب دہلی کالج مرحوم زندہ تھا اور میری تحصیل اس کے دامن تربیت میں پرورش پا رہی تھی تو ڈاکٹر مویٹ صاحب کمشنر مدارس کلکتہ سے تشریف لائے۔ جب کالج میں آئے، تو میری جماعت کا بھی جزوی سا امتحان لیا اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ تم مدرسہ سے نکل کر کیا کرو گے۔ ایک ایک نے اپنا خیال بیان کیا۔ اے میرے پیارے اہل وطن تمھارے آزاد کی زبان سے اس وقت بھی یہی لفظ نکلا کہ تحصیل علوم کروں گا اور جو کچھ خیالات ہیں اور ہوں گے، انہیں اپنے اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔[۸۷]

مولانا آزاد طالب علمی کے زمانے ہی سے اخبار کے پرنٹر اور پبلشر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اُردو اخبار پریس کی دیکھ بھال ان کے ذمہ تھی۔ اِس طرح مولانا آزاد زمانہ طالب علمی ہی سے اخبار نویس کی حیثیت سے علمی اشاعت میں مصروف ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی وہ اپنی بے سرو سامانی اور پریشانی کے باوجود مختلف علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ طلبہ کے لیے کتابیں مرتب کرتے رہے۔ انجمن اشاعت علوم مفیدہ قائم ہوئی تو اِس میں بڑھ چڑھ کر کام کرتے رہے۔ مضامین لکھ کر انجمن کے جلسوں میں پڑھتے اور لیکچر دیتے۔ انجمن کے اخباروں کو مرتب کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو اُردو پڑھاتے۔ ان کے انہی کاموں کی وجہ سے لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں میں اِن کی حیثیت استوار ہوگئی۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر لائٹر کو بھی آزاد نے اُردو پڑھائی۔ ڈاکٹر لائٹر آزاد کی علمی لیاقتوں سے بہُت متاثر ہوئے اور اُنہوں نے آزاد کو ایک صداقت نامہ دیا، جو مولانا آزاد کی صلاحیتوں اور اِن کے علمی و ادبی ذوق و شوق کا اعتراف نامہ ہے۔

صداقت نامہ درج ذیل ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور

۲۸ اپریل ۱۸۶۵ء

مولوی محمد حسین گزشتہ پانچ مہینے سے میرے اُردو منشی ہیں۔ میں ان کے کردار اور علم کا حد سے زیادہ معترف ہوں۔ وہ ہر اس تحریک کو اپنے وقت اور وسیع معلومات سے امداد دینے پر مستعد رہتے ہیں جس کا مقصد قوم کی اصلاح ہو۔ انجمن اشاعتِ علوم مفیدہ میں میری صدارت میں انہوں نے جو مقالہ پڑھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے موضوع پر کتنی قدرت حاصل ہے اور ان کی تنقیدی صلاحیت کسی یورپین عالم سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مولوی انتہائی علمی انسان ہیں۔ مختلف موضوعات پر مختلف لوگوں کی فراہم کی ہوئی معلومات میں ہمیشہ میں نے ان کی اطلاعوں کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد

پایا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ گورنمنٹ کی توجہ اب تک ایسے پر جوش اور ذہین آدمی کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوئی۔

جی۔ ڈبلیو لائٹز
ایم ۔اے پی ایچ ۔ڈی
آنریری فیلو کنگز کالج لندن۔[۸۸]

اس صداقت نامے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد کو علمی اور ادبی کاموں سے کس قدر دلچسپی تھی۔ مولانا آزاد نے محکمہ تعلیمات میں بھی خدمات انجام دیں۔ اُردو اور فارسی کی درسی کتابیں اور قصصِ ہند حصہ دوم بھی مرتب کی۔ علاوہ ازیں انگریز انسپکٹر پیرسن کی علمی معاونت بھی کی۔ انہی دنوں آزاد نے تعلیم نسواں کے موضوع پر 'کرن پھول' نامی کتاب لکھی جو تعلیمی سے زیادہ ادبی اہمیت کی حامل تھی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹز کے تعلقات جن دنوں آزاد کے ساتھ بہت اچھے تھے اُن دنوں مولانا محمد حسین آزاد نے ڈاکٹر لائٹز کی کتاب ''سنین الاسلام'' لکھنے میں معاونت کی۔ڈاکٹر لائٹز نے مولویوں کے استفادے کے لیے ایک کتاب سنین الاسلام مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر لائٹز کا مقصد ملک کے علماء پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اِن کے دینی مقدس مقامات اور ادبیات کی تاریخ انسانی واقعات اور فکر کی عالمی تاریخ کے ایک جزو کی حیثیت رکھتی ہے اور ادبیات عرب ،تفسیر ، اصول فقہ ، قصائد وقواعد کے علاوہ ریاضیات ، تاریخ ، طب وغیرہ کی بے شمار اعلیٰ تصانیف پر بھی مشتمل ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں مرتب کی گئی تھی۔ اِس کتاب کے پہلے حصے میں سن وار تاریخ اسلام اور ادبیات عرب کا بیان ہے اور کتاب کا یہ پہلا حصہ ڈاکٹر لائٹز اور مولانا آزاد دونوں کی مشترکہ کوششوں سے مرتب ہوا۔لیکن حصہ دوم کی ترتیب میں ڈاکٹر لائٹز مولانا آزاد سے ناراض ہوگئے ۔مولانا آزاد بدستور گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے رہے۔ وہ ایک محنتی ، لائق اور شفیق استاد

تھے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں حلقوں میں مقبول تھے۔طالب علموں سے بلا لحاظ مذہب و ملت مساوی سلوک کرتے تھے۔اپنے طالب علموں کے مسائل حل کرتے ، نادار طلبہ کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ فارغ التحصیل طلبہ کے لئے حصول روزگار کی کوشش بھی کرتے تھے۔

مولانا آزاد کی ادبی شخصیت کا ایک اور پہلو جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہے اُن کی ادبی ڈرامہ نگاری۔آزاد نے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کی فرمائش پر شیکسپئر کے ڈرامہ میکبتھ کا اُردو ترجمہ شروع کیا لیکن اس میں اُن کا دل نہ لگا۔ اُنھوں نے ترجمہ کی بجائے خود ایک طبع زاد ڈرامہ لکھنا شروع کر دیا جس کا نام ''ڈرامہ اکبر'' ہے۔عالم وارفتگی کی وجہ سے آزاد اس ڈرامے کو مکمل نہ کر پائے اور اس کے صرف دو ایکٹ اور ایک خاکہ لکھ پائے۔ آزاد کے بعد ان کے شاگرد ناصر نذیر فراق نے اس ڈرامے کو مکمل کیا۔آزاد کا یہ نامکمل ڈرامہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈراما اکبر سے اُردو میں ادبی ڈرامے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔اس طرح مولانا آزاد نے بڑے وقیع علمی اور ادبی کارنامے انجام دیے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا محمد حسین آزاد نے جدید اُردو شاعری کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۷۴ء میں ناظم تعلیمات ہالرائیڈ کی سرپرستی میں نظم اُردو کے مشاعروں کا آغاز کیا۔یہ مشاعرے تقریباً ایک سال تک ہوتے رہے۔اِن مشاعروں کی وجہ سے اُردو شاعری میں نئی طرزِ احساس اور ایک نئی صنف (نظم) کا آغاز ہوا۔ لاہور کی ادبی فضا اِن مشاعروں سے یکسر بدل گئی اور اس کے خوشگوار اثرات پورے ملک پر ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے بھی اِن مشاعروں کو سراہا اور تہذیب الاخلاق میں ان مشاعروں کی افادیت اور اثرات کے متعلق ایک مضمون شائع کیا۔ اس مضمون میں سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> مولوی محمد حسین آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اس مشاعرے کی بقا اور قیام کے سلسلے میں سب سے زیادہ ہمت صرف کی ہے۔ ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکت الفاظ اور طرزِ ادا سے ہم لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔[۸۹]

اگرچہ اِن مشاعروں کی وجہ سے آزاد کوتنقید کا نشانہ بننا پڑا اور مخالفت کے ایک شدید طوفان کا بھی سامنا کرنا پڑا۔لیکن اِس مخالفت اور تنقید کے باوجود آزاد کا نام جدید اُردو شاعری کے بانیوں میں ہمیشہ کے لئے امر ہوگیا۔حقیقت یہ ہے کہ جدید اُردو شاعری کا ذکر آزاد کے نام کے بغیر اُدھورا اور نامکمل رہتا ہے۔

اِس طرح آزاد کی ادبی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔آزاد اُردو کے اولین محقق، ادبی مورخ، نقاد، لسانی مفکر، پروفیسر تعلیمی مصنف اور جدید اُردو شاعری کے معمار اوّل ہیں۔غرضیکہ آزاد کی ادبی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینہ ہَے اس کا جو پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہَے وہ اپنی تابناکی سے نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔اس نگینے کی تراش خراش، رنگ ، روپ سب اہم ہیں لیکن انشا پردازی کا پہلو آزاد کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ہَے۔آزاد اُردو ادب کے عظیم انشاپرداز ہیں۔آزاد نے اپنے بعد میں آنے والے ادیبوں کو کافی حد تک متاثر کیا۔ہر بڑا ادیب اور انشاپرداز اپنے رنگ کا موجد بھی ہوتا ہے اور خاتم بھی۔ دوسرے اِن کی تقلید کرنا بھی چاہتے ہیں لیکن کرنہیں سکتے۔ غالب جیسے بڑے ادیب کے انداز کو بہت سوں نے اپنانے کی کوشش کی لیکن کوئی غالب نہ بن سکا۔ اِسی طرح آزاد کی اِنشاپردازی کے رنگ و انداز سے متاثر ہوکر بہُت ساروں نے آزاد کارنگ و انداز اپنانے کی کوشش کی۔لیکن کوئی آزاد کے پایے کو نہ پہنچ سکا۔ اُردو نثر پر آزاد کی انشاپردازی کا رنگ بہُت گہرا واضح اور نمایاں ہے۔ اُردو ادب کے معروف نقاد اور ادبی مبصر میر مہدی افادی ، آزاد کو اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد مذہب کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ ہی چل سکتے ہیں لیکن آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔[۹۰]

آزاد اُردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کا اُسلوب اردو زبان میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔آزاد کی نثر میں جو رعنائی اور دلربائی ہے وہ کسی اور کی نثر میں نہیں۔آزاد کی توجہ خیال کی وضاحت سے زیادہ زبان کی لطافت پر ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ آزاد ایک ایسے انشا پرداز ہیں کہ صدیوں بعد ایسا یکتا و یگانہ ادیب پیدا ہوتا ہے۔آزاد نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ اُردو نثر کا پر تکلف دور تھا۔ مقفیٰ اور مسجع نثر تھی۔ میر امن اگرچہ باغ و بہار لکھ چکے تھے لیکن اہل علم مشکل اور بناوٹی نثر کو پسند کرتے تھے۔ ظہوری اور بیدل کی تقلید کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔آزاد ایک تو اس رجحان سے متاثر ہوئے اور دوسری طرف وہ دہلی اُردو اخبار کی سادگی اور دلی کالج کی سادہ اور سلیس نثر سے بھی بہت مرعوب تھے ۔

آزاد صرف نام ہی کے آزاد نہیں تھے ، روایات کی پابندی اور لکیر کی فقیری ان کی طبیعت پر ناگوار گزرتی تھی۔ وہ جدت پسند تھے اس لیے انہوں نے نہ تو وہ پر تکلف طرز تحریر اپنایا اور نہ ہی دلی کالج کی سادہ اور سلیس نثر پر اکتفا کیا۔نثر نگاری کے میدان میں آزاد لکیر کے فقیر بننے کی بجائے اپنے لیے نئی راہ کی تلاش میں تھے۔ آزاد سرسید احمد خان کی تحریک سے بھی متاثر تھے ۔ گورنمنٹ کالج میں پڑھانے کی وجہ سے آزاد کے انگریز پرنسپل اور پروفیسروں کے ساتھ بھی رابطے تھے۔ اس طرح آزاد کو انگریزی ادب سے بھی شناسائی کا موقع مل گیا۔اس سے آزاد کا وہ ذہن جو نئی نئی راہوں کا متلاشی تھا اس کے کئی دریچے کھل گئے آزاد کا خیال تھا کہ اب فرضی افسانوں ، کہانیوں کا زمانہ نہیں ، طوطے مینا کی کہانی اور چہار درویش کی سیر کے زمانے سے آگے نکلنا چاہیے اور اس زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ انگریزی کے چراغ سے چراغ روشن ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے پرتکلف انداز تحریر اور سادہ طرز تحریر کے ملاپ کے حسین امتزاج سے ایک نئی راہ نکالی اور یہ رنگ ان کی تمام تصنیفات میں نظر آتا ہے۔

مولانا آزاد کی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے اس کی اہم ترین ادبی تصانیف میں آب حیات، نیرنگ خیال، سخن دان فارس، نگارستان فارس، دربارِ اکبری، ڈراما اکبر، نظم آزاد اور خم کدہ آزاد شامل ہیں۔ آزاد کی درسی تصانیف میں نصیحت کا کرن پھول، ''قصص ہند، فارسی کی پہلی کتاب، اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب، قواعد اُردو، قواعد فارسی، جامع القواعد، تذکرہ علماء، کائنات عرب، حکایات آزاد، قندِ پارسی، آموز گار پارسی اور لغت آزاد شامل ہیں۔ دیوان ذوق کی تدوین بھی ان کا اہم کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔

آزاد کی متفرق تصانیف بیاضِ آزاد، سیرِ ایران اور مکتوبات آزاد ہیں۔آزاد کی غیر مطبوعہ تصانیف میں تاریخی مقامات، ترکی قواعد، عربی قواعد، قواعد اُردو اور قواعد فارسی شامل ہیں۔ دیوانگی کے زمانے میں آزاد نے سپارک ونماک، مکاشفات آزاد، فلسفہ الٰہیات اور جانورستان تصنیف کیں۔ ان سمیت کم وبیش ۸۹ مسودے لکھے۔ اُردو ادب تو کیا، عالمی ادب میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ادیب نے عالم وارفتگی میں بھی اتنی صحت و درستی سے زبان لکھی ہو۔ ان کے تمام مسودے انتہائی خوش خط ہیں۔جن سے آزاد کی نفیس طبیعت کی عکاسی ہوتی ہے۔

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی:

> آزاد اُردو نثر کے میر انیس ہیں۔ ان کی بے ساختگی اور مصوری میر انیس کے اُسلوب سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔آزاد کی طرح انیس کی بے ساختگی بھی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ دونوں زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں۔ دونوں ڈرامائی شعور کے حامل ہیں۔ دونوں کے ادراک پر تخیل کا غلبہ ہے۔ دونوں کی مصوری بے عیب ہے۔دونوں لفظی مناسبتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارہ میں دونوں کا کمال ایک جیسا ہے اور دونوں ذہن کو سوچنے کا موقع نہیں دیتے۔ دونوں کے یہاں خیال انگیزی، تجریدیت اور عمیق معنویت کا فقدان ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ انیس نظم کے شاعر ہیں اور آزاد نثر کے۔آزاد

کی نثر اُردو کا لازوال تہذیبی سرمایہ ہے ، اور وہ خود اُردو ئے معلٰی کے ہیرو اور آقائے اُردو ہیں۔"[91]

آب حیات میں ان کا قلم ایک رنگین بیان محقق اور نقاد کا ہے۔ نیرنگِ خیال میں ایک چابکدست مترجم کا ، جسے مصوری سے عشق ہو ،سخن دان فارس میں ایک صاحب علم وفضل سیاح، قصص ہند میں ایک ایسے داستان گو کا جسے متحرک تصاویر بنانے میں بھی ملکہ کمال حاصل ہو۔ دربارِ اکبری میں ایک ایسے مورخ کا جسے زمانہ سلف کے شاہی درباروں کے آداب، لباسوں کی وضع قطع، جنگی ہتھیاروں اور جنگ کے اندازوں سے پوری پوری واقفیت ہو اور درسی کتب میں ایک ایسے شیریں زبان معلم کا ، جو ننھے منے بچوں کے ساتھ نہایت دلآویز لہجے میں باتیں کرتا ہولیکن جو چیز ہمیں حیران کرتی ہَے وہ یہ ہَے کہ اتنی متنوع تصنیفات میں سطح اور موضوع کےفرق کے باوجود آزاد کی نثر نگاری کا اُسلوب خاص صاف صاف نظر آتا ہے۔اپنی ہرتصنیف میں آزادنثر میں شاعری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی مادری زبان فارسی تھی۔اس لیے فارسی استعاروں اورتشبیہات کا استعمال ان کے ہاں جا بجا ملتا ہے۔تشبیہات و استعارات کی یہ کثرت استعمال قاری کے ذہن پربوجھ نہیں بنتی بلکہ پڑھنے والا زبان کا چٹخارہ محسوس کرتا ہَے اور چاہتا ہَے کہ عبارت کو بار بار پڑھے۔اگرشمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے کارناموں کی اور ادبی خدمات کی نوعیت بیان کرنی ہواور جن علمی شعبوں میں انہوں نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں ان کا ذکر کرنا ہوتو محض تین الفاظ ہی کافی ہیں۔ تاریخ، لسانیات، اورتحقیق۔سخن دان فارس، نیرنگ خیال اورقصص ہند سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہَے۔آزاد کی ہرحیثیت مسلم ہے۔ اور اُردو ادب میں آزاد کا مقام و مرتبہ لازوال ہے۔ ہماری اردو زبان کو بنانے اور سنوارنے میں مولوی محمد حسین آزاد نے ایسی خدمات انجام دی ہیں کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آب حیات تحقیق وتنقید کا ایک مرقع ہَے جس میں انہوں نے شعراء کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہَے اور ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہَے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ، قدم قدم پر تشبیہات اور استعارے ایسے دلآویز اور دلکشن انداز بیان میں پیش کیے ہیں کہ قاری مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''آب حیات'' کی تحقیقی حیثیت پر بہت زیادہ باتیں بھی ہوئیں ، یہ باتیں بے معنی بھی نہیں تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آزاد زبان و بیان کے چٹخارے پر بعض اوقات تاریخی حقائق کو بھی قربان کر دیتے تھے۔ انہیں کسی قدر داستان طرازی کا بھی لپکا تھا لیکن آب حیات میں جو باتیں درست نہیں دکھائی دیتیں ان کی وجہ یہ ہے کہ آزاد کے پاس قطعی مستند مواد کے فراہم کرنے کے لیے ضروری وسائل اور ذرائع کا فقدان تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور ذاتی تلاش سے کام لیا ہے۔ جو دوسروں سے سُنا ہے وہ من وعن بیان نہیں کر دیا بلکہ غور وخوض کے بعد لکھا ہے۔ تجسّس اِن کی فطرت میں رچا بسا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نے تذکروں اور روایتوں کے علاوہ اپنے دوستوں کی تحقیق سے بھی بھر پور فائدہ اُٹھایا ہے۔آزاد اپنی تحقیق میں بہُت محتاط تھے۔ آزاد کی تحقیق کی وجہ سے ہمیں کئی نئی نئی باتیں ایسی ملی ہیں۔ کہ اگر آزاد اِن پر روشنی نہ ڈالتے تو ہم اِن باتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتے۔ تاریخ اور تحقیق کے بعض نقائص کے باوجود ''آب حیات'' کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ سچی اور حقی بات یہ ہے کہ ''آب حیات'' کا مطالعہ کیے بغیر کوئی بھی طالب علم اردو ادب سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

آج تک کسی نے آزاد جیسی مرصع اور رنگین نثر نہیں لکھی۔ '' نیرنگِ خیال '' میں تخیلاتی مضامین کو اپنے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب آزاد کی فکری وتخلیقی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کا اُسلوب اور اندازِ تحریر اتنا پُر اثر اور دلفریب ہے کہ ہر لفظ دل میں اُترتا محسوس ہوتا ہے۔ نیرنگِ خیال کی نیرنگیوں ہی کی وجہ سے مولانا آزاد ایک عظیم نثر نگار اور انشاپرداز کی حیثیت سے زندہ ہیں۔اسی طرح آزاد کی دیگر تصانیف ہیں۔اردو ادب کی تاریخ میں ادب کا کوئی بھی ایسا میدان نہیں جہاں پر آزاد نے قسمت آزمائی نہ کی ہو۔ پھر قسمت نے بھی ایسی یاوری کی کہ ہر میدان میں پانسا بھاری رہا اور آزاد ہر میدان میں اپنے ادبی نقوش ثبت کرتے چلے گئے۔ انہیں تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا ، ان کی تصنیفات پر اعتراضات بھی ہوئے ، کسی حد تک یہ تنقید اور اعتراضات درست بھی ہیں لیکن مولانا آزاد اس میدان میں قدم رکھنے والوں کے لیے راہ ہموار اور آسانیاں پیدا کر گئے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد نے اُردو ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔

آزاد کا اُسلوبِ نثر

آزاد کی نثر میں جو رعنائی اور دلربائی ہے، وہ کسی اور کی نثر میں نہیں ہے۔ وہ انشا پرداز پہلے ہیں اور نقاد، مورخ اور محقق بعد میں۔آزاد کی توجہ خیال کی وضاحت سے زیادہ زبان کی لطافت پر ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔یہ بات مسلم ہے کہ آزاد ایک ایسے اُسلوب کے مالک ہیں جس کا کوئی نمونہ ان سے پہلے نہیں ملتا اور کوئی نمونہ ان کے بعد ان کی تقلید میں بھی نہیں ملتا۔آزاد ایک ایسے انشا پرداز ہیں جن کی انفرادیت مسلم ہے۔ آزاد کے اُسلوب میں لہجے کا ترنم، تخیل کی نزاکت، زبان کی لطافت اور ذوق و شوق کا جو نکھار ہے وہ صدیوں کے تہذیبی عمل اور ردِعمل کی وجہ سے نمودار ہوا ہے۔یہ اُسلوب ایک قوم کی تہذیبی بہار کا پتہ دیتا ہے۔ دراصل اُسلوب نام ہے، کسی بات کو بلیغ انداز میں پیش کرنے کا۔ بلیغ کا مطلب یہ ہے کہ ان سارے وسائل کو پوری طرح استعمال کیا جائے جن سے کوئی زبان اور بات حسین اور مؤثر بنتی ہے۔اُسلوب زیادہ تر ایک انفرادی مسئلہ ہوتا ہے۔ اُسلوب اس تعلق کا نام ہے جو لکھنے والا باہر کی دنیا سے قائم کرتا ہے۔ یہ ابلاغ زبان سے ہوتا ہے اور زبان نہ صرف داخلی چیز ہے بلکہ ایک خارجی عمل بھی ہے۔ اس لیے زبان کی گزشتہ روایات کا اثر لکھنے والے کے اُسلوب میں شامل ہوتا ہے۔اس لیے لکھنے والا اپنی ذات، گذشتہ روایات اور ماحول سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

ادبی اُسلوب عام اندازِ تحریر نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی ادیب یا انشا پرداز کا منفرد اور غیر معمولی طرزِ تحریر ہوتا ہے۔یہ طرز اسے اس کے ہم عصر ادیبوں سے الگ اور ممتاز کرتا ہے۔اُسلوب ایک ایسی چیز ہے جس پر باآسانی گرفت نہیں ہوسکتی۔ یہ کسی منفرد شے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نہایت دقیق اور باریک مرکب کا نام ہے۔اُسلوب کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> اُسلوب کی مختلف تعریفیں جو مشرق اور مغرب میں کی گئی ہیں ان سب کے مطالعے کے بعد ذہن جس فیصلے پر پہنچتا ہے۔وہ یہ ہے کہ اُسلوب تحریر یا فن

> پارے کی اِس انفرادیت کا نام ہے جس میں تخلیقی عمل ایک منفرد شخصی ادراک اور مخصوص ژرف نگاہی کا احاطہ کر رہا ہو۔اسی بات کو اگر تھوڑا سا پھیلا کر کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ اسلوب دراصل تحریر کی داخلی اور خارجی قدروں کا سنگم ہے۔اِس کا رشتہ ایک طرف تو فن کار کی ذہنی ساخت ، انفرادی شخصیت اور اس کے فنکارانہ شعور سے ملتا ہے اور دوسری طرف فن کی اجتماعی قدروں اور روایات سے۔[۹۲]

اُسلوب کا موضوع اور خیال سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔اور حقیقت تو یہ ہے کہ خیال خود اپنے ساتھ اُسلوب کا طرز بھی لاتا ہے۔یعنی ایک بڑی ادبی شخصیت کے خیال اور اظہار کے درمیان فرق اور تصادم نہیں تو افق و تطابق ہوتا ہے۔ اور اس توافق سے ابلاغ کی بہترین صورت پیدا ہوتی ہَے اور کمال ابلاغ اور جمال ادا ہی تو معراج اُسلوب ہوتی ہَے۔ وہ ادیب جو روح عصر کو اپنے فکر ونظر میں سمو کر اظہار کی بہترین صورت پیدا کرتے ہیں وہ صاحب طرز کہلاتے ہیں اور ان کا طرز و اُسلوب ایک مسلمہ اور سکہ بند قرار پاتا ہَے۔ اور اس کے نقوش پا کی چمک دوسروں کی رہبری و رہنمائی کرتی ہَے ۔ یہ اور بات ہَے کہ ان کے عظیم اُسلوب کی تقلید ممکن نہیں ہوتی ۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی مزید لکھتے ہیں:

> اُسلوب میں پہلی حیثیت زبان کی ہے اور دوسری خیال یا موضوع کی اور ان دونوں کو فن کی ابدی اور لازوال لڑی میں پرونے والی تیسری حیثیت فن کار کی اپنی شخصیت کی ہے۔[۹۳]

آزاد کے طرزِ نگارش پر بھی یہی بات صادق آتی ہَے۔ پروفیسر سید وقار عظیم ، آزاد کے اُسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں :

> نثر کے اُسلوب کا ذکر ہو تو لفظوں کو اس کی کسوٹی بنایا جاتا ہَے ۔یہ بات ہر لکھنے والا جانتا ہَے لیکن اس بات کی نزاکتوں کا احساس کم لکھنے والوں کو ہَے بلکہ بہت

کم لکھنے والوں کو ہے اور ان کم لکھنے والوں میں میرے نزدیک سب سے اونچا
مقام آزاد کا ہے۔"[۹۴]

مہدی افادی آزاد کے متعلق اپنے مضمون ''اردو لٹریچر میں عناصر خمسہ'' میں لکھتے ہیں:

سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد مذہب کے بغیر لقمہ
نہیں توڑتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے،
لیکن ''آقائے اُردو'' یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی سہارے کی
ضرورت نہیں۔[۹۵]

کہانی سی کہنا اور داستان سناتے سناتے زندگی کی متحرک تصویریں دکھانا آزاد کو بہت مرغوب تھا۔ تنقید و ادب ہو یا لسانی مسائل، تاریخ ہو یا تحقیق وہ ہر جگہ اپنے من پسند رجحان طبع کے مطابق کہانی کہتے اور تصویریں بناتے چلے جاتے ہیں۔

آب حیات کے دیباچے میں اپنی طبیعت کے بارے میں لکھتے ہیں: '' جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو''[۹۶]

دربارِ اکبری میں یوں لکھتے ہیں: ''آزاد اس حالت کا فوٹو گراف الفاظ و عبارت کے رنگ و روغن سے کیونکر کھینچ کر دکھائے'' [۹۷]

آزاد نے جس دور میں آنکھ کھولی تھی اس وقت جو طرز نگارش رائج تھا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ عبارت مسجع، مقفع اور مرصع ہو۔ جس تحریر میں اس صناعی کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جاتا وہی معیاری قرار پاتی وہ دور اُردو نثر کا پر تکلف دور تھا۔ اس زمانے کی ایک رجب علی بیگ سرور کی مقبول تصنیف ''فسانہ عجائب'' میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> توتے نے شہزادے کو سخان دلچسپ، قصص عجیب ، حکایات غریب، شعرخوب، خمسہائے مرغوب سنا، اپنے دام محبت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے دربار کے سوا جدا نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا پنجرہ بہ تاکید بہ حفاظت ماہ طاعت کو سونپ جاتا ، اور دربار سے دیوانہ وار بشوق گفتار ، بیقرار جلد پھر آتا۔ ایک دن شہزادہ دربار گیا، توتا محل میں رہا۔ اس روز ماہ طاعت نے غسل کیا اور لباس مکلّف سے آراستہ جسم آراستہ، زیور پرتکلف سے پیراستہ ہوا، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی۔ ہوا جو لگی، آئینہ میں صورت دیکھ، خودمحو تماشا ہوئی۔بحر عجیب و قوت میں آشنا ہو۔ خواصوں سے،جلیسوں سے جودم سازمحرم رازتھیں اپنے حسن کی داد چاہی ، ہر ایک نے موافق عقل وشعور کے تعریف کی کسی نے کہا ہلال عید ہو۔کوئی بولی، خدا جانتا ہَے دید ہو نہ شنید ہو ، اللہ تعالیٰ نے بایں کثرت مخلوقات ، تمھارا ہم سر ازقسم جن و بشر بنایانہیں۔ پری نے یہ قد و بالا ، حور نے یہ حسن کا جھمکڑا پایانہیں۔[۹۸]

میر امن کی باغ و بہار بھی وجود میں آچکی تھی لیکن اس کے باوجود لوگ پرتکلف اور مقفع و مسجع نثر کو پسند کرتے تھے۔ظہوری اور بیدل کے اتباع پر لوگ فخر کرتے تھے۔اب آزاد کے سامنے دو انداز تھے ایک رائج الوقت پرتکلف اور دوسرا دہلی اردو اخبار کی سادگی اور دلی کالج کی سلیس نثر۔ آزاد نے دونوں سے اپنے مزاج کے مطابق اثر قبول کیا۔ آزاد نے ان دونوں کے حسین امتزاج سے ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی جو خالصتاً آزاد کی اپنی راہ تھی ، جس پر آنے والی آئندہ نسلوں نے چلنے کی کوشش کی ، لیکن وہ اس راہ پر چلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کی وجہ یہ ہَے کہ آزاد ایک طرف تو قدیم اُسلوب کے بہترین اور نفیس ترین منعکس کرنے والے تھے اور ساتھ ہی ان کی یہ بڑی خصوصیت ہَے کہ وہ ادبی نثر نگاری کے جدید تقاضے یا شعور کا خیال بھی رکھتے تھے ۔شعور بھی ان کے ذہن اور ان کی تخلیقی نثر نگاری میں ملا ہوا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو آزاد کی نثر فارسی اور اردو کی اعلی ترین نثروں کا نچوڑ ، اچھے صنعت گروں اور ادیبوں کی تحریروں کو منعکس کرتی ہے اور دوسری طرف انہیں اس بات کا بھی احساس ہَے کہ نثر ابلاغ

کا بہترین ذریعہ ہے۔نثر کابنیادی مقصد مدعا ، مطلب اور مضمون کو براہ راست قاری تک پہنچانا ہے۔ یہ شعور جدید نثر کا بخشا ہوا ہے کہ مدعا نگاری اولین درجہ رکھتی ہے اور رنگینی ثانوی ۔ گویا آزاد ایک ایسے سنگھم پر کھڑے ہیں جہاں ان کی نظر ایک طرف پُر تکلف انشا پردازی پر پڑتی ہے اور دوسری طرف نثر کے جدید تقاضوں پربھی آزاد کو احساس ہے کہ وہ خداوند تعالٰی کی طرف سے ان ہر دو اسالیب کو ملانے کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے ''دہلی اردو اخبار'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

۱۱ مئی ۱۸۵۷ مسیحائی کو بباعث موسم گرما اول وقت کچہری ہو رہی تھی ، صاحب مجسٹریٹ محکمہ عدالت میں سرگرمِ حکمرانی تھے اور سب حکام اپنے اپنے محکموں میں سرگرم اجرائے احکام تھے اور حکم قید اور حبس سزائے جسمانی و جلی مجرمین وغیرہ جاری ہو رہی تھی کہ سات بجے کے بعد میر بحری یعنی داروغہ پل نے آکر خبر دی کہ صبح کو چند ترک سوار چھاؤنی میرٹھ کے پل سے اتر کر آئے اور ہم لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنے لگے اور محصول مجتمعہ کا لوٹنا چاہا میں نے بہ لطائف الحیل ان کو باتوں میں لگایا اور کشتی لب پل کی قفلی کھول دی کہ آگے نہ آسکے ۔۔۔ ادھر قلعہ دار خدمت حضرت ظل سبحانی میں حسب الطلب حاضر ہوا۔تمام حال وہاں کا بھی سن کر اور ہجوم سواران و سپاہیان دیکھ کر چاہا کہ ان لوگوں کو زیر قلعہ جا کر فہمائش کرے۔مگر حضور اقدس ازراہِ رحم و کرم منجملہ صفاتِ عطیہ الٰہی سے ہی نیچے جانے کو مانع ہوئے، انجام کار قلعہ دار رخصت ہو اورتھوڑی دیر میں سنا کہ قلعہ دار، بڑے صاحب و ڈاکٹر صاحب ومیم لوگ وغیرہ دروازے میں مارے گئے اور سوار قلعہ میں چلے آئے۔ حضور اقدس بھی دستارِ مبارک زیب سر اورشمشیر ولایتی زیب کمر فرما کرتشریف فرما دربار ہوئے ۔۔۔ اور شہر میں غل ہوگیا کہ وہاں فلاں انگریز مارا گیا اورفلاں انگریز وہاں پڑا ہے۔ راقم آثم بھی یہ چرچا دیکھ کر اور آواز بندوقوں کی سن کر بپاس دین وحمیت اسلام اپنے کلبہ احزان سے باہرنکلا تو بازار

میں عجب عالم دیکھا کہ جانب بازار کشمیری دروازے سے لوگ بے تحاشا بھاگے چلے آتے ہیں۔[۹۹]

اس اقتباس میں آزاد کا اُسلوب ابتدائی شکل میں ملتا ہے۔۱۷مئی ۱۸۵۷ء کے ہی دہلی اُردو اخبار کا ایک اقتباس ''حال چھاؤنی'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے۔ اس کا آغاز یوں کرتے ہیں:

''بوقت آٹھ بجے دن کے اوّل وقت جبکہ شہر میں ہل چل ہو رہی تھی ایک تلنگہ چھاؤنی سے چٹھی لئے کچہری آیا اس سے جو حال چھاؤنی راقم آثم نے دریافت کیا تو اس نے بیان کیا کہ وہاں بھی کمر بندی ہو رہی ہے''۔[۱۰۰]

۱۴جون ۱۸۵۷ء کے دہلی اُردو اخبار کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

رنگین مزا جان شہر خصوص مستورات کہ جو پان زر دے کی عادی ہیں ، نہایت تکلیف میں ہَیں کہ پان پیپل کے پتے برابر زیر جامع مسجد مقام منڈی سے دو روپے کو ہاتھ آتا ہَے ، یا تو یہاں یہ حال تھا کہ اہل شہر شوقین زردہ کھانے والوں سے زیادہ منہ لال رکھتے تھے کس و ناکس گلوری منہ میں لئے پھرتا تھا یا یہ حال ہَے کہ زردے والے بھی خاک پھانکتے ہیں کہ لوازمات پان کی بھی بہت گراں قیمت ہوگئی ہےَ، یہ وہی باتیں پیش آتی ہیں کہ کم ظرفانِ شہر پہلے جنس کی چیزوں میں سوسو طرح کے رخنہ نکالتے تھے ، جو ہَے سوداُود خانی گیہوں ڈھونڈتا ہَے ، کبھی آٹے کو بو دار بتلاتے تھے کبھی کہتے تھے آٹا کرکرا ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ گیہوں جوالے ہیں ، گلے میں نوالہ اٹکتا ہے اور مقدار میں اس قدر اسراف کرتے تھے کہ ہمیشہ صرف روز مرہ سے بُہت زیادہ بچ رہتا تھا۔ اگر فقیروں کو دیتے تھے تو فقیر باسی دیکھ کر گلی کی موریوں میں ڈال جاتے تھے ، خدا کی قدرت ہَے خیر آئندہ اللہ خیر رکھے۔ دیکھیئے ہم لوگوں کے اعمال کیا کیا کچھ دکھاویں گے۔ علاوہ ازیں

ایک امر ضروری قابل توجہ منتظمان بندوبست و منصر مان انتظام ہے کہ جس سے رعایا کو بہت تکلیف ہے ، یعنی سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا ہے۔ جو صاحب مقدور ہیں ان کے نوکر موجود ہیں۔ شرفاء بے چارے ٹھلیاں کندھوں پر لئے بھرتے پھرتے ہیں۔ جب کاروبار ضرور اور کام کھانے پکانے کے جاری ہوتے ہیں ، حلال خور بقول مصرع مشہور

ے برعکس نہند نام زنگی کافور یکسر حرام خور ہو گئے۔

بہت محلے کئی کئی دن تک نہیں کمائے گئے ، اگر یہی حال رہا تو تعفن کہ کشتہ و اموات کی بھی اعانت ہو کر ، ہوا بگڑ جائے گی۔ اور تمام شہر بلکہ اطراف و انواح میں بھی وبا پھیل جائے گی اور اس میں شک نہیں کہ جو لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے یا پیدل ہو کر ارادہ بھاگنے کا رکھتے ہیں اس قسم کی تکلیفات سے بھی اُنھیں عذر معقول واسطے ترکِ شہر کے ہاتھ آجائے گا۔ شعر

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا [۱۰۱]

۲۱ جون ۱۸۵۷ء کے دہلی اُردو اخبار کا یہ اقتباس بھی دیکھیے :

اے اہلِ وطن عملداری تبدیل ہوئی رنگِ زمانہ تبدیل ہوا۔ انتظام ملک و سلطنت تبدیل ہوا۔ تم کو بھی چاہیے کہ اب اپنے عادات و حالات ، راحت پسندی اور آرام دوستی کو کہ لڑکپن سے اِن کے عادی ہو گئے ہو ، تبدیل کر دو اور اپنی اصلاحِ حال کی فکر کرو۔ عادت بے پروائی و کم ہمتی چھوڑ کر کمر ہمت کو چست باندھو۔ حال کار کو اپنے دل میں سوچو کہ اب یہ زمانہ بہُت نازک آیا ہے اور یہ وقت بہُت کام کا ہے ، یعنی اگر سرمایہ خوبئ قسمت اور مادہ لیاقت رکھتے ہو تو اب ترقی و حصول رتبہ عالی کچھ بات نہیں ہے۔ غیر دین ، غیر قوم اور غیر زبان ہونا

حکام گزشتہ کا تمھارے حق میں بہُت ہی خلل انداز روز گار تھا اوراختلافِ
عادات و اخلاق و برخلافی رنگ ولباس باعثِ ناموافقت تھا۔ ہزار ہزارشکر ہے
اورتم بھی خدا کی درگاہ میں شکر کرو کہ تمھاری قسمت پھری۔[۱۰۲]

ان تمام اقتباسات میں آزاد کے ابتدائی اُسلوب کے نمونے ملتے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ گو یہ آزاد کا وہ اُسلوب نہیں جس نے آزاد کو آقائے اُردو بنا دیا ، لیکن اس اُسلوب کا نقشِ اوّل ضرور ہَے۔ موزوں اور دلکش ترکیبیں ، حشو و زوائد کے استعمال سے عبارت میں زور پیدا کرنا عبارت کی رنگینی ، فارسی ترکیبوں کی فراوانی ، عبارت میں زور پیدا کرنے کے لیے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے جملوں کا برمحل استعمال ، آزاد کی انشا پردازی کا خاصہ ہے اور یہ اقتباسات یہی خاصہ لیے ہوئے ہیں:

''نصیحت کا کرن پھول'' آزاد کی ابتدائی تصنیف ہے ، یہی صورت حال ''نصیحت کے کرن پھول'' میں بھی ملتی ہَے نصیحت کے کرن پھول میں آزاد نے بعض جگہ روایتی داستانوں کا انداز اختیار کیا ہَے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

''سیر کرنے والے ملک خیال کے اور تماشا دیکھنے والے زمانہ حال و استقبال کے
بیان کرتے ہیں''۔[۱۰۳]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''کیا کریں یہاں راحت کا مقام نہیں ، بے محنت کیے آرام نہیں''[۱۰۴]

اس عبارت میں قافیہ پیمائی نظر آتی ہَے ۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''صحیح سلامت وہاں سے پھر کر آؤں، ملک چین کے تحفہ تحائف تمھارے واسطے
لاؤں''۔[۱۰۵]

اس اقتباس میں بھی قافیہ پیمائی ہے لیکن یہ قافیہ پیمائی کم ہے اور اس میں طرز آزاد کا بانکپن زیادہ نمایاں ہے:

''گھر باہر سے خوب ہشیار اور رات دن اندھیرے اجالے خبردار رہے''۔[۱۰۶]

آزاد کے یہ اقتباسات قدیم انداز کی قافیہ پیمائی کی غمازی کرتے ہیں لیکن اس قافیہ پیمائی میں بھی آمد ہے تصنع اور آورد نہیں۔ بے ساختگی، برجستگی اور سادگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں وہ شعریت بھی نمایاں نہیں جو بعد میں آزاد کی نثر کا خاص وصف قرار پائی لیکن کہیں کہیں ایسے جملوں کی جھلک نظر آتی ہے:

''گاڑی تخت سلیمان کی طرح بے تکان اڑی چلی جاتی تھی''[۱۰۷] ''سڑک سیدھی صاف مثل خط کہکشاں بنی ہوئی ہے''۔[۱۰۸] ''ایسی ہوا سے تمام سمندر تہ و بالا ہو جاتا ہے پانی مارے موجوں کے بانسوں اونچا اٹھتا ہے اور جہاز کبھی آسمان پر ہوتا ہے اور کبھی زمین پر، منوں پانی جہاز پر آکر گرتا ہے''۔[۱۰۹]

ان میں وہ شعریت اور رچاؤ نہیں جو آزاد کے اُسلوب میں آگے چل کر نمایاں ہوتا ہے۔ ''نصیحت کا کرن پھول'' کے بعد آزاد کی درسی کتابیں سامنے آتی ہیں۔ یہ چونکہ درسی کتابیں ہیں، ان میں آزاد کے اُسلوب کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی درسی کتابوں میں کہیں کہیں قافیہ پیمائی کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ ان میں قدیم و جدید دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔

مولانا آزاد کو قافیہ پیمائی سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی یہ محض ایک تقلید تھی جُوں جوں آزاد کے اُسلوب میں پختگی آتی گئی، آزاد نے اِس قافیہ پیمائی کے انداز کو خیر آباد کر دیا اور سادگی اور سلاست کو اپنایا۔ سادگی اور سلاست کی فضا میں پروان چڑھنے کے باوجود مولانا آزاد بیدل، ظہوری، ابو الفضل اور نعمت خان عالی سے بھی بہت متاثر تھے۔ ظہوری کی نازک خیالی سے خاص طور پر متاثر تھے۔ فارسی زبان و ادب سے بے حد محبت تھی۔ ایران کا حسن طبیعت آزاد کی رگ و پے میں سمایا ہوا

تھا اس لیے انہوں نے نئی طرز کے اتنے اثرات قبول نہ کیے جتنے ظہوری اور حالی کے قبول کیے۔آزاد کی تحریروں میں ظہوری کا رنگ صاف طور پر دکھائی دیتا ہے ۔آزاد نے سخن دان فارس میں ظہوری کی تعریف بھی کی ہے

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی :

آزاد نے اُسلوب کے ذریعے سے طرز قدیم اورطرزِ جدید میں مفاہمت پیدا کر کے اپنے اُسلوب کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ ''نصیحت کا کرن پھول'' اور درسی کتابیں آزاد کی ادبی مشق ہیں۔مشق کے خار زار سے گزرنے کے بعد ''قصص ہند'' میں وہ ایک پختہ کار ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ۔قصص ہند میں انہیں ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا ان کا اُسلوب پختہ ہو چکا تھا ، انفرادیت پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی لیکن قصص ہند کے مخاطب نوعمر طلبہ تھے اس مجبوری کی وجہ سے آزاد کو گھٹنوں کے بل چلنا پڑا۔ اور جان بوجھ کر بچہ بنا پڑا۔ اس مشکل کے باوجود انہوں نے اپنے رنگ کو پوری طرح نباہ دیا اور قصص ہند کو زبان و بیان کا ایسا شاہکار بنا دیا جس کی نظیر نہیں ملتی ۔"[۱۰]

چند اقتباسات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

چنانچہ دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی تھیں ایک دوسرے کی پیش دستی کا منتظر تھا کہ آسمانی گولہ پڑنے لگا یعنی بے موسم برف گرنی شروع ہوگئی۔ وہ لوگ تو برف کے کیڑے تھے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی ہندوستانی بے چارے اپنے لحاف اور رضائیاں ڈھونڈ نے لگے۔"[۱۱]

یہاں آزاد نے خوب صورت استعاورں سے کام لیا ہے ۔منظر کشی اس طرح شاعرانہ انداز میں کی ہے کہ پورا سماں آنکھوں کے سامنے کھنچ کر آ گیا ہے ، دلکش منظر ہے ۔ ایک اور اقتباس

ملاحظہ فرمائیں:

عبدالملک ابن نوح پانچویں بادشاہ کی خدمت میں آسپتگین نام ایک غلام تھا کہ بادشاہ کو بھان متی کے تماشے دکھا کر اور نقلیں سنا کر خوش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجلس عشرت سے نکل کر دربار سلطنت میں داخل ہوا۔"[۱۱۲]

اس اقتباس میں آزاد نے سادگی اور بے ساختگی کے باوجود صنعت گری سے کام لیا ہے ۔ یہ صناعی بڑی برجستہ ہے ۔ ایک اور اقتباس دیکھیے ۔

عمارت کی شان و شوکت دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں چھپن ستونوں پر گنبدی چھت، بیضہ عنقا کی طرح دھری تھی کہ ہر ستون ایک ڈال سنگِ مرمر کا تراشا ہوا تھا اور سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ پچی کاری کی گل کاری چین کے نقش و نگار مٹاتی تھی ۔ اور کندن کی ڈلک ستاروں پر آنکھ مارتی تھی۔ بیچوں بیچ میں ایک جڑاؤ زنجیر لٹکتی تھی۔اس میں ایک سونے کا چراغ دن رات دھڑ دھڑ جلتا تھا۔خدا جانے کن وقتوں سے اسی طرح روشن چلا آتا تھا۔جس کی قسمت میں آج کے دن اس آندھی سے گل ہونا لکھا تھا۔"[۱۱۳]

منظر بھی شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اس میں بھی صنعت گری ہے ، لیکن کمال چابکدستی کے ساتھ کی گئی ہے ۔قوت بیان ، قدرت زبان، ماضی پرستی اور سادگی سب کچھ اس منظر کشی سے آشکار ہے ۔ آزاد کی انشا پردازی نثر میں شاعری کا رنگ لیے ہوئے ہے وہ قافیہ بندی اور ایجاز و اختصار کا اہتمام کرتے ہیں اور استعاروں ، تشبیہوں سے عبارت کو مرصع کرتے ہیں ۔انہیں تصویر، منظر کشی ، تمثیل ، تجسیم نگاری ، رعایت لفظی اور جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔اس میدان میں کوئی ان کے مدِ مقابل نہیں وہ چھوٹے چھوٹے مترنم جملے لکھتے ہیں اور سلاست زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ پریشان حال شہنشاہ ہمایوں کے ہاں اکبر کی پیدائش پر لکھتے ہیں:

جب ہمایوں جودھ پور کی مصیبت بھر کر امرکوٹ میں پہنچا تو پل کی پل ستارے نے آنکھ کھولی یعنی اکبر پیدا ہوا۔ شاہِ بے سپاہ کے نمک حلال رفیقوں نے آکر مبارکبادیں دیں۔اس کے پاس کوئی رسم ادا کرنے کا سامان نہ تھا۔چپ ہوگیا لیکن کمر میں ایک مشک نافہ یاد آگیا ، وہی نکالا اورشگون کے لیے ذرا ذرا سا مشک سب کو بانٹ دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو ! اس نحوست کے وقت میں کسے خیال ہو گا کہ اس بچے کی شمیم اقبال بوئے مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔"[۱۱۴]

کیسے گاتے ہوئے جملے ہیں اور آنکھوں میں کیا تصویر کھنچ جاتی ہے ، حرماں نصیبی میں وقتی طور پر خوشی حاصل ہونے کی ، یہ صرف آزاد کا کمال ہے کہ وہ حرمان نصیبی میں بھی اس طرح کی منظر کشی کرتے ہیں ، آزاد کے علاو ہ کوئی بھی ایسی منظر کشی نہیں کر سکتا۔قصص ہند کا ہر صفحہ ایسی خصوصیات سے بھرا پڑا ہے۔قصص ہند کے بعد آزاد کی تصنیف سخنداں فارس ہے۔ اس کا پہلا حصہ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا یہ آزاد کے لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب لسانیات سے تعلق رکھتی ہے ۔کتاب کے پہلے لیکچر میں مولانا محمد حسین آزاد نے بتایا ہے کہ انسان ابتداء میں دل کے خیالات، اپنے چہرے کے تاثرات ، منہ سے بے اختیار خارج ہونے والی متنوع آوازوں اور اشاروں کی مدد سے دوسروں تک پہنچاتا تھا۔پھر انہی آوازوں نے الفاظ کی صورت بدل لی اور باہمی اتفاق سے کچھ لفظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لیےمقرر ہو گئے جب آفرینش بڑھی اور آبادی پھیلی ، تب یہی لفظ ادائے مطلب کے لیے استعمال میں لائے گئے۔آزاد لکھتے ہیں:

اب کوئی پوچھے کہ تقریر کیونکر پید اہوئی تم صاف کہہ دو گے کہ انسان میں چیخنے یا چلانے کی خاصیت ہے ۔ وہ باہمی ضرورتوں اور آپس کے برتاؤ سے اصلاح اور ترقی کرتے کرتے تقریر ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ رتبہ پیدا کیا کہ جس طرح ایک مصور کامل کسی انسان یا باغ یا محل کا نقشہ کھینچ کر اس کی کیفیت آنکھوں کے رستے سمجھاتا ہے ۔صاحب زبان اپنے مافی الضمیر اورحرکت اعضا کے مجموعہ کوآواز کے

رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ پس گویائی گویا ایک عمدہ آلہ ادائے خیال کا ہے۔۔۔[۱۱۵]

سخن دان فارس کے حصہ اول کا دوسرا باب محمد حسین آزاد نے بعنوان ''سنسکرت اور فارسی زبان کی فیلا لوجیا'' باندھا ہے۔یہ پہلے حصے کا دوسرا اور آخری لیکچر ہے۔یہ دونوں لیکچر ۱۸۷۶ء میں رفاہ عام پریس لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔اس میں مولانا نے بے شمار حوالوں اور لاتعداد مثالوں کے ذریعے سنسکرت اور فارسی زبان کے ان گنت الفاظ کے لسانی رشتے تلاش کر کے قارئین کے سامنے پیش کیے ہیں۔مولانا نے فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں نہایت قریبی رشتوں کے نام، اعضائے بدن کے نام، قدرتی اشیاء کے نام، زرعی اجناس، جانوروں کے نام، بنیادی اعداد اور اعداد فاعلی کے لیے مستعمل الفاظ کا آپس میں تقابل کر کے نہایت گہری اور اہم مماثلتیں دریافت کی ہیں۔اسی لیکچر میں مولانا نے الفاظ کے اصول مبادلہ بھی بتائے ہیں۔یہ دونوں لیکچر اپنے موضوع اور طرز تحریر کے علاوہ مولانا کی تحقیقی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں اور مولانا آزاد کا اردو زبان پر ایک گراں قدر احسان ہے۔کتاب کے دوسرے حصہ میں گیارہ لیکچر ہیں۔پہلا لیکچر قدیم فارس کی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرا لیکچر ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات پر مشتمل ہے۔تیسرا فارسی نثر کی ان لسانی تبدیلیوں کی نشان دہی کرتا ہے جو اسلامی حملوں کے بعد رونما ہوئیں ان میں مولانا اپنی زبان کے جوہر کچھ اس طرح دکھاتے ہیں:

عزیزان وطن! گذشتہ لیکچر میں آپ نے سن لیا کہ جب اسلام کا قدم زمین فارس پر آیا تو فارس کی زبان کیا تھی۔۔۔تقریباً تین سو برس تک زبان مذکورہ موت کی نیند سوتی رہی لیکن دوسری صدی ہجری سے عباسیہ کا دور تھا کہ عیاشی نے خلافت کو سلطنت بنایا اور غفلت نے سلطنت کو ضعیف کرنا شروع کیا۔ دربار میں رنگ رنگ کے مصاحب محلوں میں قوم قوم کی عورتیں بھر گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مملکت میں ایک ایک ہمت والا خود سری کی تلوار باندھ کر بادشاہ بن بیٹھا۔ خلفاء

فقط دارالسلام بغداد میں تبرک بن کر رہ گئے ۔۔۔ زبان فارس کے لیے قدرتی سامان یہ ہوا کہ سامانیوں نے ماوراالنہر میں قومی سلطنت کا نشان قائم کیا۔ امیر اسماعیل سامانی نے ترکستان ، خراسان اوراصفہان وغیرہ پر حکومت پھیلا دی۔ جب تک خاص عرب حاکم تھے تب تک عربی زبان ملکی زبان کو دبائے رہی۔ اب حاکم وقت خود اسی خاک کا پتلا ہوا۔ وہ بہرام چوبیں کی اولاد تھا۔ جس طرح عرب کو اپنی عربی کی محبت تھی اسی طرح اسے اپنے باپ دادا کی زبان کی محبت ضرور ہو گی۔غرض خواہ اس محبت سے،خواہ ملکی مصلحت سے اس نے عربی زبان کی وہ پابندی نہ رکھی ہو گی جواب تک تھی ۔۔۔۳۴۲ ہجری میں تمام دفتر فارسی ہو گئے۔[۱۱۶]

چوتھا لیکچر فارس کی زبان مرجبہ میں دوسرا انقلاب کے نام سے ہے۔ پانچویں لیکچر میں ملک فارس کے رہنے والوں کے رسم و رواج ، اعتقادات کے علاوہ توہمات ، مقامی نفسیات ، روایات اور قصہ جات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے لیکچر میں اسلام کی ایران میں آمد کے بعد مقامی لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں ، اطوار، عادات باہمی تعلقات ، رسومات ، آداب،طریق نشست و برخاست خیالات اورتفکرات میں کیا کیا اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ساتویں لیکچر میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ کسی خطہ، کے موسم اورسر زمین اس کی انشا پردازی اور زبان پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

آٹھویں لیکچر میں یہ بتایا ہے کہ فارسی نے دوسری زبانوں سے اگر الفاظ لیے بھی ہیں تو انہیں متعدد صورتیں اورشکلیں دے کر اپنی زیبائی کا معاون بنایا ہے۔

نواں لیکچر ان تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے جوعرب زبان سے فارسی کے اختلاط کے باعث ظہور میں آئیں۔دسویں لیکچر میں ہندوستان میں آمد کے بعد فارسی زبان پر جو رنگ چڑھا اُس پر روشنی ڈالی ہے۔اور آخری اور گیارہویں لیکچر میں ’’ نظم فارسی کی تاریخ ہے‘‘ یہ دوسرا حصہ گیارہ لیکچروں پر مشتمل ہے جو۱۸۷۲ء سے۱۸۷۴ء تک میں دیے گئے ہیں۔لیکن یہ مسودے کی حالت میں

پڑے رہے۔ ۱۸۸۵ء میں ایران سے واپسی پر آزاد نے ان پر نظرِ ثانی شروع کی اور یہ کام ۱۸۸۷ء میں ختم ہوا۔ لیکن آزاد کی دیوانگی کے باعث ان کی طباعت نہ ہو سکی۔ آخر کار آزاد کے صاحب زادے آغا ابراہیم نے ۱۹۰۷ء میں اسے مفید عام پریس سے چھپوایا۔

ڈاکٹر محمد صادق مولانا محمد حسین آزاد اور سخن دان فارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ ایک اعتبار سے آزاد جدیدیت کا پیش رو ہے۔۔۔ سخن دان فارس کی بابت میری آخری رائے یہ ہے کہ بلحاظ اُسلوب اور مضامین کے یہ ایک وقیع تخلیق ہے''۔[۱۱۷]

سخن دان فارس تک آزاد کی انشا پردازی کا رنگ نکھر کر پختہ ہو گیا ہے۔'' آب حیات'' مولانا آزاد کی بڑی تصنیف ہے۔ اس تصنیف کے دوران جو خط اپنے دوست و احباب کو لکھے ہیں اُن میں کئی جگہ'' آب حیات'' کا ذکر کیا ہے۔ اور اِس قسم کے جملے لکھے ہیں:

'' آب حیات نے مجھے مار ڈالا ہے'''' آب حیات نے مجھے ہلاک کر دیا ہے''[۱۱۸]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''مدت گزر گئی کہ خدمت سے مقصر ہوں مگر عالم مجبوری ہے کہ آب حیات میں غوطے کھا رہا ہوں''۔[۱۱۹]

مولانا آزاد رعایت لفظی سے کام لیتے ہیں لیکن اُن کی رعایت لفظی معنی خیز ہوتی ہے۔ مولانا نے آب حیات میں بڑی جانکاہی اور جگر کاوی سے کام لیا تھا۔ آب حیات کے ایک ایک لفظ سے اس خون جگر کی بو آتی ہے۔ آب حیات اس خون جگر کا نقش ہے اور اس نقش کو رنگِ ثبات و دوام حاصل ہے۔ اُردو نثر میں اس کا ایک خاص مقام ہے، جس سے انکار بہت مشکل ہے۔

یہی حال ''دربارِ اکبری'' کا ہے۔ یہ عہدِ اکبری کی تاریخ سی ہے۔ لیکن جہاں تک تاریخ نویسی کا تعلق ہے مولانا اُن تقاضاؤں کا مطلق خیال نہیں رکھتے۔ ٹھوس تاریخی حقائق کو بے لاگ انداز میں عیاں کرنے پر دھیان نہیں دیتے۔ تاہم اندازِ بیان کے حُسن سنوارے رکھنے کا اہتمام جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ تاریخ غیر شخصی ہوتی ہے لیکن مولانا کی اپنی ذات سطر سطر میں اُجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ قدم قدم پر آزاد کو آواز دی ہے قدم قدم پر اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ''آبِ حیات'' بھی ایک تاریخ ہے دربارِ اکبری کی طرح وہ بھی ایک خوبصورت نثر کا شاہکار ہے۔

دربارِ اکبری کے بارے میں ایک خط بنام ''سید ناصر نذیر فراق'' میں آزاد لکھتے ہیں:

''دربارِ اکبری سات آٹھ سو صفحے کی کتاب میں نے لکھی ہے۔ اس میں امرائے عہد اکبر کے حالات اس لطف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس طرح میر، سودا، سید انشا کے حالات آپ نے آبِ حیات میں دیکھے''۔ [۱۲۰]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے ادبی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں کوئی فرق مدِنظر نہیں رکھا۔ آزاد اوّل و آخر اِنشا پرداز و ادیب تھے۔ باقی چیزیں اِن کے سامنے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ''نیرنگِ خیال'' انگریزی سے ترجمہ اور ماخوذ ہے۔ اس میں آزاد نے مرکزی خیال لے لیا ہوا ہے اور اس پر عمارت اپنے انداز میں تعمیر کی ہے۔ نیرنگِ خیال کی تصویروں میں تخیل کی کارفرمائی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ مجرد چیزوں اور حقیقتوں کی تجسیم کمال چابکدستی کے ساتھ ملتی ہے۔ ایسی مثالیں اُردو ادب میں کم ملتی ہیں۔ آزاد کے اُسلوب کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

آزاد کے اُسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کا مکمل اور بھرپور اظہار ہے۔ آزاد اپنی ہر تحریر میں سانس لیتے، چلتے پھرتے اور باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ آزاد خیالی اور جذباتی انسان تھے۔ طرزِ نو کے مبلغ ہوتے ہوئے بھی وہ ذہنی اعتبار سے ماضی کے باشندے تھے۔ انہیں ماضی اور اس کی ہر چیز سے عشق تھا۔ اُن کی دنیا خیالی دنیا تھی وہ اپنی ذہن کی تراشی ہوئی

جنت میں مگن تھے۔اُن کی شخصیت میں نرمی ، دھیما پن اور وقار تھا ،کم وبیش یہی کیفیت اُن کے اُسلوب میں بھی پائی جاتی ہے۔ان کا اُسلوب خیالی اور جذباتی ہے۔ ماضی کے بیان میں یہ سحرمجسم ہو جاتا ہے۔ اِس میں تیزی اور تُندی نہیں نرمی ، دھیما پن اور وقار ہے۔ آزاد کی فطرت میں جرأت رندانہ بالکل نہیں تھی ان کے اُسلوب میں بھی اس کا فقدان ہے۔ وہ کُھل کر طنز وتعریض نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لیے لطیف پیرائیہ اِظہار تلاش کرتے ہیں۔ آزاد کا اُسلوب صناعی اور کاوش پیہم کا نتیجہ ہونے کے باوجود ان کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اس کا صحیح مظہر ہے۔ آزاد کے معاصرین میں یہ خصوصیت صرف شبلی کے یہاں پائی جاتی ہے۔شبلی کا اُسلوب بھی ان کی شخصیت کا ترجمان ہے۔سرسید، نذیر احمد اور حالی کے اسالیب میں یہ خصوصیت اتنی نمایاں نہیں ۔سرسید کا اُسلوب بڑی حد تک غیر شخصی ہے نذیر احمد کا اُسلوب اُن کی شخصیت کی صحیح نمائیندگی نہیں کرتا۔ حالی کا اُسلوب متوازن ہونے کے باوجود انفرادیت سے عاری ہے۔آزاد کا اُسلوب اور شخصیت دونوں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جگہ جگہ قاری کو اپنی شخصیت کی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔[۱۲۱]

اُردو میں کوئی ادیب ایسا نہیں جس نے اپنی شخصیت کو اس قدر داخل عبارت کیا ہو۔آزاد کا لہجہ ہر چند جملوں کے بعد خطابیہ ہو جاتا ہے: ''اے راہ اُمید کے مسافرو''[۱۲۲] خانخاناں اگر ایسا کیا تو حیف ہے تمہاری اس دانائی پر اور ذہن کی رسائی پر۔۔۔ اَے گلشن فصاحت کے باغبانو۔۔۔[۱۲۳]

یہ مخصوص خطابیہ طریقہ اور ندائیہ انداز ان کی عام تحریروں میں ملتا ہے۔''آب حیات'' کے دیباچہ میں شروع میں ہی لکھتے ہیں ''آزاد ہندی نہاد''[۱۲۴] اِس سے ان کے خطابیہ انداز کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دربارِ اکبری میں بھی آزاد اپنے آپ کو بہت زیادہ مخاطب کرتے ہیں مثلاً ''آزاد ! دنیا کے لوگ دولت مندی کی آرزو میں مرے جاتے ہیں۔''[۱۲۵]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربارِ اکبری لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہ نامے لکھنے لگا''۔[۱۲۶] ''آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں مرنا تو ایک دن سب کو ہَے''۔[۱۲۷] ''آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت اور بد اصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہَے''۔[۱۲۸]

آزاد اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ اس عادت کی جھلک ان کی ہر تصنیف میں ملتی ہے۔ آزاد کے اُسلوب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہَے کہ وہ شعریت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آزاد نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ کیونکہ آزاد نثر لکھتے ہوئے بڑی کثرت اور شدت کے ساتھ شاعرانہ وسائل کا اہتمام کرتے ہیں وہ ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتے ہیں جو نثر کی بجائے نظم میں زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ تشبیہوں اِستعاروں اور صنعتوں کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں صوتی اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ آزاد الفاظ کو اس طرح کانٹ چھانٹ کر استعمال کرتے ہیں جن سے ان کی تصاویر زیادہ مؤثر بنتی ہیں۔ آزاد کے شاعرانہ اُسلوب اور مصوری کو سمجھنے کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ولی عہد چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ وزیر زادہ دوڑا آیا اور کہا لو میاں پروانے اُٹھو تمھاری شمع نے آ کر محل کو روشن کر دیا۔ شہزادہ سنتے ہی حیران ہو گیا۔ جب وزیر زادے نے قسم کھا کر کہا تو اُٹھ کر اُس کی پیشانی چوم لی اور کلاہ جواہر نگار جس پر ہُما کے پروں کی کلغی لگی تھی تکیے پر سے اُٹھا کر اُس کے سر پر رکھ دی ۔[۱۲۹]

یہ شاعرانہ اُسلوب ہَے جس میں رعایت لفظی بھی ہَے اور افسانویت کا رنگ بھی۔ صنعت کا استعمال بھی لیکن انداز ایسا ہَے کہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ انشا پرداز نے اس بے ساختگی کے لیے کہیں محنت اور کاوش کی ہے۔ بلکہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ بے ساختگی اور برجستگی انشا پرداز کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے۔ شاعرانہ انداز کی ایک اور تصویر دیکھیے :

> بارہ مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ مینا کاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پائے تک خالص کندن اور آب دار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا کہ گویا ایک ستارے کا نگینہ ہَے کہ انگوٹھی پر

دھرا ہے۔ اس کی روکار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا جسے سبزہ و الماس سرسبز اور لعل و یاقوت سے گل رنگ کیا تھا۔ اِدھر اُدھر اُس کے دو مور رنگا رنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لیے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگتے ہیں چاروں طرف چتر زرنگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی آگے ایک شامیانہ کہ جواہرات اور موتیوں کی آب داری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا اور ایک لاکھ روپیہ کی لاگت میں تیار ہوتا تھا سونے روپے کی چوبوں پر استادہ تھا۔ گرد اِس کے کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے سجی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد پاس ادب کے لیے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوش نما لگا تھا کہ جس کی مینا کار جالیاں مرغ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ [۱۳۰]

اس اقتباس میں آزاد کا فن اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ استعاروں اور تشبیہوں سے کس طرح عبارت کو مرصع کرتے ہیں۔ تصویر اور منظر کشی میں کمال حاصل ہے ماضی سے عقیدت، احساسات کو برانگیختہ کرنے اور تخیل کو مہمیز کرنے کی خصوصیت سبھی کچھ یہاں موجود ہے۔ اس میدان میں آزاد کا کوئی حریف پیدا نہیں ہوا ہے۔ آزاد چھوٹے چھوٹے مترنم جملے لکھتے ہیں اور ملائمت زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

آزاد کے اُسلوب کی سب سے بڑی خوبی تصویر کاری ہے، وہ ذکی الحس تھے۔ ہر بات اُن کے سامنے تصویری رُخ لیے جلوہ گر ہوتی ہے۔ مجردات کو مجسم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ مجرد خیال کے قائل نہیں۔ یہ اِن کے ذہن کا دانستہ فعل ہے، اس سے انھیں خاص لگاؤ ہے۔ اپنی بات کو مؤثر بنانے کے لیے تصویروں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں مثلاً دربارِ اکبری میں گجرات کی یلغار کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

''اس سمے کا تماشا ایک عالم ہوگا دیکھنے کے قابل، آزاد اِس حالت کا فوٹو گراف الفاظ و عبارات کے رنگ و روغن سے کیونکر کھینچ کر دکھائے''۔ [۱۳۱]

آب حیات اُردو شاعری کی تاریخ ہے لیکن آزاد نے اسے ایسے ادبی رنگ میں پیش کیا ہے کہ قدیم شاعرانہ مجلسوں کی کیفیت اورنجی صحبتوں کے نقشے ، اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے پھرنے لگتے ہیں جیسے ہم کتاب نہیں پڑھ رہے بلکہ شاعروں کی روح پرور مجلسیں اپنی تمام تر تہذیبی و تمدنی شان و شائستگی کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔شرکائے مشاعرہ کی شعر خوانی ، داد و تحسین ، چہل و مذاق اورنشاط وطرب کی وہ تمام کیفیات زندہ اورمتحرک انداز میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

میر تقی میر کے لکھنو کے مشاعرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ان کی وضع قدیمانہ ، کھڑکی دار پگڑی ، پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستو لیے کا کمر سے بندھا ایک رومال پٹڑی دار تہ کیا ہوا اس میں آویزاں مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائنچے ، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار ، دوسری طرف کٹار ہاتھ میں جریب غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنو۔ نئے انداز ، نئی تراشیں ، بانکے ٹیڑھے جوان جمع ، انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔[۱۳۲]

انشاء اللہ خاں اورجرات کی چھیڑ چھاڑ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ایک دن میر انشاء اللہ خان جرأت کی ملاقات کوآئے دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو۔ جرات نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے چاہتا ہوں مطلع ہو جائے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا ہے ؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہو گا تب تک نہ سناؤں گا۔نہیں تو تم مصرع لگا کر اُسے بھی چھین لوگے ۔سید انشاء نے بہت اصرار کیاآخر جرأت نے پڑھ دیا:
>
> اس زُلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

سید انشاء نے فوراً کہا کہ:

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

"جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اُٹھا کر مارنے کو دوڑے دیر تک انشا آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے۔ اللہ اکبر کیا شگفتہ مزاج لوگ تھے"۔[۱۳۳]

میر تقی میر کی صورت و ہیت، جرات و انشاء کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی آخری زندگی کی تصویروں کو آب حیات میں دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم سچ مچ اُسی ماحول میں سانس لے رہے ہیں اور انہی محفلوں میں بیٹھے دیکھ سن رہے ہیں۔آب حیات کے مرقعوں میں آزاد کی قوت متخیلہ اپنی پوری جولانی پر ہے۔ان کا قلم ایسے لفظی پیکر تراش رہا ہے کہ مانی و بہزاد دیکھیں تو اپنے موقلم کے ساتھ تصویر حیرت بن کر رہ جائیں۔

آب حیات کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"غرض یہ سب باتیں میری آنکھوں میں اِس طرح عبرت کا سرمہ دیتی تھیں گویا وہی زمانہ اور وہی اہلِ زمانہ موجود ہیں"۔[۱۳۴]

بقول ڈاکٹر صادق:

آزاد اوّل و آخر انشا پرداز ہی انشاپرداز ہیں۔ وہ ایک مصور کی طرح موقلم سے مرقعوں پر مرقع کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ جہاں تک ذوق و شوق سے لبریز جذباتی مرقع کشی کا تعلق ہے ۔اُردو ادب میں ان کا کوئی حریف نہیں۔[۱۳۵]

یہ تصویریت جگہ جگہ ملتی ہے اس کے بغیر تو وہ بات نہیں کرتے۔ چنانچہ آزاد لکھتے ہیں "آب حیات کا پہلا دور جس میں ولی اور ان کے قریب العصر باکمال جلسہ جمائے بیٹھے ہیں"۔[۱۳۶]

آزاد ایک تخیل پسند انسان ہیں۔ان کے ذہن میں ماضی و حال کا کوئی واقعہ، زندگی کی کوئی حقیقت یا کوئی علمی ادبی مسئلہ آجائے بس پھر ان کی قوت متخیلہ بیدار ہوکر اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور وہ واقعہ، حقیقت یا مسئلہ تجریدی حالت میں نہیں رہتا بلکہ ایک رنگین تصویری مرقع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔جس میں ماحول و فضا کی جزئیات، کردار اور اشخاص، ان کے حلیے اور لباس، ان کا اندازِ گفتگو، نشست و برخاست یہ سب باتیں بڑے توازن اور حُسن ترتیب سے نظر آتی ہیں۔ جزئیات نگاری کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> دیکھو جلسہ مشاعرہ کا امرا و شرفا سے آراستہ ہے۔معقول معقول بڈھے اور جوان لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں کوئی کٹاری باندھے ہے۔ کوئی سیف لگائے ہے۔بعض وہ کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے بعض ایسے ہیں کہ عالم جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رُخصت کیا تھا۔ اب کیوں کر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مذاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔ان شوخیوں سے انھیں کچھ مطلب نہیں ہے۔مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں۔[۱۳۷]

اس تصویر کا ہر نقش مکمل ہے۔عمر کے مطابق لباس، وضع قطع، طرز اور ذہنی کیفیات و احساسات ہر چیز اس تصویر میں دکھائی دیتی ہے۔آزاد کے بارے میں یہ کہنا بجا ہے کہ آزاد اگر مصوری کا فن اختیار کرتے تو شاید اپنے زمانے کے مانی و بہزاد ہوتے۔ لیکن مُوقلم اور رنگوں کی بجائے آزاد نے لفظی تصویریں بنائی ہیں۔جو نقشہ ان کے تخیل میں آتا ہے اُسے وہ کمال مہارت سے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔کہ مرقع کی جاندار متحرک اور جاذب نظر تصویر چلتی پھرتی، بولتی چالتی قاری کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

آزاد کی لفظی مصوری کا کمال ملاحظہ کریں:

> اِدھر تو یہ چونچال لڑکا شعراء کے جلسوں اور امراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں میں سب کے دل بہلا رہا تھا۔ اِدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دور بین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہَے مگر تربیت چاہتا ہَے تجویز ہوئی کہ جب وقت پر حکمرانی کرتے ہیں اس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔ [۱۳۸]

فورٹ ولیم کالج نے اُردو زبان کی پرورش کرنا چاہی۔ انگریزوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس ملک کی مشترکہ زبان بننے کی اہلیت صرف اُردو میں ہَے لیکن اُردو زبان اُس وقت تک شاعری تک محدود تھی۔ اس بات کو آزاد نے کس طرح خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

> ''یہ نظم اُردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا۔ جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے اور مضامین کی رائج الوقت دست کاری سے مینا کاری کی''۔ [۱۳۹]

آزاد کو مجرد کو مجسم بنا کر پیش کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ لکھتے ہیں:

> ''غرض جب اُن کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا''۔ [۱۴۰]

آزاد منظر نگاری میں بھی اپنی حیرت انگیز قوت بیان سے کام لیتے ہیں۔ کہ ایسا لگتا ہَے کہ وہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھر آگیا ہَے:

> ادھر گلاب کھلا۔ اُدھر بلبل ہزار داستان اُس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی۔ بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہچہے کرتی ہے اور گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہَے کہ بولتی ہَے، بولتی ہَے، بولتی ہے۔ حد سے زیاہ مست ہوتی ہَے تو پھول پر مُنہ

رکھ دیتی ہے ، اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتے رہ جاتی ہے۔تب معلوم ہوتا ہَے کہ
شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور
کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں وہاں گھروں میں نیم کیکر کے درخت تو ہیں نہیں سیب،
ناشپاتی ، بہی اور انگور کے درخت ہیں۔ چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آ بیٹھتی ہے اور
اس جوش وخروش سے بولنا شروع کرتی ہَے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے۔ وہ بولتی
ہَے اور اپنے زمزمے میں تانیں لیتی ہے اور اس زورشور سے بولتی ہے کہ بعض موقع پر
جب چہہ چہہ چہہ کر کے جوش وخروش کرتی ہَے تو یہ معلوم ہوتا ہَے کہ اس کا سینہ پھٹ
جائے گا ، اہلِ درد کے دلوں میں سُن کر درد پیدا ہوتا ہَے اور جی بے چین ہو جاتے
ہیں۔ میں ایک فصلِ بہار میں اُسی ملک میں تھا۔ چاندنی رات میں صحن کے درخت پر
آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا کیفیت بیان میں نہیں
آسکتی۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اُڑا دیا۔[۱۴۱]

آزاد کی منظر نگاری اور واقعیت بھی اُن کی مصوری کا حصّہ ہیں۔ جذبات واحساسات کی حرکت کے ساتھ ساتھ مصوری میں ڈرامائی اثر اور توانائی بھی ملتی ہے۔ وہ واقعات کو بیان نہیں کرتے، تخیل کی آنکھ سے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے زندگی کے کیف و رنگ اور حرکات وسکنات میں پیش کر دیتے ہیں ذیل کی عبارت دیکھیں:

تکبیر کی آواز سے برہمنوں اور پانڈوں کے دلوں میں گیان دھرم کی آگ سے
ایک دھواں اُٹھا اور راجپوتوں کے دلوں میں خون غیرت نے جوش مارا۔ دفعتاً
آگ بگولا ہو کر دوڑے۔ جو تیر انداز فصیل پر کھڑے تھے ان سے آتے ہی چھری
کٹاری ہو گئے۔ اور سب کو کاٹ کر نیچے گرا دیا۔ پھر تو اِدھر سے آتش بازی کے
بان اور رال کی ہانڈیاں تھیں۔ اور ادھر سے تیروں کی بوچھاڑ اور برچھیوں کی
بجلیاں عالم گردوغبار سے اندھیرا ہوگیا اورلڑائی برابر ترازو کا تول تلی ہوئی تھی
مگر قلعے کا پلہ بھاری تھا کہ اتنے میں شام نے آکر اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ

دی۔ دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر آئے شب خون کی روک تھام کا بندوبست ہوا۔حکم تھا کہ چراغ کا تو کیا ذکر ہے۔ آگ کی چنگاری تک نہ چمکنے پائے مگر دلوں کی بے قراری اور مایوسی کچھ کہی نہ جاتی تھی ادھر تو محمود کے لشکری سناٹے میں تھے کہ کہاں وہ کوہ و دشت پُر بہار اور خدائی گلزار کہاں یہ ریگستان بیابان، گھروں سے ہزاروں کوس آن پڑے۔ اللہ ہے جو پھر بھی اہل وعیال کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ روئے طمع سیاہ جس نے یہ دن دکھایا لوٹ کا لالچ نہ ہوتا تو کیوں اس بلا میں پڑتے کرتے تو کر بیٹھے مگر دیکھے کہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھے ادھر قلعہ بند بیچارے مصیبت کے مارے جانوں سے نراس بیٹھے تھے۔ اور کہتے تھے ''ہے نرنکار یہ آسمانی بلا کہاں سے آگئی ، ہم تو اپنے گھروں میں آرام سے رام رام کی سمرن جپتے تھے۔تو ہی اِس آفت کو ٹالے تو ٹالے،تیرے سوا کس کا آسرا ہے'' غرض دونوں طرف سناٹے کا عالم تھا۔۔۔[۱۴۲]

قوتِ بیان اور ڈرامائی انداز کی مثال ملاحظہ کریں:

اتفاقاً فوج کے جوان جوان بہادر جمع ہو کر سپہ سالار کے پاس آئے اور کہا کہ تقدیر سے یہاں آنا ہوگیا ہے نہیں تو ہم کہا ؟ اور یہ جنگل پہاڑ کہا۔ دنیا دیکھنے کے لیے ہے آخر مر جانا ہے۔ پہلو میں کوہ الورا کے قدیمی غار ہیں اور ان میں کسی زمانے کی عمارتیں ہیں جن کی دست کاریاں دیکھ کر صنعت الٰہی یاد آتی ہے ، اگر اجازت ہو تو جا کر دیکھ آئیں۔ سپہ سالار نے کہا جاؤ مگر دائیں بائیں سے ذرا ہوشیار جانا کہ دشمن کا گھر ہے اور ہر قدم پر خطر ہے۔غرض چند سردار اور کئی سو آدمی لشکر سے گئے۔ اب قدرت الٰہی کا تماشا دیکھو کہ یہ سب ہنستے بولتے آگے پیچھے چلے جاتے تھے۔ جو یکا یک سامنے کچھ سوار نظر آئے یہ گھبرائے کہ شاید دشمن دیوگڈھ سے مدد لے کر پھر پلٹا ، چنانچہ اپنی جمعیت کو ترتیب دیا اور سب سنبھل کر دفعتاً جا پڑے۔ ان بیچاروں کی حقیقت کیا تھی۔ ایک حملے میں تتر بتر ہو گئے ادھر

سے انہوں نے نوچ کھسوٹ مار دھاڑ شروع کر دی ایک سپاہی کو پنیں نظر
آئیں کہ کہار رکھ کر بھاگ گئے ہیں اور چند مرہٹیں ہتھیار بند آس پاس کھڑی ہیں
یہ للکار کر پہنچا اور تلوار کھینچ کر کہا کہ نکل آ اور نکال جو کچھ پاس ہے۔ ایک لونڈی
گھبرا کر چلائی کہ خبردار ہاتھ نہ اُٹھانا۔ جس کے لیے ہزاروں آدمی کے لہو پانی ہو
کر بہہ گئے وہ گوہر مقصود اسی میں ہے یعنی دیول دیوی کا سکھ پال ہے۔ [۱۴۳]

ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں جس میں قوتِ بیان اور ڈرامائیت کا حسین امتزاج ہے:

دفعتاً ہوا بند ہوئی ، ابر سا گھر آیا ، دُنیا دھواں دھار ہوگئی ، پھر سفید غبار سا برستا
معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر کوٹھوں پر ، دیواروں پر اور منڈیروں پر
کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات
گزری صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک
جھکولا اَور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں
جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں ،
جیسے کسی نے کپڑے اُتار لیے۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسے بجلی مارا لوہا۔ ایک دو دن
بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دھنک رہا
ہے۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار زمین آسمان تمام سفید۔ وہ
سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشہ کی شاخیں ہوگئیں۔ [۱۴۴]

اس تصویر کشی میں وہ ڈرامائی عمل اور تیزی ہے جو خود برف باری میں ہوتی ہے۔ اس تصویر
کشی میں مشاہدہ اور تخیل دونوں ہی کارفرما ہیں۔ آزاد اپنے موضوع کی مناسبت سے براہِ راست
تصویر کشی کرتے ہیں۔ آزاد چھوٹی چھوٹی اور علامتی تصویریں بناتے ہیں ان کی کتاب ''نیرنگِ خیال''
میں اِس قسم کی کئی تصویریں ملتی ہیں۔ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار میں'' آزاد نے ایک دربار
سجایا ہے۔ جس میں مذہبی رہنماؤں اور دین کے بانیوں کو چھوڑ کر باقی سب نامور لوگوں کو باری باری

لائے ہیں۔اور انھیں ان کے مقام اور رتبے کے مطابق کرسی نشین کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> اِس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کا غذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔[۱۴۵]

اِس میں آزاد نے لفظی تصویروں سے ایک ایسا منظر نامہ تیار کیا ہے۔جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ دربار میں ہر آنے والے کی صفات و خصوصیات کو ایسے لطیف اشاروں میں اُجاگر کرتے جاتے ہیں کہ قاری فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اگلا دربار میں آنے والا کون ہے۔ اِس اقتباس میں اگر آخر میں یہ نہ بھی لکھا ہوتا کہ ''وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی'' تو پھر بھی قاری کو پتہ ہوتا کہ جس صاحب کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ کون ہے۔بعض موقعوں پر آزاد تشبیہہ و استعارہ اور تلازمے کا سہارا لیے بغیر روزمرہ اور محاوروں سے کام لیتے ہیں۔

> جب اس ہمت مردانہ سے کہ جس پر ہزار جواں مردوں کو صدقہ کر ڈالتے، عورتوں نے یہ ساکھا کیا تو سب کا دل زندگی سے بیزار ہوگیا۔ راجہ رہے سہے رفیقوں کو لے کر اوّل قلعے کے میدان میں کھڑا ہوا۔ دل غم سے پانی پانی تھا اور نگاہوں سے خون ٹپکتا تھا۔مگر نہ آنکھ سے آنسو نکلتا تھا نہ منہ سے بات نکلتی تھی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے رُخصت ہوا، سب سے آگے راجہ اور پیچھے تمام جان نثار جن میں سپاہی اور سردار، سب برابر ہو رہے تھے۔ قلعے سے بھاگیں اُٹھائے نکلے اور ان گنتی کی جانوں کوگٹھڑی کر کےلشکر شاہی کے دربار میں دے مارا۔ اگرچہ دیکھنے والوں کے نزدیک ان کی وہ حالت ہوئی کہ کوئی ایک مٹھی خاک

کی طوفان نوح میں پھینک دے۔مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ جب تک چاند سورج باقی ہیں۔ ان مردوں کے نام آسمان مردانگی پر آفتاب مہتاب ہو کر چمکیں گے۔[۱۴۶]

اس میں آزاد نے روزمرہ اور محاورہ سے کا م لیا ہَے ، اس میں استعاروں کا استعمال نہیں ہے نہ ہی اس میں کوئی رنگ آمیزی ہے۔لیکن اِس پورے منظر کا تاثر بڑا زبردست ہے۔اس میں سادگی ہَے لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ اس میں بلا کی قوت پوشیدہ ہَے اس میں کسی شعوری کوشش کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہ سادگی اور بے ساختگی آزاد کی انشا پردازی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آزاد کو اُردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔الفاظ کے انتخاب میں آزاد نے جس سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔اِس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ روزمرہ ، محاورہ اور سادگی ان کے یہاں اس طرح نمایاں ہے۔جس طرح رنگینی اور نازک خیالی ، آزاد موقع محل کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ آزاد کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی آزاد کی انشا پردازی کے بارے میں لکھتے ہیں:

آزاد کا ذخیرہ الفاظ بڑا وسیع تھا۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہَے کہ ذخیرہ الفاظ کے سلسلے میں اُردو کا کوئی انشا پرداز آزاد کے مقابلے پرنہیں آتا انہوں نے جتنے الفاظ استعمال کئے ہیں شائد ہی کسی انشا پرداز نے اتنے الفاظ استعمال کیے ہوں۔سب سے بڑی بات یہ ہَے کہ آزاد نے ہر لفظ پر بذات خودغور کیا ہے۔ اس کی مناسبت اورموسیقی کو مدِنظر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی نثر میں موسیقی کا بڑا دل کش آہنگ ملتا ہے۔ محاورے ضرب الامثال۔ روزمرہ و فصاحت اور بلاغت یہ سب آزاد کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ اِن کی زبان میں حُسن ۔قوت اور رنگینی ہے۔ اورپھر ان کا انداز عام طور پر سہل ممتنع ہَے رنگینی اورسلاست کو ایک جان کرنابڑا مشکل ہَے رنگینی کے ساتھ ساتھ دقت پسندی کا تصّور بھی ذہن میں اُبھرتا ہے۔ رنگینی اور دقت پسندی عام طور پر

لازم وملزوم سمجھی جاتی ہیں لیکن آزاد کی رنگینی میں سلاست ہر جگہ موجود ہے۔ اُن کی انشا پردازی دقت پسندی کے شائبے سے پاک ہے۔ اس میں بہتے ہوئے دریا کی روانی ہے شعلے کی سی لپک ہے یہ روانی اور تیزی زبان پر حیرت انگیز قدرت کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے۔ آزاد کی زبان میں کلاسیکی رچاؤ اور تہذیبی شعور ہے۔ لسانی مفکر ہونے کی وجہ سے انہیں زبان کے ارتقاء کا صحیح اندازہ اور احساس تھا۔ وہ اُردو کو اس کے سرچشمے سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اِس بناء پر اُنہوں نے بڑی پاکیزہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ زبان اِن کا مؤثر ترین حربہ ہے۔ [۱۴۷]

آزاد اُردو کے اوّلین محقق ، ادبی مؤرخ ، نقاد ، لسانی مفکر ، پروفیسر ، تعلیمی مصنف ، بہترین مکتوب نگار ، جدید اُردو شاعری کے معمار اوّل، ادبی ڈرامہ نگار اور عظیم انشاء پرداز ہیں۔ آزاد کی ادبی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں اِس شخصیت کا جو پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے ایک نیا رنگ لے کر آتا ہے۔ لیکن انشاء پردازی کا پہلو اِن کی شخصیت کا اہم پہلو ہے۔ آزاد اُردو ادب کے صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں اور ان کا اُسلوب اُردو زبان میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

١ آغا، سلمان باقر، ''محمد حسین آزاد حیات، شخصیت، فن'' سنگ میل لاہور، ١٩٨١ء، ص ٩

٢ محمد صادق، ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' مجلس ترقی ادب لاہور، ١٩٧٦ء، ص ٩

٣ سلیم اختر، ڈاکٹر، '' اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' سنگ میل پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور، ١٩٧١ء۔١٩٨٣ء، ص٢٠٣

٤ صدیقی، محمد عتیق، ''صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات'' انجمن ترقی اُردو ہند علیگڑھ، ١٩٦٢ء، ص ١٠٠ (حاشیہ)

۵ امداد صابری، ارشاد المومنین ص ٧ بحوالہ '' تاریخ صحافت اُردو'' (جلد اوّل) دہلی، ١٩٥٣ء، ص ١٢٢

٦ ''رجسٹرڈ نیوز پیپرز'' بحوالہ، ایضاً

٧ محمد شفیع، مولوی، ''مقالات'' (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور، ١٩٧٢ء، ص١١٢

٨ آغا، محمد اشرف، '' آب حیات کے لطیفے'' لاہور، ١٩٤١ء ص ٧

٩ '' محمد حسین آزاد احوال و آثار'' مجلس ترقی ادب، لاہور، ١٩٧٦ء، ص١٤

١٠ محمد اکرام چغتائی، مقالہ محمد حسین آزاد '' نئے دریافت شدہ ماخذ کی روشنی میں'' سنگ میل پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور، ١٩٧١ء۔١٩٨٣ء، ص ٢٢

١١ آفتاب جوئیہ، میاں، مولانا محمد حسین آزاد، ماہ و سال کے آئینے میں، ''راوی، مولانا محمد حسین آزاد نمبر'' گورنمنٹ کالج لاہور، ١٩٨٣ء، ص ٣

۱۲ اسلم فرخی ، ڈاکٹر ، ''محمد حسین آزاد ، حیات اَور تصانیف'' (حصہ اوّل) ، انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۸۱

۱۳ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی ، سید، ''مکاتیب آزاد'' مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۱۴ بحوالہ ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۱۵

۱۵ ایضاً ، ص ۱۵

۱۶ ''محمد حسین آزاد نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں'' ، ص ۲۲

۱۷ صدیقی، محمد عتیق ، دہلی اُردو اخبار ۱۸۵۲ء بحوالہ ''صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات'' ، علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۱۰۰

۱۸ ایضاً ، ص ۱۰۱

۱۹ ''محمد حسین آزاد نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں'' ، ص ۲۳

۲۰ مولوی عبدالحق ، ڈاکٹر ، ''مرحوم دہلی کالج'' انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی (بار دوم) ۱۹۴۵ء ، ص ۴۵

۲۱ ایضاً ، ص ۴۵

۲۲ ایضاً ، ص ۴۶

۲۳ ''صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات'' ، ص ۱۸۲۔

۲۴ افتخار عالم، سید ماہروی ، ''حیاۃ النذیر'' بھوپال ۱۹۱۲ء ، ص ۳۴

۲۵ ''محمد حسین آزاد حیات وتصانیف'' ، ص ۸۶ ، نیز مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد ، ص ۹۴

۲۶ ''مرحوم دہلی کالج'' ، ص ۲۶

۲۷ آزاد ، محمد حسین ، ''دیوان ذوق'' مطبع اسلامیہ لاہور، ۱۸۹۲ء ، ص ۱۵۴

۲۸ ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۱۹۔۲۳

۲۹ ''دیوان ذوق'' ص ۴۶

۳۰ ایضاً ،ص ۲۲۵

۳۱ ایضاً ،ص ۲۹

۳۲ ''محمد حسین آزاد نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں'' ص ۲۵

۳۳ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' ص ۹۷

۳۴ ایضاً

۳۵ ''محمد حسین آزاد نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں'' ص ۲۵

۳۶ صدیقی، محمد عتیق ، دہلی اُردو اخبار بحوالہ'' اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اخبار اور دستاویزیں'' ، مکتبہ شاہراہ اُردو بازار دہلی ۱۰ مئی ۱۹۴۴ء ، ص ۹۵

۳۷ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ، ص ۱۰۳

۳۸ ''محمد حسین آزاد

احوال و آثار'' از ڈاکٹر محمد صادق مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۷۶ء ص ۲۴

۳۹ ایضاً

۴۰ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ص ۱۶۱

۴۱ ''مرحوم دہلی کالج'' ص ۶۱

۴۲ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ، ص ۷۱

۴۳ ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۳۲۔۳۳ نیز ''آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین'' از ڈاکٹر محمد صادق ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۳ء ، ص ۵۱

۴۴ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ص ۷۴۔۷۵

۴۵ ''مرحوم دہلی کالج'' ص ۶۱

۴۶ آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات، مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح'' ۲۰۰۱ء
ص ۴۶۸

۴۷ محمد طفیل، ''نقوش شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء'' ادارہ فروغ اُردو لاہور، ص ۱۱۔

۴۸ ''مقدمہ دیوان ذوق'' ص ۲۹

۴۹ ''نقوش شخصیات نمبر'' مولانا محمد حسین آزاد، جنوری ۱۹۵۵ء، ادارہ فروغ
اُردو لاہور ص ۱۰

۵۰ ایضاً

۵۱ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ص ۷۶۔۷۷

۵۲ ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص ۳۴

۵۳ آغا، طاہر نبیرہ آزاد، ''مکتوبات آزاد'' یعنی جناب شمس العلماء مولوی محمد حسین
آزاد دہلوی، ۱۹۲۷ء ص ۱۵۵

۵۴ ''نقوش شخصیات نمبر'' مولانا محمد حسین آزاد، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۱۳

۵۵ ایضاً، ص ۱۳

۵۶ ''رسالہ انجمن پنجاب'' مئی ۱۸۶۹ء ص ۱۱۔۱۴

۵۷ ''محمد حسین آزاد نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں'' ص ۴۶

۵۸ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ص ۳۶۵

۵۹ ایضاً، ص ۳۵۹

۶۰ ''نقوش شخصیات نمبر'' مولانا محمد حسین آزاد، ص ۱۶

۶۱ ''نقوش شخصیات نمبر'' مولانا محمد حسین آزاد، ص ۱۶

۶۲ ایضاً

۶۳ ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۱۴

۶۴ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ص ۸۱

٦٥ ''کلیات مولانا محمد حسین آزادؔ'' لاہور بک ٹاک ۲۰۰٦ء ص ۴۰۰

٦٦ امداد صابری ،'' تاریخ صحافت اُردوؔ'' چوڑیوالاں دہلی (جلد اوّل) یکم جنوری ۱۹۵۳ء ، ص ۱۲۱

٦۷ ایضاً ، ص ۱۲۴

٦۸ ایضاً ، ص ۱۲۲

٦۹ '' اُردو دائرہ معارف اسلامیؔ'' (جلد ۱) لاہور پنجاب یونیورسٹی ، ۱۹٦۴ طبع اوّل ، ص ۱۱۰

۷۰ '' اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اخبار اور دستاویزیں'' ص ۹۵

۷۱ '' مرحوم دہلی کالج'' ص ٦۱

۷۲ '' نقوش شخصیات نمبر'' ص ۱۱ نیز '' مکتوباتِ آزادؔ'' ص ۱۱۵

۷۳ '' محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ص ۱۲۴

۷۴ ایضاً

۷۵ ایضاً ، ص ۱۲۹

۷٦ ایضاً ، ص ۱۳۲

۷۷ '' راوی'' مولانا محمد حسین آزاد نمبر ، گورنمنٹ کالج لاہور ، ۱۹۸۳ء ، ص ۴

۷۸ ایضاً

۷۹ '' محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص نیز '' کلیات مولانا محمد حسین آزادؔ'' لاہور بک ٹاک ۲۰۰٦ء ، ص ۴۰۰ ، ۸

۸۰ '' راوی'' مولانا محمد حسین آزاد نمبر ، ص ۳

۸۱ '' محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) ، ص ۱۹۴

۸۲ ایضاً ۲۰۵

۸۳ ایضاً ۲۱۲

۸۴ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف''، ص ۲۱۳

۸۵ ''راوی'' مولانا محمد حسین آزاد نمبر، ص ۵

۸۶ ایضاً ، ص ٦

۸۷ آغا، طاہر نبیرہ آزاد، ''مجموعہ مکتوبات آزاد'' ص ۹۴

۸۸ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف''، ص ۱۴۹

۸۹ سر سید احمد خان، ''مضامین تہذیب الاخلاق'' (جلد دوم)، سال تالیف مذکور نہیں، ص ۵۵۵۔۵۵٦

۹۰ مہدی آفادی، ''افادات مہدی'' یعنی ایم مہدی حسین مرحوم افادی الآفادی کا مجموعہ مضامین مرتب مہدی بیگم شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور، طبع چہارم ۱۹۴۹ء، ص ۲۱۳

۹۱ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (جلد دوم)، ص ۲۰۷

۹۲ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''ادبی زاویے'' مجلس فروغ تحقیق اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵

۹۳ ایضاً

۹۴ ''راوی'' مولانا محمد حسین آزاد نمبر، ص ۲۰۵

۹۵ مہدی آفادی، ''افادات مہدی'' یعنی ایم مہدی حسین مرحوم افادی الآفادی کا مجموعہ مضامین مرتب مہدی بیگم شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور طبع چہارم ۱۹۴۹ء، ص ۲۱۳

۹٦ ''آب حیات'' ص ۱۴

۹۷ آزاد، محمد حسین، ''دربار اکبری'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۲۷

۹۸ رجب علی بیگ سرور، ''فسانہ عجائب'' مرتب رشید حسن خاں نقوش اُردو بازار لاہور، اپریل ۱۹۹۰ء، ص ۳۹۔۴۰

۹۹ '' تاریخ صحافت اُردو'' (جلد اوّل) یکم جنوری ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۵

۱۰۰ '' اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء)''، اخبار اور دستاویزیں، ص ۹۱

۱۰۱ دہلی اُردو اخبار، بحوالہ '' اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اخبار اور دستاویزیں''، ص ۱۲۱

۱۰۲ ایضاً، ص ۱۳۱

۱۰۳ '' نصیحت کا کرن پھول'' آزاد بک ڈپو دہلی، سال تالیف مذکور نہیں، ص ۳۳

۱۰۴ ایضاً ، ص ۴

۱۰۵ ایضاً ، ص ۴

۱۰۶ ایضاً، ص ۴۴۔۴۵

۱۰۷ ایضاً، ص ۳۴

۱۰۸ ایضاً، ص ۳۵

۱۰۹ ایضاً ، ص ۶۶

۱۱۰ '' محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف'' (جلد دوم) ۱۹۶۵ء، ص ۲۷۶

۱۱۱ آزاد، محمد حسین، '' قصص ہند''، بک ٹاک لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰

۱۱۲ ایضاً ، ص ۹

۱۱۳ ایضاً ، ص ۲۱

۱۱۴ ایضاً ، ص ۶۸

۱۱۵ آزاد، محمد حسین، '' سخن دان فارس'' (حصہ اوّل) از پیش لفظ محمد صادق، ڈاکٹر، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱۔۳۲

۱۱۶ '' سخن دان فارس''، ص ۱۷۱۔۱۷۲

۱۱۷ ایضاً ،ص ۲۰

۱۱۸ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ، سید، ''مکاتیب آزاد'' مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۱۹۱

۱۱۹ ایضاً ،ص ۲۱۵

۱۲۰ ایضاً ، ص ۲۵۸

۱۲۱ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (جلد دوم) ص ۶۷۸

۱۲۲ آزاد ، محمد حسین ، ''نیرنگِ خیال'' بک ٹاک میاں چیمبرز ، ٹمپل روڈ ، لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۴۱

۱۲۳ آزاد ، شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب، ''نظم آزاد'' مفید عام پریس ، لاہور، ۱۸۹۹ء، ص ۳

۱۲۴ '' آب حیات'' ص ۱۱

۱۲۵ '' دربارِ اکبری'' ص ۶۴

۱۲۶ ایضاً ،ص ۲۲۴

۱۲۷ ایضاً

۱۲۸ ایضاً

۱۲۹ ''قصص ہند'' ص ۴۱

۱۳۰ ایضاً ، ص ۹۴۔۹۷

۱۳۱ ''دربارِ اکبری''، ص ۲۷

۱۳۲ '' آب حیات'' ص ۹۲

۱۳۳ ایضاً ،ص ۲۲۴۔۲۲۵

۱۳۴ ایضاً ، ص ۱۳

۱۳۵ ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۵۳

۱۳۶ '' آب حیات'' ص ۱۵

۱۳۷ آزاد، مولانا محمد حسین، ''آبِ حیات، مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح'' ۲۰۰۱ء
ص ۹۴

۱۳۸ ایضا ، ص ۳۰۔۳۱

۱۳۹ ایضاً ،ص ۸۴

۱۴۰ ایضاً ،ص ۸۷

۱۴۱ ''سخن دان فارس'' ص ۳۰۷۔۳۰۸

۱۴۲ ایضاً، ص ۱۷۔۱۸

۱۴۳ ''قصص ہند'' ص ۴۰

۱۴۴ ''سخن دان فارس'' ،ص ۳۱۴

۱۴۵ ''نیرنگِ خیال'' ص ۹۰

۱۴۶ ''قصص ہند'' ص ۳۶۔۳۷

۱۴۷ ''مولانا محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (جلد دوم) ،ص ۲۰۹۔۲۱۰

باب چہارم

مکاتیب آزاد کا تحقیقی مطالعہ

مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات کے تین مجموعے کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں ۔

مکتوبات آزاد شائع کردہ مرغوب ایجنسی لاہور ۱۹۰۷ء

''مکتوبات آزاد'' مولانا محمد حسین آزاد کے خطوں کا یہ مجموعہ سرعبدالقادر کی تحریک اور سید حسن بلگرامی کی محنت سے ۱۹۰۷ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔مکتوبات آزاد کو شیخ عبدالقادر نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً چھ سات مہینے تک جاری رہا۔اس کے بعد کتابی صورت میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ چونکہ اِس کے پہلے ایڈیشن کا ایک بھی نسخہ باقی نہیں رہا تھا ، دوسری دفعہ یہ مجموعہ شیخ عبدالقادر صاحب بی ۔اے پبلک پراسیکیوٹر لائل پور کی اجازت سے ''مرغوب ایجنسی لاہور'' سے چھپا۔اِن دونوں اشاعتوں کا دیباچہ '' سید جالب دہلوی'' نے لکھا ہے ۔ اِس مجموعے میں موجود کل ۲۸ مکتوب ہیں۔ یہ خطوط ایک ہی شخص میجر سید حسن بلگرامی کے نام ہیں۔جو ان دنوں ملازمت کے سلسلے میں امرتسر میں تھے یہ زمانہ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۴ء تک کا ہے ۔

میجر سید حسن بلگرامی نواب عمادالملک کے سوتیلے اور سید علی بلگرامی کے حقیقی بھائی تھے اور مشہور خاندان بلگرامی کے اہم رکن تھے ۔ آپ انڈین میڈیکل کالج کے سند یافتہ تھے اور ایک عرصے تک فوجی ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ پہلے زیادہ تر فوج کے ساتھ رہے بعد میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر انگلستان چلے گئے اور طویل عرصے تک انگلستان میں رہے ۔۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں وہ انگلستان سے واپس آ گئے اور علی گڑھ میں مقیم ہوئے ۔

مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد

دوسرا مجموعہ ''مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد ہے۔ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد نے یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اِس مجموعے میں لالہ دنی چند کے نام لکھے گئے خطوں کی تعداد بتیس (۳۲) ہے۔ دین محمد کے نام چھ، ناصر نذیر فراق دہلی کے نام پانچ خط اور ڈاکٹر لائٹر کے نام خط اور درخواستوں کے علاوہ چند دیگر تحریریں بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کل ایک سو ایک تحریروں پر مشتمل ہے۔

بتیس (۳۲) خطوں کے مکتوب الیہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے عزیز ترین شاگرد لالہ دنی چند ہیں۔ لالہ دنی چند جگراؤں ضلع لدھیانہ کے رئیس تھے اور اِن کا پیشہ وکالت تھا۔ وکیل ہونے کی وجہ سے انھیں سیاست سے گہری دلچسپی تھی، کانگریس کے مشہور لیڈر تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد سے لالہ دنی چند کی عقیدت اس وقت شروع ہوئی جب مولانا ۱۸۵۹ء میں ریاست جیند کی ملازمت ترک کر کے سید رجب علی ارسطو جاہ کے پریس اور اخبار ''مجمع البحرین'' میں پرنٹر اور پبلیشر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور جگراؤں میں قیام پذیر تھے۔

لالہ دنی چند نے مولانا سے تعلیم حاصل کی اور مولانا ہی کی زیر نگرانی لاہور میں رہے۔ لالہ دنی چند کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد مولانا محمد حسین آزاد اِن کی ملازمت اور ترقی کے لیے برابر کوشش کرتے رہے۔ لالہ دنی چند مولانا محمد حسین آزاد سے بُہت محبت کرتے تھے۔ ان کی محبت اور قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ مولانا کے خطوط اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اور ان کو باعث برکت جانتے تھے۔ آغا محمد طاہر کو لالہ دنی چند نے یہ خطوط اپنے بیٹے کے ہاتھ بھجوائے تھے، اور ساتھ یہ بھی لکھ کر دیا تھا ''یہ خط میرے شفیق استاد کی یادگاریں اور میرے گھر کی خیر و برکت انھی سے وابستہ ہَے۔ میں اِنھیں اپنی زندگی میں اپنے سے الگ نہیں کرسکتا''۔[1] اِن مکتوبات کی خط و کتابت کا زمانہ ۱۸۷۴ء سے ۱۸۷۷ء کا ہَے۔ اِن دنوں مولانا محمد حسین آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔

مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی

تیسرا مجموعہ ''مکاتیب آزاد از مولانا محمد حسین آزاد مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی'' ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۶ء میں پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور سے چھپا۔اس مجموعے میں ''مکتوبات آزاد'' جسے مرغوب ایجنسی لاہور نے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا تھا اور ''مکتوبات آزاد مرتبہ آغا طاہر نبیرہ آزاد'' جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئے تھے ، یہ دونوں مجموعے بھی شامل ہیں۔ سید جالب دہلوی کا دیباچہ زیرِنظر مجموعے ''مکاتیب آزاد'' اور مجموعہ ''مکتوبات آزاد'' جو مرغوب ایجنسی نے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا تھا ، دونوں میں موجود ہے ۔سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی اپنے مرتبہ مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مجموعے میں شائع شُدہ خطوط تو خیر موجود ہی ہَیں ۔ان کے علاوہ تقریباً پینتیس نادر تحریروں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ تحریریں تاریخی لحاظ سے بُہت اہم ہیں ، مثلاً مولوی معصوم علی صاحب کے نام فارسی کے دو خط ہَیں ۔ جن سے مولانا کے ریاست جیند میں قیام اور لودھیانے کی آمد کے متعلق نہایت مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اِسی طرح حاجی بنے صاحب اور نواب حسین مرزا صاحب کے نام چار خط ہَیں۔ جن سے مولانا آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم صاحب کی شادی اور مولانا کی خوشی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ سرسالار جنگ کے نام فارسی کا ایک خط ہَے ۔ اور ایک سپاس نامہ بھی ہے۔ جو سالار جنگ نے پڑھا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مولانا کے سرسالار جنگ سے گہرے روابط تھے۔ کچھ محکمانہ اور سرکاری مراسلات ہیں ، جو مولانا کی مصروفیات کا مواد فراہم کرتے ہَیں ۔[۲]

مولانا محمد حسین آزاد کے خطوں پر مبنی یہ تین مجموعوں کے شائع ہونے کا عرصہ تقریباً اُنسٹھ (۵۹) برس کا ہے۔ آخری مجموعے میں مرتب کے بقول آزاد کے شائع شدہ تمام خطوط شامل ہَیں۔ اِن خطوط اور رقعات کی تعداد ایک سو پچیس (۱۲۵) کے قریب ہَے ۔جن میں مولانا محمد حسین آزاد کے سات (۷) فارسی خط بھی شامل ہَیں۔ گیارہ کے قریب متفرق تحریریں ہیں ۔ ایک عرضی ہَے۔

جس پر ڈاکٹر لائٹنر کا انگریزی میں لکھا ہوا نوٹ بھی شامل ہے۔ اِس طرح ''مکاتیب آزاد'' میں ایک سو چھتیس (۱۳۶) تحریریں ہیں۔ اِس مجموعے میں خطوں کو مکتوب الیہ کے اعتبار سے مرتب نہیں کیا ہے بلکہ تاریخ وار رکھا گیا ہے۔مولانا محمد حسین آزاد کے خطوں پر مبنی تین مجموعوں میں اُن کا قدیم ترین خط ''بنام معصوم علی، دسمبر ۱۸۵۹ء کا ہَے۔ یہ خط معصوم علی کے نام فارسی میں لکھا ہوا ہے۔ اور اُردو میں لکھا ہوا قدیم ترین خط بنام میجر فلر صاحب ہَے جو ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب تھے یہ خط مولانا محمد حسین آزاد نے ۲۵ مئی ۱۸۶۱ء میں لکھا ہَے۔ فارسی میں لکھا ہوآخری خط'' بنام لالہ دنی چند'' ۲۴ اپریل ۱۸۷۵ء کا ہَے اور اُردو میں تحریر کردہ آخری خط''بنام منشی ذکاء اللہ'' ۱۸۹۲ء کا ہَے۔ سید مرتضٰی حسین فاضل کے مرتبہ مجموعے میں مولانا محمد حسین آزاد کی زندگی ،سِنین میں اور ''مطبوعہ تالیفات محمد حسین آزاد'' کی فہرست بھی درج ہے۔ پیش لفظ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی نے لکھا ہے۔ سب سے زیادہ خط لالہ دنی چند اور میجر سید حسن بلگرامی کے نام لکھے ہوئے ہَیں۔ اُس کے بعد ڈاکٹر لائٹنر ،حکیم محمد دین اور سید ناصر نذیر فراق کے نام آتے ہیں۔میجر سید حسن بلگرامی کے نام جتنے بھی خط لکھے گئے ہیں اُن کا زمانہ تحریر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۴ء تک کا ہَے۔اس زمانے میں آزاد ''دربار اکبری'' کو مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ ''ڈراما اکبر'' بھی زیرِ غور تھا۔ یہی وجہ ہَے کہ سید حسن بلگرامی کے نام خطوں میں مولانا آزاد نے بار بار دربار اکبری اور ''ڈراما اکبر'' کا ذکر کیا ہے۔ میجر سید حسن بلگرامی کے نام خط میں عدیم الفرصتی کی شکایت اس طرح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> تسلیم! عنایت نامہ باعث اعزاز ہوا، رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہَے ، دل دربار میں ہَے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے مجھے کہاں؟ [۳]

دل دربار میں ہَے سے مراد'' دربار اکبری'' ہَے۔ ایک اور خط میں اپنی مصروفیت کے بارے میں لکھتے ہیں'' خدا اِس دربار سے فارغ کردے تو آپ سے سرخ رو ہوں'' [۴] ''دربارِ اکبری کاتب سے لکھواتا ہوں ،آپ بھی لکھ رہا ہوں خدا کرے کچھ ہو جائے''۔ [۵]

''اَب آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ دربار مذکور کو اگر چہ طبع نیرنگِ خیال ، اور ''آب حیات'' کے سبب سے آج کل ملتوی کر دیا ہے۔ مگر تمام مسودے پہلو میں دھرے ہیں''۔[6]

لاہور و امرت سر کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں ہے اُس سے بھی تو پوچھو وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفیٰ دے دیا ہے۔ وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربارِ اکبری لکھ رہا ہے۔[7]

''پھر دربارِ اکبری ہَے اور میں ہوں''۔[8]

''دربارِ اکبری کو لپٹ رہا ہوں ، مگر دو ہی دِن جم کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا''۔[9]

برابر خطوط چلے آتے ہیں کہ فرمایئے دربارِ اکبری کا کیا حال ہے۔ قند پارسی (گفتگوے فارسی) کا کیا حال ہے۔ لکچروں کا کیا حال ہے۔ ؟ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہَے۔[10]

میجر سید حسن بلگرامی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں اِن کو زیادہ تر اپنی تصنیفات و تالیفات کے بارے میں لکھا ہے۔ اُن دِنوں آزاد کی تصنیف ''آب حیات ، نیرنگِ خیال اور سخن دان فارس بھی چھپ چکی تھیں۔ آب حیات کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کو خطوط آرہے تھے۔ مولانا آزاد نے میجر حسن بلگرامی کو ایسے ہی ایک خط کا جواب لکھا ہے:

''آب حیات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہَے ، فقط قدر افزائی ہَے ، ورنہ من آنم کہ من دانم''۔[11]

اسی طرح نیرنگِ خیال ، اور آب حیات کے سلسلے میں ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دربار مذکور کو اگر چہ طبع ''نیرنگِ خیال'' اور ''آب حیات'' کے سبب سے آج کل ملتوی کر دیا ہے''۔[۱۲]

''آب حیات نے مجھے ہلاک کر دیا ہے''۔[۱۳]

''میرا حال یہ ہے کہ تقریباً ۸ دن ہوئے ہوں گے آب حیات اور نیرنگِ خیال سے چھٹکارا ہوا''۔[۱۴]

''بارہ دن کا عرصہ ہوا کہ ایک نسخۂ آب حیات ،طبع جدید بذریعہ عریضۂ نیاز ارسالِ خدمت کیا ہے''۔[۱۵]

''دو نسخے آب حیات ، حیدر آباد کو روانہ کر دیئے اور آپ کے بھائی صاحب کو عریضہ لکھ دیا کہ ایک نسخہ اپنے کتب خانے میں رکھیں'' ۔[۱۶]

''معلوم نہیں کہ آب حیات حضور عالی کے ملاحظے سے بھی گذرا ہے یا نہیں۔ اگر مناسب جانیں تو ذرے کو خورشید تک پہنچائیں''۔[۱۷]

''مدت گزر گئی کہ خدمت سے مقصر ہوں مگر عالم مجبوری ہَے کہ آب حیات میں غوطے کھا رہا ہوں''۔[۱۸]

سخن دان فارس کے متعلق لکھتے ہیں:

سخن دان فارس مشتہر نہیں ہوا۔ جو میرے اِس مختصر فقرے کا مفصّل مزا آجاتا۔۔۔ میں نے سخن دان فارس کو نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہا اب دربارِ اکبری کو سنبھالوں ،مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی ۔ کیونکہ اُستاد مرحوم شیخ

ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں قصیدے ترتیب دینے والا میرے سوا دُنیا میں کوئی نہیں۔[۱۹]

آزاد نے سید حسن بلگرامی کے نام خط میں اپنی اِس خواہش کا بھی اِظہار کیا ہے۔ کہ وہ اپنی تصنیف ''دربارِ اکبری'' کو سر سالار جنگ اوّل کے نام معنون کرنا چاہتے تھے لیکن سالار جنگ اِس کتاب کے طبع ہونے سے پہلے ہی وفات پا گئے اور جب دربارِ اکبری شائع ہوئی تو اس وقت آزاد بھی عالم ہوش میں نہ تھے۔ آزاد کے بعض مکتوبات میں انتساب کی خواہش کا اِظہار ہوتا ہے۔ سید حسن بلگرامی کے نام ایک خط میں آزاد اِس انتساب کے بارے میں لکھتے ہیں:

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اِس کے اپنی زبان سے اُن کے سامنے پڑھتا اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے۔ ہائے سر سالار جنگ! سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔ ہائے سر سالار جنگ!۔[۲۰]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم و مغفور کی ہوچکیں۔ خدا گواہ ہے مجھے اُن سے غائبانہ عشق تھا۔ پہلے لکھتا تو خوشامد تھی اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان معاملہ ہے''۔[۲۱]

اسی طرح ایک اور خط میں حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

''خدا اِس مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مراتب قربت عطا کرے! اگر وہ زندہ ہوتا تو ان چھٹیوں میں خود جاتا اور سناتا ، جب دِل کا ارمان نکلتا ، کیوں کہ میں دیکھتا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس کس مقام پر کیا رائے لگاتے ہیں''۔[۲۲]

''میں نے کہا مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا نہ میں کسی قابل ہوں ، اتنا ہے کہ دربارِ اکبری درست کر رہا ہوں ، یہ ان کے نام کر دوں گا''۔[۲۳]

سید حسن بلگرامی کو زیادہ تر اپنی مصروفیت کے بارے میں لکھا ہے۔۱۸۸۲ تا ۱۸۸۴ء کا زمانہ آزاد کی زندگی کا مصروف ترین زمانہ تھا۔اُن دنوں ایک طرف آزاد دربارِ اکبری کی ترتیب میں مصروف تھے تو دوسری طرف کالج والوں نے کالج کا کورس بنانے کی ذمہ داری بھی آزاد کو دے دی۔لہٰذا آزاد اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> میں آج کل عجب مخمصے میں پڑ گیا۔۔۔اِدھر مجھے کورس وغیرہ کا مرض لگ گیا، اُدھر کالج کا تردد کہ دفعتًا معلوم ہوا، آبِ حیات اور نیرنگِ خیال امتحان یونیورسٹی میں داخل ہو گئی ہیں اور امتحان آغاز مئی پر ہو گا۔ سب نے کہا کہ دونوں کو ضرور چھپوانا چاہیے۔۳، ۴ سو طالب علم دفعۃً طلب گار ہوگا۔ مجھے بھی طمع نے للچایا اور فوراً! شروع کر دیا۔ اگر نہایت کوشش ہو اور کارگر بھی ہو اور کئی چھاپہ خانوں سے کام لیا جائے تو دو مہینے چاہئیں۔خیر اب تو پھنس گیا۔ دو دو ہزار چھپوانے شروع کیے ہیں۔[۲۴]

آزاد کو اُن دِنوں بُہت محنت کرنا پڑتی تھی۔آزاد کو آبِ حیات کے دوسرے ایڈیشن پر بھی بڑا کام کرنا پڑا۔ اِس ایڈیشن میں آزاد نے بُہت سے مفید اضافے کیے تھے۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۸۸۳ء کو آبِ حیات' کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آگیا۔ آزاد کو اِس نے تھکا دیا تھا وہ لکھتے ہیں ''آبِ حیات نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بے وقوفی ہوئی ہے، دس (۱۰) مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ ماہ میں کیا ہے''۔[۲۵]

اپنی مصروفیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں ''میرا حال یہ ہے کہ آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا ہوں اور ضعف نے نکما کر دیا''۔[۲۶]

۱۸۸۳ء ہی میں آزاد کو ایک اور پریشانی سے دو چار ہونا پڑا۔ آزاد نے اپنی عمرِ عزیز کے تیرہ(۱۳) برس گورنمنٹ کالج میں صَرف کیے تھے۔ اَب گورنمنٹ کالج کو پنجاب یونیورسٹی

(اورئنٹیل کالج) میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ آزاد کو یہ تبدیلی پسند نہیں تھی اور وہ اِس تبدیلی پر پریشان تھے، اِس پریشانی کا اِظہار وہ اپنے ایک خط میں اِس طرح کرتے ہیں:

آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا کہ گورنمنٹ سر رشتۂ تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہو گا کہ سررشتۂ تعلیم پنجاب کا بُہت سا بوجھ یونی ورسٹی پنجاب اپنے سر پر رکھتی ہے۔ گورنمنٹ کو اِس سے زیادہ اور کیا چاہیے اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی یونی ورسٹی کے حوالے ہو جائے گا۔ یونی ورسٹی کی یہ رائے ہے کہ علوم وفنون ریاضی وغیرہ سب کی تعلیم ترجموں کے ذریعے ہو جایا کرے گی۔ فقط انگریزی کے لیے ایک ماسٹر اڑھائی سو روپے کا کافی ہے۔ سر دست اس قدر تو نہ ہوگا مگر اتنا ضرور ہو گا کہ یونی ورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے ملانے اور ہندو پنڈت نکمے بیٹھے ہیں؛ طلبائے کالج کو یہ دیسی کتابیں پڑھا لیا کریں گے۔ کالج کے مولوی و پنڈت دونوں تخفیف۔ تب مولوی کا کیا حال؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی؛ اکسٹرا اسسٹنٹی؟ مشکل ہے منصفی؟ تحصیل داری؟ شاید پنشن دے دے گی۔ اِس میں ابھی دو برس کی کمی ہے۔ مگر ہو سکتی ہے۔ خیر اگر ہو بھی تو پچاس روپے سے زیادہ نہیں۔ آسان اور عام قاعدہ یہ ہے کہ مسلسل نوکری ۱۳ برس کی ہے۔ اتنے مہینے کی تنخواہ لو! اور سلام۔ اِس تجویز کا عمل درآمد اپریل سے ہو جائے گا۔[۲۷]

ان کے ایک اور خط سے یونیورسٹی کے بارے خیالات کا اِظہار ہوتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"آپ دیکھتے ہیں یہ علم کی چڑیل (پنجاب یونیورسٹی) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی"۔[۲۸]

آزاد نے اپنی ملازمت کی پریشانی کا تذکرہ میجر سید حسن بلگرامی کے خطوں میں خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا؛ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی؛ خواہ سررشتۂ تعلیم، خواہ سول لائن میں۔اخیر درجہ پنشن کا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ گھر میں ایک سو پچاس روپے مہینہ آتا ہے، اِس میں پچاس روپے آئیں گے تو صورت حال کیا ہوگی۔ لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدائے کریم کارساز ہے، وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں؛ عہدے کے لیے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے۔[۲۹]

مولانا محمد حسین آزاد نوکری کے سلسلے میں ایک اور خط میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں۔

نوکری کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا، یونیورسٹی لیت ولعل کر رہی ہے اور کہتی ہے کہ ہم تجویز کر رہے ہیں۔ بہت خوب، اور بھی اچھا! میری عقل ناقص میں اگست کی چھٹیاں بھی اسی میں گزر جائیں گی۔[۳۰]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے ہیں؟ یہ ہے کیا قحبہ؟ آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔حضرت اس غلام کو آزاد کر کے وہ دست بردار نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے اِس سے بہتر صورت ہو گی اور وہ بدرجہا بہتر ہوگی۔۔۔خوشا بہ حال آزاد کہ پچاس روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجا لائے گا اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔[۳۱]

میجر سید حسن بلگرامی کے بڑے بھائی سید حسن بلگرامی (عمادالملک) اِن دِنوں حیدرآباد میں تھے۔ میجر سید حسن بلگرامی نے آزاد کی ملازمت کے سلسلے میں پریشانی دور کرنے کے لیے اپنے بڑے بھائی کے ذریعے سے آزاد کو اِس پریشانی سے نجات دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ آزاد نے ایک خط

میں لکھا ہے:

''میرے باب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، دل کو نہایت تشفّی اور استقلال حاصل ہوا۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دست گیری آپ صاحب نہ فرمائیں تو اور کون ہے۔ پروردگار عالم اِس خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرمائے ''
۳۲

مولانا محمد حسین آزاد میجر سید حسن بلگرامی کو اپنے ساتھ درپیش خانگی مسائل سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

آج مجھے ایک ایسا معاملہ پیش آیا جو آج تک نہیں ہوا تھا۔ وہی مشکی گھوڑا جس کا آپ سے کئی دفعہ ذکر آیا تھا، سائیس لے کر بھاگ گیا۔ وہ گیارہ بجے دن کے یہاں سے گیا ہے، اس لیے بدھ کو کسی وقت امرت سر میں ضرور پہنچے گا، آپ اسی وقت پیش خدمت کو فرمائیں کہ سراؤں اور یکے خانوں میں جا کر ایک نظر ڈالے۔[۳۳]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''سائیس کپور تھلے کا رہنے والا تھا، وہاں بھی تحریر دوڑا دی ہے۔ خیر یہ جھگڑے تو یوں ہی چلے جاتے ہیں، اگر قسمت کا ہے تو انشاء اللہ آ جائے گا''۔[۳۴]

اپنی مصروفیت کے سلسلے میں جگہ جگہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے، مگر میں مصروف کار ہوں''۔[۳۵]

''عجب ہجوم محنت میں مبتلا ہوں۔ الحمدللہ دس گیارہ دن کا کام رہ گیا ہے، اور یہ سخت تر وقت ہے۔ سوا مہینے سے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں۔ میری حالت ایسی ہوگئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے کہ تم کچھ بیمار تھے''۔[۳۶]

سر سالار جنگ کی وفات پر اِظہار افسوس کرتے ہیں ۔

ہائے افسوس ! صد ہزار افسوس ! آسمان ٹوٹ پڑا ، زمین تہ و بالا ہو گئی ، خدا جانے کیا ہوا اور کیوں مر گئے ! اچھا اب کیا ہو سکتا ہے۔ یا ارحم الراحمین، رحم کر بہ حق محمد و آل محمد ! ۔[۳۷]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

میں نے اسی وقت اخبار میں یہ حال دیکھا ہے؛ عقل ٹھکانے نہیں، حواس پریشان ہیں ، ہاتھ لکھنے کے قابل نہیں۔ مگر لکھے بغیر رہ نہیں سکا اس لیے چند حروف نا مربوط لکھ کر لفافے میں بھر دیئے ہیں۔ آگے سوا افسوس کے کیا لکھوں ۔ جی چاہتا ہے کہ خود حاضر خدمت ہوں اور دل کی بھڑاس نکالوں، مگر پھر کہتا ہوں کہ حاصل کیا ۔[۳۸]

ایک خط میں لکھتے ہیں؛

میرے پاس کیفیت احوال کے پہنچنے کا کوئی رستہ نہیں ، آپ ہی تسلی نامہ لکھیں تو لکھیں۔ اگر چہ غیروں کو اس بات کا یقین نہ آئے (گا) لیکن غالبًا آپ کے دل پر اس فقرے کا اثر ہو گا کہ مجھے شاید ہی کچھ کم آپ سے رنج ہو۔ میں رویا اور میں نے اور میرے یہاں نے اِس مرحوم کی نماز ہدیہ میت پڑھی۔ مجھے اُمید نہیں کہ ان کے بیٹوں نے پڑھی ہو گی ۔[۳۹]

اپنی تصنیفات سے محبت کا اندازہ اِن کے اِس خط سے ہوتا ہے:۔

''اچھا مجھے پنشن بھی دے دیں گے تو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پورا کروں گا ؛ اپنے لختِ جگر بچوں کو نیم جاں تڑپتا نہ چھوڑوں گا''۔[۴۰]

مصروفیت کے بارے میں جگہ جگہ لکھتے ہیں:

مگر اِس سال یونیورسٹی مجھ پر مہربان ہوئی ، زبان اُردو میں طلباء داخلہ کا ممتحن مقرر کیا اور زبان دانی میں اُردو اور فارسی کا ایک اور ایک حصہ عربی کا۔ اِن کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں ، وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ ہیں اور آج سے دس دِن کی مہلت باقی ہے۔ خدا اس بلا سے جلد مخلصی دے۔[۴۱]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

فرصت کا حال یہ ہے کہ ۲۱ جولائی کو یہاں امتحان ملازمت تھا ؛ پانچ سو بہتر آدمی اُس میں بیٹھے تھے ، مجھے باوجود اِنکار کے فارسی کا ممتحن کیا۔ تین پرچے جس کے سولہ سترہ کاغذ دیکھنے پڑے ہیں ، ایک پلنگ بھرا ہوا ہے ، دیکھتا ہوں اورلہو خشک ہوتا ہے۔ کہ الٰہی یہ بوجھ کیوں کر اُٹھے گا ۔ ۱۵ اگست کو رزلٹ دینا ہے ؛۔[۴۲]

آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں ، فرصت تو ہے نہیں اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔[۴۳]

حیدر آباد سے ایک ہفتہ وار اخبار ''شفق'' نکلتا تھا مولانا آزاد نے اپنے اکثر خطوں میں ''شفق'' کے حوالے سے میجر سید حسن بلگرامی کو معلومات بہم پہنچائی ہیں ، یا شفق روانہ کرنے کے متعلق آگاہ کیا ہے۔ اپنے خطوط میں لکھتے ہیں:

'شفق' میں میں نے دو ٹائم ٹیبل بھی دیکھے ؛ ایک حضور انور کا ایک سالار جنگ بہادر کا اگر پہلے نقشے پر عمل درآمد ہوا کرے تو خوشا بہ حال ملک ومملکت ! اور خدا چاہے تو طبیعت کا آجانا کچھ بڑی بات نہیں۔ شوق طبع ہے ، کاش انتظام اور آراستگی ملک پر آجائے اور یہ خیال پیدا ہوجائے کہ ایک دفعہ وہ کر کے دکھا دیجیے جو کبھی یہاں نہ ہوا ہو ، اور اِس وقت کہیں نہ ہو۔[۴۴]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

''پرسوں 'شفق' کے تین پرچے ایک ہی لفافے میں پہنچے ، کل صبح کی ریل میں روانہ کیے ہیں ، رسید ضرور عنایت فرمایئے گا''۔[۴۵]

''شفق ابھی آیا ؛ اکثر پرچے آپ کے دیکھنے کے قابل ہیں''۔[۴۶]

لالہ دنی چند کے نام مولانا محمد حسین آزاد نے بتیس (۳۲) خط لکھے ہیں۔ لالہ دنی چند مولانا کے شاگرد تھے۔فراغت تعلیم کے بعد مولانا آزاد نے اِن کی ملازمت اور ترقی کے لیے بہت کوشش کی۔ لالہ دنی چند کو مولانا سے بہت محبت وعقیدت تھی۔ اِن کی قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ یہ مولانا کے خطوط کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اُن کو سنبھال کر رکھتے تھے۔لالہ دنی چند مولانا آزاد کے خطوط کو اپنے لیے باعث برکت سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ میں اِن خطوط کو جیتے جی اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا۔ لالہ دنی چند کے نام خطوں میں مولانا محمد حسین آزاد کی محبت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ لالہ دنی چند سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ بہت کم اُستاد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے شاگردوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اُن کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں۔مولانا محمد حسین آزاد کا ایسے ہی اُستادوں میں نام آتا ہے۔وہ شاگرد کی ملازمت کے لیے کوشش بھی کرتے ہیں اور دعائیں بھی کرتے ہیں۔آزاد اپنے خطوں کا آغاز ہی دعا سے کرتے ہیں'' عزیز من ! بعد از دعاہائے فراواں معلوم باد ، زندہ ہوں کہ اتنی مدت کے بعد تمھارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔[۴۷]

''بعد از دعاہا معلوم خاطر عزیز باد ، بعد از دعاہا معلوم باد''۔[۴۸]

''عزیز من ! بترقیات نشاٗ تین کامیاب باشد !''[۴۹]

''عزیز من ! زاد اللہ ۔ اقبالکم !''[۵۰]

''اقبال نشان من''۔[۵۱]

اپنی مصروفیت کے سلسلے میں لالہ دنی چند کو بھی لکھتے ہیں:

کیا کروں مشاعرے کے سبب سے میں بُہت عدیم الفرصت اور پریشان دماغ ہو گیا ہوں۔ مثنوی مشاعرہ ماہ جولائی کی جس میں فرحت و امید ، کا مضمون ہے، انشاء اللہ عنقریب روانہ کرتا ہوں ، خاطر جمع رکھو۔ آج پیر کا دِن ہے اس لیے ملتوی کرتا ہوں۔ [۵۲]

ایک خط میں اپنے شاگرد کی مولانا آزاد حوصلہ افزائی اِس طرح کرتے ہیں:

کتب امتحانی کا بالاستیعاب دیکھنا تو اِنسان کا کام نہیں ، اور کون دیکھ سکتا ہے کہ تم بہ نسبت اس کے نامکمل رہو گے۔ تھوڑا تھوڑا مختلف جگہ سے دیکھ لو کہ ہر ایک کی طرز تحریر سے آشنائی ہو جائے۔ آگے خدا مالک ہے۔ قصائد بدر چاچ کا یہی حال ہے جو تم نے بیان کیا۔ ہم بھی دیکھ لیں گے اور کوئی کیا آسمان کے تارے توڑ لائے گا۔ [۵۳]

اِسی خط میں لالہ دنی چند کو طریقہ استادی شاگردی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

انشا کا حقیقت میں تم کو وہم ہے ؛ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر باپ چاہے کہ بیٹے کو سکھاؤں اور اس میں مادہ نہ ہو تو کبھی نہیں بتا سکتا اور اگر اس میں مادۂ قابل موجود ہے تو کتابیں بھی استاد کافی ہیں۔ میرے اُوپر جو تمھیں خیال ہے یہ فقط بھرم ہے۔ میں نے اس کام کی کبھی اصلاح نہیں لی ، نہ عربی میں نہ فارسی میں ، نہ اُردو میں۔ ہاں اچھے اچھے صاحب کمالوں کے کلام دیکھتا رہا ؛ اُن کے دیکھتے دیکھتے ایک رنگ ایسا بے رنگ پیدا ہوگیا کہ سب سے الگ ہے اب چاہے کوئی اسے بے رنگ کہے چاہے خوش رنگ۔ بس یہی طریقہ استادی شاگردی کا ہے۔ اگر چند روز پہلے تم یہاں آؤ ، پھر اپنے سامنے چند کاغذ میں تم سے لکھواؤں اور انھیں تمھارے سامنے خود بناؤں ، شاید اس کا اثر بہ نسبت اس کے جلد تر ہو۔ [۵۴]

لالہ دنی چند کے نام بتیس مکتوب ہیں، جن میں سے ایک فارسی اور اکتیس اُردو میں ہیں۔ یہ سارے مکتوب ۱۸۷۴ء تا ۱۸۷۷ء کے ہیں۔ ۱۸۷۴ء ہی میں آزاد نے نظم اُردو کو طرح نو سے روشناس کیا اور نظم اُردو کے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ اِن مشاعروں کی بدولت آزاد کے مخالفین نے اِن کو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ اِن مخالفین میں منشی سید محمد عظیم بھی تھے۔ آزاد کے اِن سے تعلقات کشیدہ تھے۔ منشی سید محمد عظیم کا لاہور میں شاہی عمارت نولکھا میں پریس تھا۔ بعد میں منشی سید محمد عظیم نے اِس پریس سے قطع تعلق کر کے ایک پنجابی پریس جاری کیا اور پنجابی اخبار شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر اِن کے بیٹے منشی محمد لطیف تھے۔[۵۵] اِس اخبار میں ہر مشاعرے کے بعد آزاد کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا تھا۔ مولوی مقرب حسین عربی فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے اور خاندانِ ارسطو جاہ سے تھے۔ ان کے متعلق آزاد اپنے ایک خط میں لالہ دنی چند کو لکھتے ہیں:

> ملا مقرب کی مثنوی نہ پہنچنے کا سبب تو یہ ہے کہ اُردو کی نظم لکھنا ان کے لیے موجب پریشانی ہے۔ علاوہ ازیں غالباً انھیں منشی سید محمد عظیم کے ہاں سے پینتیس (۳۵) روپے ملتے ہیں اور سید موصوف کو اُن کی تحریر کا میرے پاس آنا نامطبوع ہے۔ پس میں بھی دیوانہ نہیں جو انھیں ایسے کام کی تکلیف دوں جس میں اُن کا خواہ مخواہ نقصان ہو۔ میں اُن کا خیر خواہ اور ہوا خواہ ہوں نہ کہ نقصان خواہ یہ خدا سے دعا ہے کہ ان کے لیے پچاس ساٹھ روپے مہینے کا سامان اپنی درگاہ غیب الغیب سے کردے، پھر دیکھو میں اِن سے کس طرح ماہ بہ ماہ مثنوی نہیں لیتا۔ اُنھوں نے اِس مہینے میں لاہور آنے کا وعدہ کیا تھا مگر خدا جانے کیا سبب ہوا۔[۵۶]

ایک خط میں لالہ دنی چند کو بروقت کام نہ ہونے پر صبر کی تلقین کر رہے ہیں لکھتے ہیں:

مرغ زیرک چوں بہ دام افتد تحمل بایدش۔

''میں نے لودیانے کو خط لکھا ہے اور جب وہ یہاں آئیں گے تو انشاء اللہ زبانی

بھی کہوں گا۔ اللہ زبان میں تاثیر دے اور تمھیں صبر دے اور ایسی حالت نہ پیش
لائے جس میں صبر کی ضرورت پڑے''![۵۷]

ایک خط میں اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے امتحان ہو جانے پر لکھتے ہیں۔

''امتحان کی خوش اسلوبی سے کمال خوشی ہوئی ؛ خدا تمھاری محنتوں کو ہمیشہ کامیاب
اورمثمر خیرو برکات رکھے'' ![۵۸]

اپنے بیٹے (ملا باقر) کے بیمار ہونے پر اپنے عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں:

تمھارے پیارے ملا کا بڑا پتلا حال ہو رہا ہے۔ بارہ دن سے باری کا بخار آتا
ہے ؛ زرد ہو گیا جیسے ہلدی ؛ کھانسی دم نہیں لینے دیتی ؛ اور ناک بند ہے، سانس
نہیں لینے دیتی۔۔۔ارے میاں ملا کے لیے دعا کرو کہ خدا اسے شفا دے اورعمر
دراز بہ علم و اقبال عطا کرے ! مجھے اِس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ والدمرحوم کے نام
پر اِس کا نام رکھا ہے۔[۵۹]

مولانا آزاد لالہ دنی چند کی نوکری کے سلسلے میں درخواست نامنظور ہونے پر پریشان ہیں
اور لکھتے ہیں:

''کوئی بات خوشی کی نہیں پیش آتی ؛ عجب موقع ہے ، خدا اپنا فضل کرے اور
ہمارے گناہ معاف کرے ! اس وقت منشی کرم الٰہی کے خط سے معلوم ہوا کہ
درخواست نامنظور ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ کیا کروں ؟ ''[۶۰]

اِسی خط میں مولانا آزاد اپنے عزیز شاگرد کو مشورہ دے رہے ہیں کہ تم وکالت کا امتحان دو۔
اِس سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں:

''نواب صاحب یہاں تبدیل ہوکر انبالے سے آ گئے ہیں، اِن سے مل کر کہوں گا، شاید کوئی رستہ نکل آئے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتو میرے نزدیک اِس پر لعنت کرنی چاہیے اور تم الہ آباد میں جا کر امتحان دے دو'' ۔[۶۱]

آزاد کوشش کے ساتھ ساتھ اپنے شاگرد کے لیے دعا بھی کرتے ہیں:

''خدا تم کو کامیابی دونوں جہاں کی نصیب کرے اور افکار دنیاوی سے نجات دے!''[۶۲]

لالہ دنی چند کو نائب تحصیلداری کا امتحان پاس کرنے پر مبارک باد دیتے ہیں جس سے اِن کی خوشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

لو صاحب، مبارک ہو! نائب تحصیل داری کیجیے اور جس طرح چاہیے ہم رعیتی لوگوں کو دبایئے۔ الحمدللہ! الحمدللہ! اگر چہ یہ میں جانتا تھا کہ 'کوہ نور' نکلنے والا ہے۔ تمھیں خبر ہو ہی جائے گی مگر خوشی کے مارے مجھ سے رہا نہ گیا۔ خیر اللہ مبارک کرے! اس وقت پانچ بجے ہوں گے، میں بھی اب چھ بجے سوار ہوتا ہوں اور خدا سے یہ بھی دعا ہے کہ تم مجھ سے راستے میں مل جاؤ تو کیا خوب بات ہے۔ یہ خط جگراؤں کی طرف پھینکتا ہوں، خدا کرے پہنچ جائے! پتا مجھے معلوم نہیں خدا جانے تمھیں کب پہنچے اور میرے لکھنے کا فائدہ بھی حاصل ہو یا نہ ہو۔ خیر ہو یا نہ ہو، میرے دل کا ارمان تو اس وقت نکل گیا۔ میں لودیانہ اسٹیشن پر، کھنے اسٹیشن پر، جا بہ جا کہتا چلا جاؤں گا کہ ۔۔۔وہ پاس ہو گئے، وہ پاس ہو گئے۔ اب خدا تمھیں تحصیل دار اور تحصیل دار سے ڈپٹی کر کے مجھے دکھائے۔[۶۳]

اس خط سے ایک اُستاد کی اپنے شاگرد سے محبت اور اُس کو ملازمت ملنے پر خوشی کے تاثرات کی عکاسی ہوتی ہے، اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد اپنے شاگرد کو یہ خبر سنانے کے لیے کس قدر بے تاب تھے۔ شاگرد سے گلہ بھی کر رہے ہیں لیکن اُس میں بھی شاگرد کے لیے دعائیہ لہجہ

ہے لکھتے ہیں:

'' بعد از دعا ہا معلوم باد ، تم لاہور میں آئے اور مجھ سے بے ملے چلے گئے؟
شاباش ! شاباش ! خدا تمھیں ایسا بڑا کرے کہ مجھے پہچان بھی نہ سکو۔ میں بھی اسی
میں خوش ہوں۔۔۔'' [۶۴]

مولانا کو اپنے شاگرد کے تحصیل دار بننے پر فخر ہے۔اپنے خط کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

''عزیز من ! تحصیل دار صاحب !''۔ [۶۵]

لالہ دنی چند کے نام خطوں میں مولوی محمد حسین آزاد نے اس عرضی کا بہت ذکر کیا ہے جو لالہ دنی چند نے منصفی کا امتحان پاس کرنے کے لیے کالج میں بھیجی تھی۔ لالہ دنی چند چاہتے تھے کہ وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیں لیکن اس کے لیے انھیں باقاعدہ کالج حاضر ہونا پڑتا تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کالج کی طرف سے مجھے حاضر ہوئے بغیر منصفی کا امتحان دینے کی اجازت دے دی جائے۔ اِس سلسلے میں آزاد نے بُہت سارے خط لکھے ہیں:

دوسرے دن یونیورسٹی میں گیا ، وہاں کوئی عرضی نہیں پہنچی ۔ میں نے اسی وقت ایک
عرضی لکھ کر تمھاری طرف سے دے دی۔مگر تمھارا یہاں آنا ضروری ہے۔ جلدی
آؤ اور جلدی سے بھی کچھ زیادہ جلدی آؤ ، کیوں کہ تمھارے آئے بغیر کام کا
اسلوب نہیں ہوتا۔ [۶۶]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''پندرہ کو آپ کی عرضی برائے سفارش منصفی صاحب رجسٹرار کو دی تھی ، ابھی جواب نہیں ملا ، نواب سے بھی وعدہ سفارش کا لیا ہے''۔ [۶۷] '' ابھی تک تمھاری عرضی کا کوئی جواب نہیں پہنچا ،تم خود دیکھ کر آؤ۔ [۶۸]

آپ کی عرضی نہ کرم الٰہی نے پیش کی نہ میں نے ، نہ کچھ فائدہ اُن کی تاکید میں دیکھا ، کیوں کہ اُنھوں نے کہا کہ یہ صاحب کچھ کرتے نہیں ، نہ کسی قابل ہیں۔ البتہ ڈاکٹر لائٹر صاحب نو (۹) مارچ کو آنے والے ہیں۔ اس وقت انشاء اللہ ضرور کچھ نہ کچھ صورت معقول ہو گی۔[۶۹]

ایک جگہ لکھتے ہیں:

پرسوں کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے آپ کی عرضی میرے پاس بھیج دی، میں دیکھ کر حیران ہوا چپراسی سے پوچھا ، یہ کیا ؟ کہا کہ صاحب نے لفافہ کھول کر اسے دیکھا اور کہا کہ مولوی صاحب کو دو اور پوچھو کہ یہ کیا معاملہ ہے۔؟ خیر میں سمجھ گیا اور کاغذ لے کر رکھ لیا ، اور جب گھنٹہ بجا اور جماعت ادھر میرے پاس سے، اُدھر ان کے پاس سے اُٹھی تو میں عرضی لے کر گیا اور سارا حال بیان کیا۔ ان کا اپنا یہ حال کہ انھیں اب تک خود رجسٹراری کا چارج نہیں ملا اور بات منجھیلے میں پڑ رہی ہے۔[۷۰]

اس خط میں بھی مولانا آزاد اپنے عزیز شاگرد کو عرضی کے بارے میں ہی لکھتے ہیں:

کوئی ساعت نہ تھی کہ تمھارے معاملے کا خیال نہ ہو ، چنانچہ کرم الٰہی سے کئی دفعہ ذکر کیا اور ڈاکٹر صاحب کے آنے پر بھی دو دفعہ ملا اور یہ قرار پایا کہ جب انھیں چارج مل جائے گا جب ہی اختیار ساعت کا ہوگا۔ پس اِس وقت پہلی پیشی میں تم ان کی عرضی کو پیش کرنا اور سب حال زبانی کہہ دینا۔ اگر وہ مجھ سے کچھ پوچھیں گے تو میں بھی جو خدا کہوائے گا کہہ دوں گا۔۔۔

غرض کہ تمھاری عرضی مع نقول اسناد سب حال سُن کر صاحب نے اپنے پاس رکھ لی اور کہا کہ اب کمیٹی میں بہ حیثیت ممبری جاؤں گا اور اسے پیش کروں گا۔آج کمیٹی ہے اور پھر کوشش ہے۔سینٹ کے بعد کچھ حال ہوگا،منگل کو۔[۷۱]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

لو صاحب ! آج تک انتظار میں خط لکھا ہوا رکھ چھوڑا کہ جواب با صواب ملے، مگر مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود ابھی تک رجسٹراری سے محروم ہیں ، اپنے لیے کوشش کر رہے ہیں اور کارگر نہیں۔ اُنھوں نے عرضی آپ کی کرم الٰہی کو بند کر کے دے دی کہ اسے کمیٹی میں پیش کر دو۔ اس نے حال بیان کیا ، فرمایا کہ پھر میں کیا کروں ، میں تو رجسٹرار نہیں۔ کرم الٰہی نے مجھ سے بیان کیا ، میں نے کہا کہ خوب کیا تم نے کہ کمیٹی میں پیش نہ کی۔ خدا جانے وہاں سے کچھ اُلٹا سلٹا حکم ہو جاتا تو مشکل ہو جاتی۔[۷۲]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب رجسٹرار کمیٹی کا رکن منظور ہو گئے ، مگر سینٹ میں ہونے سے باقی ہیں ، اِس لیے ابھی کام نہیں کرتے ، خیر ، انتظار ہی کے لیے ہم لوگ پید اہوئے ہیں''۔[۷۳]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لالہ دنی چند نے مولانا آزاد سے کوئی گلہ کیا ہے کہ آپ میرا کام نہیں کروا رہے۔ لہٰذا مولانا آزاد لکھتے ہیں:

جو کچھ تم کہو سچ ہے ، کیوں کہ حق بہ جانب تمھارے ہے مگر میں کیا کروں کہ یہاں جو جو مسلک تدبیر کے ہیں وہ سب طے کیے اور کرتا ہوں اور کوئی رہبر رستہ نہیں ملتا۔[۷۴]

لالہ دنی چند کا کام نہ ہونے پر مولانا آزاد لکھتے ہیں:

میں تم سے شرمندہ ہوں کہ اب تک کچھ نہیں کر سکا۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میں نے اِن سے دو دفعہ کہا مگر موقع درست نہیں بیٹھا ، غالباً معافی ساعت لکچر کے لیے رپورٹ کر دیں لیکن پھر حیران ہوں کہ

کیوں کر وعدہ کرتا ہوں۔ چار دن ہوئے نواب صاحب مع ناصر علی خان صاحب ڈپٹی ہادی حسین خاں صاحب کے بیٹے کو اسی غرض سے لے کر گئے ، ڈاکٹر صاحب نے صاف اِنکار کیا۔ خیر جو کچھ کرے سو خدا، کل پرسوں تک کھل جائے گا۔[۷۵]

اِس خط میں بھی مولانا کام نہ ہونے پر اپنے شاگرد کو لکھتے ہیں:

''دو مہینے کی چھٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ڈلہوزی چلے گئے ، میرا کہنا پورا پورا کار گر نہ ہوا۔ ڈپٹی صاحب ، نواب صاحب متوجہ نہ ہوئے، میں تم سے شرمندہ و شرمسار رہا''۔[۷۶]

ایک اور خط میں اِس کام کے نہ ہونے کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ڈاکٹر لائٹر صاحب جب پہاڑ سے لوٹیں گے اور ان سے باتیں چیتیں ہوں گی تو جو کچھ بن پڑے گا کیا جاوے گا ؛تم خاطر جمع رکھو، مجھے غافل نہ سمجھو ،مگر کیا کروں جہاں کچھ نہیں ہو سکتا وہاں مجبوری ہوتی ہے''۔[۷۷]

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد اپنے شاگردوں کے کام کے لیے کتنے متفکر ہوتے تھے۔ لکھتے ہیں:

پرسوں ڈاکٹر صاحب آئے تھے چنانچہ کل بھی میں ان کے پاس گیا اور تمھارے معاملے میں پھر از سرِ نو گفتگوئیں ہوئیں؛ بکواس کہاں تک لکھوں ؛ خلاصہ کلام یہ ٹھہرا کہ: ''اچھا وہ مجھے درخواست دیں کہ بے استماع لکچر ہائے معمولی کے مجھے اجازت مختار کاری کے امتحان میں بیٹھنے کی ہو جائے۔ میں چیف کورٹ کو لکھوں گا اور یہ غالبًا منظور ہو گی۔ بعد اس کے وکالت کے لیے دیکھا جا ئے گا۔'' چنانچہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک درخواست اِس مضمون کی لکھ دیجیے کہ :

جناب عالی ! ۔۔۔ سنہ میں فدوی نے امتحان داخلہ و امتحان فضیلت زبان فارسی مع ریاضی وغیرہ کے دیا اور پاس کیا۔ فدوی چاہتا ہے کہ امتحان وکالت کا دے، لیکن چونکہ ضلع لودھیانہ میں مدرس مدرسہ سرکاری ہے ، اس لیے اگر حسب شرائط لکچر ہائے معمولی سے (کے ؟) لاہور میں حاضر ہوتو نقصان عظیم روپے کا ہوتا ہے ۔جس کا فدوی متحمل نہیں ہوسکتا۔ امیدوار ہوں کہ نظر بہ مراتب مذکورۂ بالا اس قدر رعایت فدوی کے حق میں ہو کہ امتحان مختاری میں بیٹھنے کی اجازت سرکار سے مرحمت ہو۔ واجب تھا عرض کیا۔

آفتاب دولت زیادہ باد !

منصفی کے لیے بھی کوشش کروں گا انشاء اللہ، خدا کرے کامیاب ہو ! [۴۸]

ایک اور جگہ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

اس میں منجملہ اور مضامین کے اصل مطلب یہ تھا کہ صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ مختاری کے امتحان کی اجازت لے لو۔ ساعت لکچر ہائے معمولی شاید ہو جائے ، میں سفارش کروں گا۔اس صورت میں آپ کو چاہیے کہ درخواست بھیج دیجیے۔۔۔اب معلوم نہیں کہ یہ خط ہی اب تک نہیں پہنچا یا کیا ہوا کہ جوابی خط میں آپ کچھ نہیں لکھتے کہ وہ درخواست صاحب کے نام الگ بھیج دی ہے یا بھیجئے گا ؟ بہتر یہ ہے کہ مجھے دیجیے میں خود پیش کر کے لکھوا دوں گا ؛ آئیندہ جو کچھ کرے سو خدا ۔۔۔مگر آپ درخواست اِس مضمون کی بھیجئے کہ میں ۔۔۔برس سے سررشتۂ تعلیم پنجاب میں مدرس ہوں اور فی الحال بہ مشاہرہ پینتیس روپے ضلع لودھیانہ میں مدرس اوّل ہوں۔ میں نے علوم فارسی اور بہ قدر ضرورت عربی کی کتابیں تحصیل کیں اور علوم مروجہ حاصل کر کے فلاں فلاں درجے پاس کیے۔ سنہ فلاں۔۔۔ میں امتحان فضیلت فارسی کا یونیورسٹی پنجاب میں پاس کیا۔ فدوی چاہتا ہے کہ امتحان قانون کا دے کر وکالت کی سند حاصل کرے مگر حسب شرائط

جماعت قانونی کے اگر ساعت لکچر میں شامل ہوتو مصارف عظیم عائد ہوتے ہیں کہ میری غربت و حالت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ علاوہ بریں عہدے سے رخصت نہیں مل سکتی۔ لہٰذا امیدوار ہوں کہ بہ نظر حقوق مذکورہ بالا اس قدر رعایت فدوی کے حال پر کی جائے کہ ساعت لکچر۔۔۔سے فدوی معاف ہو اور اگر امتحان وکالت میں ممکن نہ ہوتو امتحان مختاری میں بیٹھنے کے لیے فدوی کو اجازت ہو جائے۔ فدوی کی گزشتہ محنتیں اور اس کے امتحانوں کی کامیابیاں غالباً اطمینان دیں گی کہ جو کچھ میری نظر سے گزرتا ہے بغیر سمجھے نہیں رہتا۔ فدوی نے حضور کے امتحان میں سند انٹرنس اور فضیلت فارسی کی حاصل کی ہے اور لوگوں نے معزز عہدے سررشتۂ مذکور سے اور اس کی سفارش سے حاصل کیے، لیکن فدوی نے سوائے ایک سند کے اب تک حضور سے کچھ نہیں پایا۔ فدوی کا حق حضور پر ہے، اور حضور کے سوا کوئی وسیلہ بھی نہیں رکھتا۔ آیندہ حضور مالک ہیں۔ یہ چند کلمے لکھ کر میں نے خامہ ڈال دیا ہے، تم اسے درست کر لینا اور جو باتیں اور بڑھانے کی ہوں وہ بڑھا دینا اور عرضی جلد مجھے لکھ کر بھیج دو۔[۷۹]

اِن خطوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کو لالہ دنی چند کے کام اور ترقی کی کس قدر فکر تھی اور اِس سلسلے میں وہ کتنے فکر مند رہتے تھے۔ کام نہ ہونے پر ایک تو خود دُکھی ہوتے دوسرا ان کے دِل میں یہ خیال آتا کہ شاید میرا شاگرد یہ سمجھے کہ میں اِس کے لیے کوشش نہیں کر رہا۔ یہ احساس اِن کے اکثر خطوں میں ہے جس کا وہ ذکر کرتے ہیں:

میرے دل پر یقین ہے کہ تمھارے دل پر کیسے اضطراب گزر رہے ہوں گے؟ مگر یہ بھی خیال ہے کہ تم کہتے ہو گے کہ محمد حسین کو کیا غرض ہے جو خیال رکھا ہوگا۔ میرا حال یہ ہے کہ باوجود کثرت پریشانی اور شدت جنون کے ایک لحظہ اس تلاش وکوشش سے خالی نہیں۔ مگر کوئی بات اِس وقت تک قابلِ اطلاع نہ تھی، اِس وقت یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ تمھارے ذیل کے تھے سب کے باب میں منظور و نا منظور جو ہونا تھا ہو گیا، مگر تمھارے باب میں کچھ معلوم نہیں۔ مجبوراً ایک عرضی اور

خدمت میں صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کے تمھاری طرف سے لکھ کر دی ہے کہ آپ
پھر اِس باب میں رجسٹرار چیف کورٹ کو لکھیں تا کہ کچھ حال تو معلوم ہو۔ اسی قدر
چاہیے تھا وہی تم کو لکھ دیا۔[۸۰]

ایک جگہ لکھتے ہیں :

مگر میں کیا کروں کہ یہاں کوئی بات ایسی نہیں ہوسکی جس کی تم کو خبر دیتا۔ دل شکستگی
کے سبب سے کچھ لکھنے کو جی نہ چاہا۔ سبب اس کا وہی ہوا، یعنی کچھ تو حرام زادوں نے
حرام زدگی کی ، کچھ ڈاکٹر صاحب کو یہ بہانہ ہاتھ آیا کہ میری آج کل چیف کورٹ
والوں سے مخالفت ہے اور وہ اس معاملے میں کوئی نیا قاعدہ باندھنا چاہتے ہیں ، جب
اس کا بندوبست ہو جائے گا ، تب جیسا مناسب ہو گا ویسا ہی کیا جائے گا۔ بس اب
سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ متوقع کسی لطیفہ غیبی کے ہو کر بیٹھئے اور اللہ اللہ کیے
جایئے۔[۸۱]

مولانا آزاد اِس خط میں بھی کام نہ ہونے پر شرمندہ ہیں اور افسوس بھی کرتے ہیں ، اُن
لوگوں پر جو صاحب اختیار ہیں:

بعد از دعا معلوم باد ، میں تم سے نہایت شرمندہ ہوں ۔۔۔وہ تو تمھیں یاد ہو گا ،
جب میں نے لکھا تھا کہ بس اب خاموش بیٹھے رہو ، جب تک کوئی لطیفہ غیبی آشکار
ہو ، کیونکہ اب یہاں راہ تدبیر مسدود ہو چکی ہے۔ چند ہی روز بعد امتحان شروع
ہوئے اور شیاطین جو اپنے اقتداروں پر گھمنڈ رکھتے تھے ، اُنھوں نے کھلے بندوں
ہاتھ رنگے۔[۸۲]

اِس خط میں مولانا آزاد لالہ دنی چند کو خدا تعالٰی سے پُر امید رہنے کی تلقین کر رہے ہیں:

پھر اصلی مطلب پر آتا ہوں کہ یونیورسٹی سے دست بردار ہو جانا چاہیے، جب
تک کہ کوئی لطیفہ غیبی ظاہر نہ ہو ، اور خدا سے ہر وقت امیدوار رہنا چاہیے۔ وہ کار

سازِ حقیقی ہے، انشاء اللہ ڈپٹی کمشنروں یا انسپکٹروں سے یا کسی راہ چلتے سے کام بنا دے گا۔ قادرِ مطلق کو یاد کیے جاؤ اور ساتھ ہی یہ بھی کہے جاؤ کہ ان ظالموں کی بھی خبر لے۔ آج کل انتہائی درجے کی خودمختاری ہے۔[۸۳]

مولانا آزاد کو بواسیر کا عارضہ تھا اِس کے علاج کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

مجھے اِن دنوں میں بواسیر کا خون بُہت آتا ہے ؛ کوئی نسخہ ہو تو دیجیے۔ سید نے ایک چھلا یہاں دیا تھا وہ تو مفید ہوا تھا، مگر جاتے ہوئے وہ لیتا گیا اور کہتا تھا کہ گھر سے جا کر بھیجوں گا، وہ بھیجا تو بے اثر ثابت ہوا۔ معلوم ہوا کہ بے تکمیل تعمیل اثر اڑ جاتا ہے۔ عجب کارخانے ہیں کوتاہ اندیش بزرگواروں کے[۸۴]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

مجھے بواسیر سے خون اکثر آتا ہے، چھلّا اگر ہو سکے تو مجھے بنوا دو اور ضرور بنوا دو۔ ملا مقرب نے پان سو روپے بھر کا احسان رکھ کر ایک دیا مگر معلوم ہوا کہ وہ مغشوش ہے یہ کام فقیری کا ہے، تم جیسے شاہ لوگوں سے ہوتا ہے نہ کہ شاہ لوگوں سے۔ جو کچھ لاگت ہوگی وہ میں دوں گا۔ اگر کہیے تو پیشگی بھجوا دوں ؟[۸۵]

بواسیر کے چھلے کے بارے میں ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

چھلے کی ضرورت یہ ہے کہ ملا مقرب نے ایک چھلّا بھیجا مگر وہ ایسا ہے کہ کوئی دو تولے چاندی ایک سانپ کے منہ میں ٹھونسی، اس سے آٹھ دس چھلے بنوالیے۔ بھلا اِس میں اثر کجا، اور جو ہو بھی تو مجھے اعتقاد کیا۔ میرا ایسا کون ہے جو میرے لیے یہ شرائط خود پیش نظر بنوائے اور مجھ سے خود اتنی دردسری نہیں ہوتی۔ تم اگر چھلا بنواؤ اور اپنے اُوپر محنت گوارا کرو تو سب شرائط کو ہی (؟) پورا کرو، کیوں کہ محنت کرنی اور ادھورا رکھنا کیا ضرور؟ ۔[۸۶]

اس اقتباس میں مکاتیب آزاد کے مرتب نے لفظ ''ہی'' پر سوالیہ نشان بنایا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ اصل مسودے میں ''بھی'' ہوگا جو پرانی روش خط کے مطابق یہی لکھا گیا ہوگا اور مسودے میں نقطہ پڑھا نہیں جا سکا۔

ڈاکٹر لائٹنر کے نام مولانا محمد حسین آزاد نے کافی خط لکھے ہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر گورنمنٹ کالج لاہور میں پرنسپل تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد سے شروع میں ان کے تعلقات بڑے گہرے اور مشفقانہ و دوستانہ تھے لیکن بعد میں ان کے آپس میں تعلقات بگڑ گئے۔آزاد'' ہمائے پنجاب'' کے ایڈیٹر تھے۔''ہما'' میں سیالکوٹ کے ایک نامہ نگار کا خط بابت (حال چوری ملازمین محکمہ ڈاک) شائع ہوا۔ اِس خط میں لکھا تھا کہ محکمہ ڈاک کے ملازم لفافے میں کوئی قیمتی چیز دیکھ کر ایسی خوبی سے تراشتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا۔اِس خط کے شائع ہونے پر بُہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اس سلسلے میں پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب نے انجمن کے صدر سے باضابطہ طور پر شکایت کی اور آزاد کے خلاف کاروائی شروع ہوگئی۔ لائٹنر نے آزاد کو لکھا کہ ''ہمائے پنجاب'' کا چارج منشی محمد لطیف کو دے دیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے منشی محمد لطیف کو چارج دے دیا۔ اِس طرح اٹھارہ فروری ۱۸۷۱ء کو منشی محمد لطیف ''ہمائے پنجاب'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اٹھارہ جولائی ۱۸۷۱ء کو آزاد کی جواب طلبی کا حکم صادر ہوا۔اِس عرصہ میں کالج میں موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو گئی تھیں۔آزاد تعطیلات گزارنے کے لیے باہر جانا چاہتے تھے۔ آزاد نے باہر جانے کے لیے ایک درخواست میں پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر سے اجازت مانگی لیکن پرنسپل نے مولانا محمد حسین آزاد کو باہر جانے کی اجازت نہ دی۔محمد حسین آزاد کو اجازت نہ ملنے کا بُہت دکھ ہوا۔اِسی دوران پرنسپل لائٹنر نے انجمن کے تمام کاغذات اور کتابیں جو مولانا آزاد کی تحویل میں تھیں ، واپس لے لیں۔ آزاد کو اس پر بھی بہت مایوسی ہوئی۔ آزاد کے لائٹنر سے تعلقات خراب ہونے کی شروعات یہاں سے ہوئیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ڈاکٹر لائٹنر کی ''سنین الاسلام'' نامی کتاب مرتب کرنے میں بڑی امداد کی۔''سنین الاسلام'' میں مسلمانوں اور ان کے ادب کی تاریخ لکھی ہوئی ہے اور ان کا مقام تاریخ عالم میں متعین کیا گیا ہے۔ سنین الاسلام کی جلد اوّل کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد کے حالات ڈاکٹر لائٹنر صاحب سے خراب

ہوگئے۔ ایک تو وہ اس بات سے منکر ہو گئے کہ سنین الاسلام میں مولانا محمد حسین آزاد کی کوئی کاوش شامل ہے اور دوسرا اُنہوں نے اِس کی جلد دوم مرتب کرانے کے لیے مولانا کی بجائے مولوی کریم الدین انسپکٹر مدارس کی خدمات حاصل کیں اور اس کے سرورق پر یہ عبارت لکھوائی ''بمد د مولوی کریم الدین ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر'' مولانا محمد حسین آزاد کو اِس بات پر خاصا دھچکا لگا۔ آگے چل کر حالات مزید سے مزید خراب ہوتے گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر آزاد کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ کالج میں بھی اِن پر سختی کرتے تھے۔ آزاد کے تمام خطوط جو ڈاکٹر لائٹنر کے نام ہیں، اِن میں زیادہ خطوط میں کشیدہ تعلقات ہی ملتے ہیں، ماسوائے شروع کے چند خطوط کے۔ سب سے پہلے خط میں جب مولانا محمد حسین آزاد کے تعلقات ڈاکٹر لائٹنر کے ساتھ اچھے تھے، ڈاکٹر لائٹنر کو مولانا محمد حسین آزاد ایک کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اِس کتاب کو میں نے اکثر جگہ سے دیکھا، بچوں کے مناسب حال ہے اور دیہاتی مدارس میں پڑھانے کے لیے خوب ہے۔ اگر چاہیں تو بعض جگہ توضیح کر کے دلچسپ کر سکتے ہیں، مثلاً ملتان کی چھینٹ ایک زمانے میں اور شہروں میں جا کر اشرفی گز بکا کرتی تھی۔ اس کی آب وہوا کو رنگ کی شوخی اور پختگی میں قدرتی تاثیر ہے۔ انگریزی چھینٹوں کے آنے سے وہاں کے کارخانے بند ہو گئے۔ مینا کاری کا کام بہ نسبت اور شہروں کے اچھا ہوتا ہے، البتہ کشمیر کے برابر رنگ میں تیزی نہیں۔ شہر ملتان بہ سبب راہ گزر کے ہندوستان اور خراسان کی منڈی ہے، لیکن پشاور سے دوسرے درجے پر امیر تیمور اسی راستے سے ہندوستان آیا تھا اور بادشاہ بھی اسی رستے سے گزرتے رہیں۔
>
> جو بات اس کتاب میں ہے، کسی کتاب میں نہیں ۔ مصنف نے مطالب کو بڑی خُوبی سے ادا کیا ہے۔ طرزِ ادا نے سہولت کے خط میں لیا ہے اور انھیں دلچسپ بنا دیا ہے۔ انگریزی میں پہلے بھی جا بجا جاری تھیں، مگر جو لوگ اس سے بے بہرہ تھے وہ پوچھ پوچھ کر ترجمے کرتے پھرتے تھے۔ اب اُردو ہوگئی، گویا ہر شخص کے

حصے میں آ گئی۔عبارت سلیس ہے اور الفاظ آسان سہولت سے مطلب سناتے ہیں اور طریقہ سمجھاتے ہیں۔[۸۷]

ایک اور خط میں مولوی محمد حسین آزاد ڈاکٹر لائٹنر کو لاہور کی عمارتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک جلد کے اخیر میں چار کتبے کی تصویریں مندرج ہیں، چنانچہ پہلے کتبے میں آیہ قرآن مجید کی ہے۔۔۔صاف ہے۔ اس کے لکھنے کی حاجت نہیں۔ دوسری میں ''حال النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے، یہ بھی صاف ہے اور اصل کتاب کی دوسری جلد میں بھی درج ہے۔ تیسرا کتبہ عبرانی میں ہے اور کتاب میں بھی اسے صاف کر کے نہیں لکھا، اس لیے میری عقل ناقص میں جو کچھ آیا، عرض کرتا ہوں۔

دوسری جلد میں فقط ایک کتبے کی تصویر ہے جس کی سطریں اور اصل رسالے میں بھی اس کی عبارت کو صاف کر کے لکھا ہے، مگر میری رائے ناقص میں اس کے اکثر الفاظ میں اختلاف ہے۔اِس کے آخر کی دو سطروں کی عبارت کو جو کتاب میں لکھا گیا ہے غالبًا وہ کچھ اور ہے مگر مجھ سے بھی پڑھا نہیں گیا، جو کچھ پڑھا گیا، وہ عرض کرتا ہوں۔باوجود اس کے فکر وغور سے خالی نہیں۔انشاء اللہ عنقریب جو کچھ اور نکلے گا وہ عرض کروں گا۔ یہاں کی عمارات کا حال صاف ہوتا ہے، عنقریب خدمت میں پہنچے گا۔[۸۸]

ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے اُن دِنوں ڈاکٹر لائٹنر سے دوستانہ مراسم تھے اور ڈاکٹر لائٹنر کی ہر طرح سے معاونت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب لاہور کی تاریخی عمارتوں کا حال مولانا سے لکھوانا چاہتے تھے مولانا نے اِس سلسلے میں ایک ایک عمارت کو خود دیکھا، خود جائزہ لیا اور اس بارے میں جو کچھ معلوم ہوا اُس سے ڈاکٹر لائٹنر کو آگاہ کیا۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

لاہور کے اختلاف لفظی کو تاریخ ہفت اقلیم میں لاہور کے بیان میں دیکھنا چاہیے۔اس نے اُسے 'لہر' بھی لکھا ہے۔ اور سند میں ایک شعر بھی لکھا ہے ،مگر وہ حقیقت میں اس قسم کا تصرف ہے جیسے غیر زبان کے الفاظ کو صاحب زبان شاعر اور اپنی زبان میں تصرف کر کے لے جاتا ہے اس کے علاوہ چونکہ ترکوں کا قاعدہ ہے کہ وہ تحریر میں اپنے اعراب حروف کے ساتھ ادا کرتے ہیں ، اس لیے عجب نہیں کہ شاعر مذکور نے لاہور کو شعر میں 'لہر' باندھ دیا ہو۔[۸۹]

ایک اور خط میں مولانا محمد حسین آزاد ڈاکٹر لائٹنر کو طالب علموں کو انعام دینے کی رائے دے رہے ہیں ، جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے تعلقات ڈاکٹر لائٹنر سے کتنے اچھے تھے۔ لکھتے ہیں:

مولوی حمید الدین کے مدرسے کو میں نے دیکھا اور طالب علموں کا امتحان بھی لیا۔ مولوی علم دار حسین نے جو ان کے بارے میں رپورٹ کی ہے ، صحیح و درست ہے ۔میری رائے میں اِن طالب علموں کے لیے بھی انعام ملنا واجب ہے۔ اور چونکہ تعداد حاضری ان کی ہمیشہ پینتالیس سے زیادہ پچاس سے کم رہتی ہے اس واسطے اور بھی ۔کم سرمایہ یونیورسٹی پر نظر کر کے چاہیے کہ دس روپے مہینہ سے کم نہ ہو اور زیادہ کا اختیار ہے۔[۹۰]

ایک خط میں مولانا محمد حسین آزاد ''اخبار ہمائے پنجاب'' میں شائع ہونے والے خط کی جواب طلبی پر ڈاکٹر لائٹنر ، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کو لکھتے ہیں:

مضمون مندرجہ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۱ء بابت ڈاک خانہ جات کے باب میں حقیقت حال یہ ہے کہ وہ تحریر موجب خط سید بہادر شاہ منشی تحویل خانہ سیال کوٹ کے درج ہوئی تھی۔ اِس قسم کے خطوط اور مسودے کچھ میرے پاس بھی رہا کرتے

تھے اور باقی سررشتہ انجمن پنجاب میں ہوتے تھے۔ میں نے اپنے مسودوں میں خوب دیکھ لیا، خط مذکور نہیں ہے۔انجمن کے کاغذوں کو آج میں نے دیکھا، معلوم ہوا کہ ساتھ مہینے کا عرصہ ہوا، اس لیے کاغذات ردی گئے اور جو باقی ہیں ان میں نہیں ہے۔ اب صورت اِس دریافت کی کچھ مشکل نہیں، کاتب کا خط مسل کورٹ میں موجود ہے اور اسی کا خط اخبار عام میں بھی آیا تھا، معلوم نہیں کہ وہاں اصل خط موجود ہے یا نہیں؟ یہ حال انجمن بذریعہ تحریر کے کاتب مذکور سے دریافت کر سکتی ہے۔"[۹۱]

جب آزاد کو جواب طلبی کا حکم صادر ہوا تو اُس دوران کالج میں موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوگئیں آزاد نے تعطیلات کے زمانے میں لاہور سے باہر جانے کی اجازت پرنسپل سے مانگی

G.W. Leitner, M.A,

Principal Government College

Lahore.

Sir,

I humbly beg to bring under your kind notice that as I have to go out stations during the vacations, I request your permission for the same.

ترجمہ:

بخدمت جناب جی۔ ڈبلیو۔لائٹنر، ایم۔اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

جناب عالی!

بصد ادب گزارش ہے کہ تعطیلات کے دوران میں لاہور سے باہر دوسرے شہروں میں جانا چاہتا ہوں، لہٰذا اجازت مرحمت فرمائیں۔

پرنسپل نے یہ نوٹ لکھ کر اجازت نہ دی۔[۹۲]

This permission is sougt in order possibly to evade replying to the question of the P.M.G. regarding an editorial which appeared during Moulvi Muhammad Hussain's management of the Huma and which accused the post office of tampering with letters. As the Principal has reasons for

distrusting the Moulvi's honesty, no such permission can be given to him till the matter has been finally cleared up.

(G.W. Leitner)

8-07-71

ترجمہ:

اس اجازت کی غرض و غایت یہ ہے کہ پوسٹ ماسٹر جنرل کے سوال سے گریز کیا جائے جو انھوں نے ہمائے پنجاب کے ایک اداریے کے بارے میں دریافت کیا ہے ، یہ اداریہ مولوی محمد حسین کے زمانۂ ادارت میں شائع ہوا تھا اور اس میں ڈاک خانے پر خطوط کھولنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ چونکہ پرنسل کے پیش نظر مولوی کی دیانت داری کو مشتبہ سمجھنے کے اسباب ہیں ، لہٰذا ان کو اس وقت تک اس قسم کی کوئی اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ معاملہ بالکل ختم نہ ہو جائے۔[۹۴]

مولانا آزاد کو اس جواب پر حیرانی بھی ہوئی اور دُکھ بھی کیونکہ اُن کو پرنسپل سے اس جواب کی اُمید نہ تھی اس لئے وہ دل برداشتہ ہو گئے۔ اور ڈاکٹر لائنٹر سے ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ آزاد ایک درخواست بنام پرنسپل گورنمنٹ کالج ، لاہور لکھتے ہیں:

جناب عالی!

آج تیسرا دِن ہے۔ اب تک انجمن سے جواب حاصل نہیں ہوا کہ سیکرٹری انجمن لاہور میں نہیں، میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے آپ اگر روکیں تو کسی لیفٹیننٹ گورنر کو روکیں ، کسی گورنر کو روکیں ، محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لیے کچھ فخر نہیں۔ امید ہے کہ اجازت مرحمت ہوگی۔[۹۵]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

اب میری عرض یہ ہے کہ اگر سیالکوٹ کو خط لکھا گیا ہے تو بُہت مناسب ہے اور یقین ہے کہ وہاں سے جواب باصواب آئے گا۔ امیدوار ہوں کہ فدوی کو اجازت

سفر دی جائے کیوں کہ فدوی کے لاہور میں رہنے سے کچھ اِس کام میں فائدہ نہ حاصل ہوگا۔[۹۶]

ایک خط میں آزاد اپنے سابقہ تعلقات کی روشنی میں شکایت کے لہجے میں لکھتے ہیں:

اِس میں شک نہیں کہ حضور نے مجھے چھٹی میں روک لیا، مگر کس کو روکا ؟ وہی آزاد بندہ احسان، قیدی بے زنجیر ۔ بجائے اس طول کلام کے فقط اتنا کہہ دیتے کہ جاؤ کالج کے کام کے سوا تمھیں اب کون روکتا ہے، واللہ کہ آزاد ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا اور وہیں گر پڑتا۔ خیر جو کچھ کیا اچھا کیا۔ مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں کیونکہ جو سنتا ہے افسوس کرتا ہے۔ اگر دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں کیوں کہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں، میں اسی خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا، وہ افسوس کرے گا، یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا۔[۹۷]

مولانا محمد حسین آزاد کے ڈاکٹر لائٹنر کے ساتھ گہرے مراسم تھے لیکن وہ لوگ جو آزاد اور لائٹنر کے گہرے دوستانہ تعلقات کو اپنے حق میں مضر سمجھتے تھے، اُنھوں نے بھی مولانا آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر میں تعلقات کشیدہ کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ مولانا کو اس بات کا احساس تھا اور دُکھ بھی تھا۔ چنانچہ وہ ایک خط میں سابقہ تعلقات کی روشنی میں یہ لکھتے ہیں:

خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے جس کام کو چھوڑا ہے دشمنوں کے ہاتھ سے مجبور و ناچار ہو کر چھوڑا ہے کہ وہ عداوت کے سبب سے آپ کے کاموں کو بھی خراب کرتے ہیں، اِس معاملے میں بھی یہی حال ہے اگر آپ اِن شیطانوں کو روک سکیں تو میں بھی خدمت کے لیے حاضر ہوں، اور اگر آپ بھی مجبور ہیں تو مجھے معاف رکھیے۔ البتہ اگر حضور بیچ میں ہوں اور بطورِ خود کے مجھے کام دے دیں تو اس سے مجھے کچھ عذر نہیں اور کمیٹی سے تعلق پیدا کرنا فدوی نہیں چاہتا۔[۹۸]

ایک اور خط میں اپنے دشمنوں کے بارے میں آزاد ڈاکٹر لائٹنر کو لکھتے ہیں:

آپ کو یاد ہو گا آخر کے دنوں میں میں نے عرض کی تھی کہ جو سختیاں اپنے جانی دشمنوں پر آپ نے نہ کی ہوں گی ، وہ آپ کے ہاتھ سے میرے دشمن مجھ پر کروا دیں گے اور آپ نہ سمجھیں گے۔ وہ اب بھی خوشیاں کرتے ہیں۔ اور ہنستے ہیں کہ دشمن کو دشمن کے ہاتھ سے ہی اس طرح مارتے ہیں۔ ہزاروں کتے کہ شیر کی کھالیں پہنے تھے ، آپ نے اُنھیں مارا؛ مگر اب تک یہ آپ کو نہ معلوم ہوا کہ شیر فقط ایک ہی بات میں شکار ہو جاتا ہے۔ [۹۹]

''سنین الاسلام'' اور اخبار ''ہمائے پنجاب'' کے خط کا معاملہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ڈاکٹر لائٹنر مولانا آزاد سے حد درجہ ناراض ہو گئے۔ مولانا نے شروع شروع میں غلط فہمیاں دور کرنے کی کافی کوشش کی لیکن معاملہ سلجھنے کی بجائے ، اُلجھتا ہی گیا۔ اور ڈاکٹر لائٹنر مخالفت میں اس حد تک آ گئے کہ انھوں نے مولانا آزاد پر پابندی لگا دی کہ مقررہ اوقات کے علاوہ آپ طلباء کو نہیں پڑھا سکتے۔ ڈاکٹر لائٹنر کا مقصد یہ تھا کہ طلباء اس طرح امتحان میں فیل ہو جائیں گے اور قصور وار مولانا محمد حسین آزاد کو ٹھہرایا جائے گا کہ اُس نے محنت نہیں کروائی اِس لیے طلباء فیل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے نتائج خراب آنے پر باز پرس کر کے اُنھیں سزا دے سکیں گے۔ مولانا بھی بخوبی اِس بات کو جانتے تھے لہٰذا وہ لکھتے ہیں:

حضور نے جو سوائے گھنٹہ مقرری کے خارج کے وقت میں طلباء کو تعلیم عربی کے لیے منع فرمایا تھا ، تعمیل اس کی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی استعداد کا حال حضور پر روشن ہے ، خصوصاً اس سبب سے کہ بعض طلبا مختلف ضرورتوں سے غیر حاضر بھی رہے ہیں ، اس لیے امید ہے کہ حضور حکم سابق میں ترمیم فرماویں اور مجھے اجازت دیں کہ جو لوگ خارج وقت میں کچھ پوچھیں ، انھیں مدد تعلیم دوں۔ فقط

واجب تھا عرض کیا۔ آفتاب دولت تاباں رہے ! [۱۰۰]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

جو رپورٹ میں نے عربی جماعتوں کے باب میں کی ہے اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ بعض لڑکے خاص خاص سبب سے ایسے رہ گئے ہیں کہ انھیں حاجت پوچھنے کی ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جماعت میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور سست لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ حضور کی طرف سے قطعی ممانعت تھی کہ معمولی گھنٹے کے سوا کچھ نہ بتاؤ، اس قید کے ڈھیلا کرنے کے لیے میں نے اجازت چاہی تھی۔ مجھے گھنٹہ پڑھا دینے میں کوئی عذر نہیں مگر سب طلبا منظور نہیں کرتے۔ حضور پر روشن ہے کہ مجھے ان کی تعلیم میں جس قدر محنت اور وقت صرف ہونے میں خوشی ہوتی ہے۔ میری دانست میں سب سے بہتر یہ ہوگا کہ بعد برخاست دو تین گھنٹے کالج میں رہا کروں؛ اس میں اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہوا کرے تو پوچھ لیا کرے؛ نہ پوچھے تو میری طرف سے کوئی خواہش نہیں۔ آیندہ جو حضور کی رائے میں مناسب ہو، وہ انتظام فرمائیں۔[۱۰۱]

''سنین الاسلام'' ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا محمد حسین آزاد کے اشتراک سے مرتب کی تھی۔ مولانا نے کتاب کے پہلے حصے میں زبان و بیان کی تراش وخراش میں بڑی مدد کی تھی۔ مولانا نے اس کتاب پر کام بڑی جگر کاوی سے کیا تھا لیکن یہی کتاب ڈاکٹر لائٹنر اور مولانا آزاد کے تعلقات کی کشیدگی کا باعث بنی۔ ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کو انجمن کے منشی کرم الٰہی صاحب نے مولانا کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا:

آقائے ولی نعمت صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ کاپیاں جس وقت چپراسی لے کر حاضر خدمت ہوتا ہے ان کو فوراً بواپسی حامل ہذا صحیح کر کے واپس دیویں تا کہ کاروائی میں ہرج نہ ہو، اس واسطے مامور ہو کر تکلیف دیتا ہوں کہ آپ بموجب ارشاد ولی نعمت صاحب کے کاربند ہوں۔ فقط مرقوم ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء
بندہ کرم الٰہی۔[۱۰۲]

اس کے نیچے مولانا نے پنسل سے یہ خط لکھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

جناب عالی!

دو ورق اصل کے حضور کو دیے تھے اور آپ نے جیب میں رکھ لیے تھے، کاتب کس طرح کہتا ہے کہ مسودہ نہیں۔ ان دو ورقوں کو ضرور تلاش کر لیا جائے۔ اس کے آگے سے جو کچھ اور مسودہ میرے پاس تھا وہ ارسال کرتا ہوں، مگر اسے حضور نے ابھی سنا نہیں ہے۔[۱۰۳]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سنین الاسلام'' کی تالیف میں مولانا کا کس قدر ہاتھ تھا، اور وہ اِس کے لیے کتنے فکر مند رہتے تھے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

آج میرے پیٹ میں درد ہے۔ اس لیے حاضر نہیں ہو سکتا۔ مگر تمام رات یہی فکر رہا کہ وہ دو ورق اصل کے جو آپ نے جیب میں رکھ لیے تھے وہ کاتب کو بھیجے یا نہیں؟ یہ کاپیاں مطبع میں بارہ بجے آگئی تھیں، اسی وقت میرے پاس آجاتیں تو مقابلہ بھی اطمینان سے ہو جاتیں اور ان دو ورق کا بھی حال معلوم ہو جاتا۔ مگر نا وقت آئیں، مقابلہ بھی اضطراب میں ہوا اور دل کو فکر نے پریشان بھی کیا۔ جو اصل کے ورق کہ میں نے کل بھیجے ہیں اگرچہ وہ آپ کو سنائے نہیں مگر میں نے اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔ پرسوں کالج میں کاپی یا پروف سنا دوں گا۔[۱۰۴]

ڈاکٹر لائٹر اور مولانا آزاد کے حالات کشیدہ ہونے پر مولانا آزاد کے مخالفوں نے بھی سنین الاسلام کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اور اس میں کیڑے نکالنا شروع کر دیے۔ کئی مخالفین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سنین الاسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مولانا آزاد کو یہ سن کر نہایت دکھ ہوا چنانچہ مولانا آزاد ڈاکٹر لائٹر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

میں اس تحریر سے آپ کا وقت ضائع نہ کرتا ، مگر کئی دن سے سنتا ہوں کہ ''سنین الاسلام'' میں کسی نے بُہت غلطیاں نکالی ہیں اور دوسرے نے تصدیق کیں ۔میں نے بہ موجب اپنے عہد کے اس کی بھی تفصیل نہ چاہی، مگر آج ایک نئی بات سنی کہ ''سنین الاسلام'' کی ترکیب ہی غلط ہے مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی : چنانچہ اس ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر سی عرض داشت انگریزی میں لکھتا ہوں ۔[۱۰۵]

مولانا محمد حسین آزاد کو کالج میں کس طرح زک پہنچائی جاتی تھی۔اس خط سے عیاں ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

۷ ماہ حال کو دو بجے کے بعد جب کہ سکینڈ ایر کلاس میرے پاس بیٹھی تھی ، دفعتاً چھت سے ٹھیک میز پر میرے آگے پانی گرنے لگا۔ میں مع طالب علموں کے فوراً اُٹھ کھڑا ہوا مگر میز اور کتابیں نجس ہو گئیں۔ احتیاط یاسین چپڑاسی کو اور پھر سید نیاز ، ممتاز علی اور محمد اشرف طالب علموں کو بھی بھیجا گیا کہ جا کر دیکھیں ، اُنھوں نے آکر بیان کیا کہ صورت حال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی نہیں کسی نے پیشاب کیا ہے۔ بعد اس کے گنگارام چپڑاسی اور بعض طالب علم اور گئے ، مضمون واحد معلوم ہوا ۔ اگر چہ اس امر میں شک نہیں تھا ، مگر نظر بہ مزید تحقیق او من صاحب بہادر سے کہا گیا انھوں نے لٹمس پیپر عنایت کیا ، اس سے امتحان کیا تو کوئی شک نہ رہا ۔چنانچہ وہ کاغذ بھی موجود ہیں۔ چوں کہ پہلے بھی اکثر یہ عمل نجس اوپر کے کمروں میں ہوتے ہیں، بلکہ یہ نجاست کا عمل صغیر تھا ، وہ اعمال نجاست کبیرہ کے ہیں پس اس لیے بڑھتے بڑھتے یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔اس لیے اطلاع حضور میں واجب ہے کہ آیندہ اس سے زیادہ ترقی نہ کریں ، معاملہ نازک ہے۔حضور کو یہ بھی خیال رہے کہ عمل مذکور کسی طالب علم کا تنہا نہیں معلوم ہوتا، اس میں اور بھی تائیدیں شامل ہوں گی، حضور تفتیش فرماویں گے تو سب حال

معلوم ہو جاوے گا۔

واجب تھا عرض کیا۔

آفتاب دولت تاباں رہے ۔[١٠٦]

ڈاکٹر لائٹنر کے بعد سب زیادہ خطوط حکیم محمد دین صاحب کے نام لکھے گئے ہیں۔حکیم محمد دین صاحب کے نام کل چھ خط لکھے گئے ہیں۔حکیم محمد دین صاحب لاہور سے جڑے ہوئے ایک چھوٹے سے قصبہ میں رہتے تھے ۔علمی و ادبی شوق اِس قدر تھا کہ دن رات تحصیل علم میں ہی مصروف رہتے تھے ۔محمد دین صاحب کو علم کیمیا کا حد سے زیادہ شوق تھا۔سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی محمد دین صاحب کے نام لکھے گئے ،مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمد دین صاحب کے نام چھ خط ہیں اِنھیں پڑھ کر ایک افسانے کی سی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس افسانے کا خاکہ ہے مولانا کی ایک کتاب کوئی شخص غائب کر دیتا ہے۔مولانا اسے واپس لینے کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ مجرم اقرار جرم کرتا ہے اور مولانا اپنا شوق بھول جاتے ہیں۔ ذہنی پریشانیوں اور قلبی تکلیف سے چشم پوشی کرتے ہیں اور عین اس وقت جب کتاب ملنے کو ہے مولانا معاف فرما دیتے ہیں۔اس سے مولانا کی فراخ حوصلگی ، انسانیت اور رحم و خدا ترسی کا ایک قابل تقلید پہلو سامنے آتا ہے۔[١٠٧]

مولانا محمد حسین آزاد کے یہ چھ خط ایک دلکش افسانہ بھی ہیں اور مولانا کے مزاج کی بہترین عکاسی بھی کرتے ہیں۔ مولانا آزاد اپنی کتاب 'الف لیلہ' کھو جانے پر حکیم محمد دین کو لکھتے ہیں:

جنابِ من !

> آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے الف لیلہ کے باب میں آپ سے کچھ التماس کیا تھا، یقین ہے کہ آپ نے میاں غلام رسول صاحب سے فرمایا ہوگا۔ برائے عنایت جواب سے مطلع فرمائیں۔ بندہ نہایت ممنون احسان ہوگا۔[١٠٨]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

عالی جناب من!

نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میاں غلام رسول صاحب سے الف لیلہ کے باب میں وصولی کے لیے تحریک فرمائی اور اُن سے وعدہ حصول بھی حاصل کیا۔ لیکن ایک تحصیل کا چپڑاسی جو مجھے پہلے بھی جانتا ہے، اس کی معرفت آج اُنھوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ کتاب تو میرے پاس سے کھوئی گئی، کہو تو بمبئی سے منگا دوں، یا جو چاہو اس کی قیمت لے لو؟ اب آپ خیال فرمائیں کہ اس اشراف آدمی کی نیت کا کیا حال ہَے؟ ۔۔۔ جب تک آپ نہ فرمائیں گے مقدمے کو آگے نہ بڑھاؤں گا۔ اگر مناسب ہو تو ایک دفعہ پھر ان کی نبض دیکھیے۔ معلوم تو ہو کہ طبیعت کا کیا حال ہے۔[۱۰۹]

مولانا آزاد اپنے تمام خطوں میں کتاب حاصل کرنے کے لیے حکیم محمد دین کو لکھتے ہیں۔ اور اُس کے کسی عذر کو نہیں مانتے اِس خط میں بھی وہ حکیم محمد دین کو یہی تلقین کر رہے ہیں:

پس اِس موقع پر کچھ لحاظ نہ کرنا چاہیے اور یہی کہنا چاہیے کہ کتاب دیجیے، مگر یہ وعدہ لے لیجیے کہ کب دیں گے تا کہ پھر اِنھیں کچھ عذر باقی نہ رہے[۱۱۰]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

اب تو مجھے ضابطے ہی کا خط لکھنا ہوگا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، آیندہ جو مرضیِ الٰہی۔[۱۱۱]

مولانا محمد حسین آزاد کو میاں غلام بنی صاحب (کذا) کی نیت پر شک ہَے اِس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

عنایت نامے سے معلوم ہوا کہ میاں غلام نبی صاحب (کذا) کہتے ہیں کہ ''الف لیلہ'' فارسی بازار میں نہیں ملتی، مگر قیمت دیتے ہیں۔ میں نے اس معاملے میں بہت سوچا، ان کا اصل مطلب یہ معلوم ہوا کہ راقم آثم قیمت لیتے ہوئے شرمائے، وہ برائے نام بھی کتاب نہ دیں اور چند روز کے بعد یاروں میں قہقہے اُڑائیں کہ دیکھو باتوں ہی باتوں میں اُڑا دیا۔ حال یہ ہے کہ کتاب مذکور بمبئی میں سوداگروں کے پاس موجود ہے، وہ چاہتے تو منگوا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک سوداگر کی فہرست ارسال خدمت ہے، اور چونکہ مطبوعہ ہے، اس لیے سندی اور معتبر ہے۔ اسے دیکھ کر آپ کو بھی ان کی بہانہ جوئی میں کچھ شبہ نہ رہے گا اور یقین ہوگا کہ اسی طرح میری کتاب بھی کہیں گئی نہیں انھی کے پاس موجود ہے۔ پس ایسے آدمی کو خالی چھوڑتے ہوئے ہرگز غیرت نہیں گوارا کرتی۔ اُنھوں نے مجھے بلکہ آپ کو بھی دق کر دیا۔ انھیں خالی چھوڑنا گویا اس کام کی تعلیم دینی ہے جس کا کہ حقیقت میں چھڑانا واجب تھا۔ خاتمے پر پھر وہی کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا، جہاں سے ہو میری کتاب لا دیں۔''[۱۱۳]

مولانا اب تک جس کتاب کے لیے اتنے فکر مند تھے حقیقت حال پتہ چلنے پر یک دم بدل گئے لہٰذا حکیم محمد دین صاحب کو لکھے گئے ان خطوں سے مولانا محمد حسین آزاد کی نفسیات اور انداز زندگی، شوق کتب اور انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ اس خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر خدا ترس انسان تھے چنانچہ خط میں لکھتے ہیں:

جناب من!

آپ کو ضرور کبھی نہ کبھی خیال آتا ہوگا کہ منشی غلام نبی (کذا) کا اور کتاب الف لیلہ کے معاملے کا کیا انجام ہوا۔ اس کا حال یہ ہے کہ الٰہی بخش کتب فروش اس شہر میں ایک معقول شخص ہے۔ اس نے اول مجھے خبر دی کہ کتاب مذکور منشی صاحب نے درحقیقت اسی کو دی تھی اور مبادلے میں ایک قرآن شریف لیا تھا۔

چنانچہ کتب فروش مذکور نے چار روپے آٹھ آنے کو وہ کتاب بیچ بھی ڈالی۔

اب تین دن کا ذکر ہے ، اس نے مجھ سے کہا کہ آج منشی صاحب مذکور نے انیس روپے مجھے دیے ہیں اور کہا ہے کہ بمبئی سے کتاب منگا دو۔ جس پیرائے میں اس نے یہ ذکر کیا ، اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت یہ انیس روپے کا داغ نہایت تکلیف دینے والا ہے، خصوصا آج کے زمانے میں ، وہ بھی ۲۵-۳۰ روپے کے نوکر کو ، اِس تقریر نے میرے دل پر بھی پُر درد اثر پیدا کیا اور میں نے کہہ دیا کہ یہ روپے تم اُنھیں واپس کر دو اور کہہ دو کہ بس کتاب مجھے پہنچ گئی۔۔۔ میں منشی صاحب کے دعوے سے دست بردار ہوا ، اب فقط خدا سے دعویٰ ہے ، جس کا خزانہ بے شمار ہے اور کتب خانہ بے تعداد ہے اور یقین واثق ہے کہ وہ دے گا ، اورضرور دے گا اور بُہت زیادہ دے گا۔

آمین ! آمین ! آمین [۱۱۳]

اصل صورت حال کا پتہ چلنے پر مولانا کے رویے میں ان کی خدا ترسی کی وجہ سے کس طرح تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اِس سے پہلے ایک خط کی عبارت ملاحظہ کریں:

''اور اگر میں اس معاملے میں خاموش رہوں گا تو ایسے لوگ ایک ایک کر کے میری ساری کتابیں مار رکھیں گے۔ ایسے آدمیوں کا تدارک آپ کے سوا کون کرسکتا ہے''۔[۱۱۴]

مولوی محمد حسین آزاد نے سید ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام پانچ خط لکھے ہیں۔ (لیکن یاد رہے کہ مکاتیب آزاد میں منشی فاضل صاحب نے ایک خط شامل نہیں کیا) سید ناصر نذیر فراق دہلوی خواجہ میر درد دہلوی کے نواسے ، میر محسن علی کے بیٹے تھے نظم و نثر میں مولوی محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ مرتضیٰ حسین فاضل لکھتے ہیں:

سید ناصر نذیر فراق دہلوی کو غالب کا میر مہدی مجروح کہہ لیجیے ، لیکن صرف عقیدت کی حد تک۔ مجروح غالب کے شاگرد عزیز ہیں ، شرفِ مصاحبت بھی

رکھتے ہیں ، اور بے تکلف دوست بھی ہیں ۔فراق آزاد کے لیے صرف سید زادے اور عزیز بیٹے ہیں ۔ [۱۱۵]

خود سید ناصر نذیر فراق کا بیان ہے کہ مولانا ایک مرتبہ دلی آئے تو ان کے والد نے فراق کو مولانا کے قدموں پر لا ڈالا اور عرض کی کہ اُسے آزاد ثانی بنا دیجیے۔ مولانا نے فراق کو گلے سے لگایا۔ان کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔فرمایا سید آپ نے یہ کیا کیا ، سید زادے کو مجھ گناہ گار کے قدموں پر ڈال دیا ! اِس کے بعد پوری توجہ کا وعدہ کر کے اصلاح کا سلسلہ جاری کر دیا۔

فراق کو لکھے گئے خطوں کا زمانہ ۱۸۸۷ء کا ہَے ۔ اِس زمانے میں مولانا آزاد کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔لیکن عالم وارفتگی میں لکھے گئے اِن خطوں کی تحریر سے کِسی طرح اندازہ نہیں ہوتا کہ مولانا آزاد نے یہ جنونی کیفیت میں تحریر کیے ہَیں۔ناصر نذیر فراق کو بتاتے ہیں کہ میری خرابی صحت ، بڑھاپے اور صدمات زمانہ نے مجھے نکما کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> حقیقت میں یہ کام زیادہ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ ضعف دماغ نے مجھے نکما کر دیا ہے رات کو بالکل لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ درحقیقت یہ بھی مقتضائے سِن ہے آزاد بے چارہ بڈھا ہو گیا اور صدمات زمانہ نے توڑ دیا۔ اپنے مسودے بستوں میں بندھے پڑے ہیں ؛ دیکھتا ہوں اور ترستا ہوں کہ ہائے نظر ثانی نہیں کر سکتا۔ [۱۱۶]

سید ناصر نذیر فراق نے اپنی غزلیں اصلاح کے لیے مولانا آزاد کو بھیجیں۔ مولانا آزاد اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بعد از دعا ہائے فراواں معلوم باد ، ماشاء اللہ تمھاری جوانی اور طبعیت کی روانی اعلیٰ درجے پر ہے۔غزلوں پر غزلیں بھیجے جاتے ہو اور مجھے ضعف دماغ دن رات سوا ہو رہا ہے۔غزلیں رکھ چھوڑی ہیں ؛ جی ٹھکانے ہو گا تو بنا کر بھیج دوں گا۔ [۱۱۷]

ایک اور خط میں سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی غزل کے مقطع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس غزل کا مقطع بھی پسند آیا''

یا علیؑ ہند میں رہتا ہے فراق

اب نجف میں اسے بلوائیے آپ

میں اسے بار بار پڑھتا ہوں اور نجف کی طرف منہ کر کے عرض کرتا ہوں مولا!
آزاد اور فراق کو اپنی جناب میں جلد بلوائیے۔ [۱۱۸]

فراق نے ایک رسالہ سات طلاقنوں پر مشتمل آزاد کو اصلاح زبان کے لیے بھیجا آزاد کو فراق دہلوی کا اُسلوب بیان بُہت پسند آیا۔ اور آزاد اُسلوب بیان اور لطفِ زبان سے بُہت متاثر ہوئے۔ آزاد فراق کی نثر کو پڑھ کر حیرت اور خوشی سے لکھتے ہیں:

عزیز اقبال نشان من! سید ناصر نذیر فراق سلامت!

بعد از دعاہائے فراواں معلوم باد، بھائی! تمھارے سات طلاقنوں، کے قصے پڑھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ خدا کی پناہ! کس بلا کی پھوہڑ اور گیگلی تھیں۔ میں دیکھتا ہوں تمھاری نثر تمھاری نظم سے زیادہ مزے دار ہو چلی ہے۔ خدا رکھے دلی کے رہنے والے اور خواجہ میر درد کے نواسے! تم سلیس اُردو نہ لکھو گے تو اور کون لکھے گا۔ تمھارا یہ رسالہ اس قابل ہے کہ چھپوایا جائے اور لڑکیوں کو پڑھایا جائے۔ میں نے جا بہ جا اصلاح دے دی ہے، غور سے دیکھ لینا۔ بیرنگ پیکٹ بھیجتا ہوں۔

دعا کا محتاج

بندہ آزاد

۳۰ جون ۱۸۸۷ء [۱۱۹]

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد حسین آزاد اپنے شاگردوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کو سراہتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد صرف تعلیمی زندگی میں ہی اپنے شاگردوں کی راہنمائی نہ کرتے تھے بلکہ ان کی نجی زندگی میں بھی ان کی راہنمائی کرتے تھے۔ سید ناصر نذیر فراق کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ عرصہ تک دوبارہ شادی کے لیے وہ تیار نہ ہوئے۔ عرصے کے بعد والدین کے شدید اصرار پر ایک جگہ مناسب رشتہ ہو گیا۔ آزاد کو معلوم ہوا۔ آزاد کو بڑی خوشی ہوئی۔ سید ناصر نذیر فراق کو مبارکباد کا خط لکھتے ہیں:

> خدا کا شکر ہے کہ تمھارا بھوت اُتر گیا۔ اور تم نے اپنے ماں باپ کے فرمانے سے اپنا گھر پھر بسا لیا یہ جوانی دیکھو۔ معاذ اللہ برسوں رنڈوے بیٹھے رہے، چلو اچھا ہوا کہ دوسری بیوی بھی پہلی بیوی کی طرح تمھاری خاطر خواہ مل گئی۔ اور پھر چڑی اور دو دو بیوی بھی سیدانی۔[۱۲۰]

آزاد کے چار خط بنام نا معلوم ہیں۔ یہ خط ۱۸۸۰ تا ۱۸۸۵ء کے ہیں۔ ان میں سے ایک خط آزاد نے ایران کی صنعتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں مولانا محمد حسین آزاد ایران گئے تھے اور یہ خط اُنھوں نے وہاں سے لکھا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

> ادنیٰ ادنیٰ شے آنکھوں میں رکھ لینے کے قابل ہے اور چیزوں کے علاوہ ایران کی قلم کار چھینٹیں ایسی عمدہ اور خوش رنگ اور خوش وضع ہیں کہ قدرتی پھول شاداب نظر آتے ہیں۔ کم سے کم چھ گز، پھر سات، آٹھ، دس، بارہ، سولہ گز تک اور رنگ پختہ۔ جوں جوں دھوئی جائیں، پھول کھلتے جائیں ---۔ جاڑے کے کپڑے بھی ایسے ایسے ہیں کہ برسوں تک رفاقت کریں۔ چائے دان، چھوٹے چھوٹے ساوار، بُہت خوشنما، جن میں چار چار پیالیاں چائے کی آ جائیں، سامنے میز پر دھرلو، آپ ہی بناتے جاؤ پیتے جاؤ، کمرے کی رونق ہو یہ سب برنجی اور مسی ہوتے ہیں لیکن نہایت لطیف اور نفیس چاقو اور قینچیاں عمدہ اور بران، قابل تعریف اور دیرپا پانچ چھے سے

لے کر ایک روپے سات یا آٹھ آنے تک جو شمشیر ایرانی میں خوبیاں تھیں وہ
ساری اب ان میں ختم کر دیتے ہیں۔[۱۲۱]

مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۸۵ء کے قریب ایک ڈراما ''ڈراما اکبر'' لکھنا شروع کیا تھا۔
یہ خط بھی ۱۸۸۵ء کا ہے۔ مولانا اِس خط میں ایک تو اپنی مصروفیت کا لکھتے ہیں اور دوسرا ڈرامے کا
پس منظر بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

مجھے آج کل فرصت مرنے کی بھی میسر نہیں آتی، تمھاری کس کس بات کا جواب
دوں۔ اِس وقت فقط ڈرامے کے متعلق لکھتا ہوں کہ ہندوستان کے دانا عہد قدیم
میں کبھی بہ غرض تفریح اور کبھی بہ غرض اصلاح بعض رسوم ملکی کے بعض معاملات کو
بطور نقل کے اس کے کل سامان کے ساتھ محفلوں میں اِس طرح ادا کرتے تھے کہ
دیکھنے والوں کو نقل سے اصل کا مزا آجاتا تھا شعرا اور انشاء پرداز اس میں زور طبع
کی داد دیتے تھے۔ اور ذہین و طباع لوگ اسے وجود عمل میں لا کر دکھاتے تھے ،
اور اسے ناٹک کہتے تھے ، کیوں کہ وہ فقط ، اندرسبھا ، یا راس دھاریوں کا سوانگ
(ہی) نہیں ہوتا تھا بلکہ کبھی عظیم الشان بادشاہوں کے معرکے اس میں بیان
ہوتے تھے ، کبھی نیک یا بدرسموں کی خوبیاں ، برائیاں دکھا کر لوگوں کے دلوں میں
برائی سے نفرت اور بھلائی پر رغبت پیدا کی جاتی تھی ۔لیکن افسوس ہے کہ مدت
ہائے دراز سے یہ مفید اور دلچسپ کام اِس ملک سے محو ہو گیا اور اگر ہے تو ایک
معیوب حالت میں ہے۔ دانایان فرنگ نے سنسکرت کے ترجمے لے کر اِس میں
کچھ کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ اپنے ملک میں رواج دیا اور وہاں اس
نے بڑی قدر پائی۔ اس کے لکھنے والے انشاء پردازی کے اعلیٰ درجے کے انشا
پرداز شمار ہوتے ہیں، کیوں کہ مضمون کا انشائیہ ادا کرنا بھی ایک جز اعظم انشا کا
ہَے ۔ اور عمل میں لانے والے صاحب علم اور صاحب کمال لوگ ہوتے ہیں اکثر
انگریزی اخباروں میں دیکھا جاتا ہے کہ کوہ مری اور شملے پر اعلیٰ اعلیٰ عہدے دار

خود اِس کے ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ فن کہ ایک اعلیٰ شاخ انشا پردازی کی ہے، زبان عرب اور زبان فارس میں نہیں ہے۔ اور چوں کہ اُردو کی شاعری اور انشا پردازی فارسی کی بنیاد پر اُٹھی ہے اس لیے اس میں بھی نا ٹک نہیں ہے۔ [۱۲۲]

اس طرح آزاد نے اُردو میں ڈرامے کی صنف کا پہلا ادبی تعارف اِس خط میں کرایا ہے۔آزاد نے ڈرامے اور سوانگ کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اِسی خط میں آزاد اپنے ڈرامے کے متعلق لکھتے ہیں:

فی الحال میں نے ایک ڈراما اُردو میں لکھا ہے، جس میں اکبر کے دربار کی بعض مفید حالتیں اور اہلِ دربار کی لیاقتیں دکھائی ہیں، اور یہ بھی سمجھایا ہے کہ اکبر بادشاہ غیر ملک کے ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے کس طرح گھل مل کر شیر وشکر ہو گیا تھا۔ اور کالج کے طلباء اس تصنیف کے ادا کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔اور یہی بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کا ایک کمال جو گردش ایام سے مٹ کر محو ہو گیا تھا، پھر تازہ ہوتا ہے۔ [۱۲۳]

نواب حسین مرزا صاحب کے نام محمد حسین آزاد کے لکھے ہوئے تین خط ہیں۔نواب حسین مرزا صاحب کی صاحب زادی میر افضل حسین صاحب سے منسوب تھیں اور اب ان کی یعنی میر افضل حسین صاحب کی بڑی بیٹی سے مولانا اپنے بیٹے آغا ابراہیم کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ اِس طرح نواب حسین مرزا کو خط لکھتے ہیں کیونکہ نواب حسین مرزا میر افضل حسین کی بیٹی کے نانا تھے اور یہ مرزا غالب کے گہرے دوستوں میں سے بھی تھے۔مولانا آزاد نواب حسین مرزا صاحب کی وساطت سے اپنے بیٹے کا رشتہ میر افضل حسین کی بڑی بیٹی ذکیہ بیگم سے کرنا چاہتے تھے۔ اِن تینوں خطوں میں آغا ابراہیم کی شادی اور مولانا کی خوشی کا اِظہار ہوتا ہے۔مولانا لکھتے ہیں:

بعد از ادائے تسلیم آں کہ اس ننگ خاندان قدیم و جدید کا حال جاننے والا آپ سے زیادہ کوئی نہیں۔حقیقی نسب اور تحقیقی حسب میرا تو یہ ہے کہ روز ازل سے ابا عن جد اسداللہ غالب مظہر العجاب علی ولی اللہ کا غلام ہوں۔ اور یہی فخر کافی ہے

کہ وہ آپ کے جدّ عالی مقدار تھے۔۔سعید کونین بندہ زادہ محمد ابراہیم حسین دو
برس ہوئے کہ خدمت عالی میں مشرف ہوا تھا، اس کا حال بھی آپ پر روشن ہے
امید ہے کہ سیدی مکرمی سید افضل حسین صاحب کی وساطت سے اپنے دامن
عاطفت کا سایہ اس کے سر پر مبذول فرمائیں۔ [۱۲۴]

رشتہ منظور ہونے پر مولانا آزاد نواب حسین مرزا صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے
ہیں:

''عنایت نامہ آپ کا سرمایۂ مسرت ہوا۔خداوند عالم مبارک کرے! یہ جو کچھ ہوا،
آپ کی سعی سے ہوا اور خدا کے فضل سے''۔ [۱۲۵]

میر افضل حسین صاحب کی تین صاحب زادیاں تھیں، مولانا آزاد بڑی لڑکی کو اپنی بہو بنانا
چاہتے تھے جس کا نام ذکیہ بیگم تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اور برادر موصوف نے ساتھ اس کے مجھے یہ بھی لکھا ہے کہ توضیح اس امر کی لکھنی
چاہیے کہ خطبہ کون سی صاحب زادی کے لیے ہے۔ اس دریافت کرنے سے مجھے
کمال تردد ہوا۔ چنانچہ احتیاطاً مصدع ہوں کہ جو آپ سے گفتگو ہوئی تھی اس کے
بہ موجب تصریح کر دیجیے اور اُن سے فرمائیے کہ خطبہ برخوردار ذکیہ بیگم بڑی لڑکی
کے لیے ہے۔ خداوند عالم مبارک کرے۔ الٰہی آمین!۔ [۱۲۶]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''سیدی عزیزی سید افضل حسین نے جو بہ مقتضائے سعادت مندی آپ کے ارشاد
کو اس معاملے میں قبول کیا۔ انھیں بھی شکریہ اور مبارک باد فرمائیے گا'' [۱۲۷]

اسی خط میں بیٹے کی شادی کی بھی خواہش کا یوں اظہار کرتے ہیں:

اب عرض مکرر ہے کہ اس مبارک کام کے سر انجام میں دیر نہ ہو۔ یہاں گھر سنسان ، کاروبار ابتر ، چیزیں برباد ہیں ، کوئی سنبھالنے والانہیں ۔ ایک برخوردار ابراھیم کی والدہ ، اس دل شکستہ کے حواس بجانہیں رہے خدا جلد وہ دِن دکھائے کہ عزیزہ نورچشم ذکیہ بیگم آئیں ، اپنے گھر کو سنبھالیں ، وہ جانیں اور ان کا گھر۔[۱۴۹]

مولوی ممتاز علی صاحب کے نام ایک اور منشی ذکاء اللہ صاحب کے نام دو خط ہیں۔ معصوم علی کے نام بھی دو خط فارسی میں ہیں۔ باقی مولوی محمد حسین آزاد کے جتنے بھی مکتوب الیہ ہیں اُن سب کے نام ایک ایک خط ہے۔

شمس العلما مولوی ممتاز علی صاحب جنھوں نے مولانا آزاد سے تعلیم حاصل کی تھی ، کو خط میں ایک روحانی واقعہ لکھا۔ مولانا آزاد اُن کو فرزند کے برابر جانتے تھے اور مولوی صاحب بھی ان کو باپ کا درجہ دیتے تھے۔ سید ممتاز علی صاحب سرسید کے حامی اور اُردو کے بہُت بڑے مصنف تھے۔ ان کو لکھے گئے خط سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ آزاد کو رُوحانیت سے بڑی دلچسپی تھی۔ دیوانگی کے زمانے میں مولانا آزاد کی یہ دلچسپی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی لکھتے ہیں:

چھ فروری ۱۹۱۰ء کو بزم اُردو لاہور کی طرف سے آزاد کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا ، اس جلسے میں مولوی ممتاز علی نے جو آزاد کے حاضر باشوں میں سے تھے۔ایک مفصل تقریر کی تھی جس میں مولوی ممتاز علی نے آزاد کے جنون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا :

عالم دیوانگی کے ظہور سے پہلے بھی مولانا پر روحانی جذبات کا غلبہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا بعارضہ فتق بیمار تھے آپ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسری کی خدمت انجام دیتے تھے ، رات کے وقت غلبہ مرض کی وجہ سے شدید تکلیف ہوئی ، آدھی رات کے بعد مولوی ممتاز علی صاحب کو اپنے مکان

پر بلا بھیجا یہ اسی وقت گئے اور رڈی ۔۔۔حالت دیکھ کر مایوس و پژمردہ خاطر ہوئے ، بالآخر دوا دارو کا انتظام کر کے اپنے گھر واپس چلے آئے صبح کو کچھ دِن چڑھے مولانا نے میر صاحب کو پھر بلوایا اُنہوں نے جا کر دیکھا تو بالکل تندرست پایا۔ مولانا نے کہا میری صحت یابی کا عجیب واقعہ ہے دل لگا کر سنو۔

اِس کرب اور تکلیف کی حالت میں مجھے آسمان پر کچھ آدمیوں کے بولنے کی آواز آئی۔ میں نے بہُت غور سے سُنا تو اس مجمع میں میرے والد مولوی محمد باقر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوئے ایک اور شخص کسی دوسرے آدمی کو کوئی بات سمجھا رہا تھا مگر وہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی میں نے اپنے والد سے کہا کہ یہ کیا مشکل معاملہ ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا مولوی محمد باقر نے پوچھا کیا تم سمجھ گئے ہو میں نے کہاہاں سمجھ گیا ہوں ، چنانچہ میں نے ان کو اس کا مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ وہ آدمی جو مسئلہ سمجھا رہا تھا میرے والد سے پوچھنے لگا کہ یہ کون شخص ہے اُنہوں نے جواب دیا بندہ زادہ ہے یہ سن کر اُس نے کہا تو اسے بھی ساتھ کیوں نہیں لے لیتے مگر میرے والد نے کچھ عذر کر دیا اس کے بعد میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ مجھے پوچھنے والا کون شخص ہے۔ اُنہوں نے کہا حضرت علیؓ ہیں پھر حضرت علی نے فرمایا۔ تم علاج کیوں نہیں کر دیتے۔ مولوی محمد باقر نے جواب دیا میں کس طرح علاج کر سکتا ہوں۔ حضرت علی نے تدبیر بتائی کہ تم اس کے پیٹ میں اتر کر اس کی انتڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ٹھیک کر دو۔ چنانچہ اس کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مولوی محمد باقر میرے پیٹ میں اُتر گئے جب اُن کو یہاں دیر لگی تو حضرت علیؓ نے آواز دی مولوی صاحب نے جواب دیا انتڑی درست کر رہا ہوں ، آتا ہوں۔ یہ آواز اِس طرح آتی تھی گویا مولوی صاحب

میرے پیٹ میں بول رہے ہیں۔اس کے بعد میں نے اپنے والد سے کہا علاج تو ہوگیا مگر کوئی پرہیز، انہوں نے حضرت علی سے پوچھا آپ نے فرمایا ہمارے علاج میں کسی پرہیز کی ضرورت نہیں مگر میں اس پر اصرار کرتا رہا۔ آخر اُنہوں نے کہا دہی کے ساتھ تربوز کھایا کرو۔ مولوی ممتاز علی صاحب نے کہا کہ اس کے بعد ہم نے مولانا آزاد کے مکان میں تربوز کے چھلکے اور دہی کے دونے اکثر پڑے دیکھے۔ [۱۲۹]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کو بچپن ہی سے رُوحانیت سے دلچسپی تھی۔ عالم جنون میں وہ اعمال و وظائف کی طرف اورمتوجہ ہو گئے عالم جنوں کی تصانیف میں اس کے متعلق کافی اشارے ملتے ہیں۔ مولوی ممتاز علی کو ۱۸۸۵ء میں لکھے گئے اس خط میں بھی رُوحانیت کے متعلق بتا رہے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

عزیز القدر مولوی سید ممتاز علی ! بارگاہ رسالت پناہی میں تجویز ہوئی ہے کہ روحانیہ کے خیالات اورفرقوں میں پھیلتے جاتے ہیں ؛ اسلام کیوں اس فخر سے خالی رہے حکم ہے کہ کوشش سے پھیلاؤ۔جو لوگ کر رہے ہیں وہ خارق سے خالی ہیں ، تمھیں شکر کرنا چاہیے کہ جب ضرور ہوگا ان کا ظہور ہوگا انشاء اللہ تعالی کئی وارداتیں مجھ پر یہاں گزری ہیں جنھیں دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ آیندہ خدا جانے کیا ہو گا۔ شاید عنقریب ضرورت ترتیب ہو تو جمع کرنے مشکل ہوں گے۔

پہلا خارق التیام میرے زخم کا ہے کہ اب بغیر ٹرس یعنی پیٹی کے بے تکلف پھرتا ہوں اور حکم ہے کہ نہ باندھو۔ اسی سانس میں ایک طریقہ ہدایت فرمایا ہے جس سے تدارک اس کا ہوتا ہے۔ اس کی احتیاط اور تقلیل فنا کا حکم ہے کیوں کہ عالم اسباب ہے۔ ڈاکٹر اور طبیب دوائیں دیتے ہیں اور دوائیں اثر

کرتی ہیں۔عالم ارواح طبائع و ارواح کے حالات جز وکل سے واقف ہیں ، وہ دواؤں کے محتاج نہیں : جہاں موقع ہوتا ہے اثر دیتے ہیں اور حسب الحکم فائدہ پہنچاتے ہیں یا سلب کر لیتے ہیں۔

یہ بات تم سے کہنے کے قابل تھی ، خدا جانے کہی تھی یا نہیں کہ جس وقت کہ انتزی آہستہ آہستہ پہلے مقام پر رجوع کر رہی تھی تو ایک شعبہ اس کا اس مزے سے پھر آیا کہ میرے منہ سے نکلا۔ زہے کبریا ! حضرت نے آہستہ سے فرمایا۔۔۔ یا ذالکبریا ! ہم اس کے ہاتھ میں ہیں طبیعت کو صلاحیت صحت کا راستہ دیتے ہیں۔ [۱۳۰]

منشی ذکاء اللہ کے نام لکھے ہوئے خط ۱۸۹۱ء ۔۱۸۹۲ء کے ہیں۔ اس وقت مولانا محمد حسین آزاد ذہنی تعطل کا شکار تھے۔ اپنے خط میں واردات قلبیہ اپنے عزیز دوست کو لکھتے ہیں اور دنیا داروں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ نصیحتیں آزاد نے عالم وارفتگی کے زمانے میں لکھی ہیں لیکن ان نصیحتوں کو عاقل و دانا بھی مانتے ہیں لکھتے ہیں:

لو بھئی اب آگے سنو ! کل صبح کو میں بہ موجب معمول کے ہوا کھانے نکلا؛ شہر کے باہر پہنچا تو دیکھتا ہوں ایک مرد مقدس ،متقی وضع ، پرہیزگار صورت جبہ پہنے ہیں، حاجیاں عرب کا عمامہ سر پر ، ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے کو سفید داڑھی نے روشن کیا تھا۔ جیسے کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں ، مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ہیں چوں کہ بزرگوں کا ادب میری طبیعت میں خداداد ہے میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے میرا سلام لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی باوقار آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں ان سے محبت اور شفقت ٹپکتی ہے۔ بے اختیار آگے بڑھا اور مصافحہ کر کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ چوں

کہ صبح کے وقت انوار الٰہی کا جلوہ پھیلا ہوا تھا ، دوسرے ان کی صورت اور لباس نے دل پر اثر کیا۔اپنی بداعمالی اور دنیا کی سیہ کاری کا خیال کر کے ان سے عرض کی کہ مجھ روسیاہ کو کچھ نصیحت فرمائیں جو میرے کام آئے۔ وہ مسکرائے اور اس طرح دیکھا کہ میرے دل و جان کو اپنا معتقد بنا لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم تمھارے حسن عقیدت سے بہُت خوش ہوئے وہ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے اور میں نصف قدم ان سے پیچھے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا۔ چند لمحے میں نے تامّل کیا ، کیوں کہ ان کی متانت اور وقار مجھے زیادہ بولنے کی اجازت نہ دیتے تھے آخر پھر ہاتھ باندھ کر سوال کی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا ۔ انھوں نے فرمایا کہ قلم دوات تمھارے پاس ہے ؟ عرض کی کہ نہیں ،مگر جو کچھ آپ فرمائیں گے بندہ صفحۂ دل پر نقش کرتا جائے گا۔ پھر مسکرائے اور فرمایا کہ اہلِ دنیا بے وقوف نا اہل ہیں۔ ہم نہ کسی کو اپنا دیدار دیتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں۔مگر اس وقت یہ حسن عقیدت تمھارا ہمیں پسند آیا ، اس لیے چندفقرے جن میں بہُت سی کتابوں کا بلکہ ہزاروں کتب خانوں کا عطر کھنچا ہوا ہے تمھارے سپرد کرتے ہیں انھیں نا اہلوں سے بچانا اور اپنا دستو العمل بنانا کہ یہ ہمارے اسرار ہیں ۔

اُنھوں نے کہا:

(1) یاد رکھو کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں ، جو زیادہ دوستی برتے ، اُسی کو دشمن سمجھنا۔

(2) دشمن سے ایسی دل فریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی بھی نابود ہوجائے۔ آدمی ہوتو اُلو بن جائے۔ پھر اگر پورا سلیقہ ہوتو پنجرے میں بند کر کے پر قینچ کر دو ؛نہیں تو مطلب نکالو اور چھوڑ دو۔

(3) نہ محبت کو نیکوں کی نیکی پر منحصر رکھو، نہ اسے ان کی نیکی

کی مقدار پر خرچ کرو۔تم اپنے مطلب کو دیکھتے رہو جس
سے نکلتا دیکھو اُس کو گدھا بناؤ اور جھٹ سوار ہو جاؤ۔

(4) اس میں پہلے یہ اعتقاد رکھو کہ دنیا میں اچھا تو کوئی نہیں
ہے ۔ یہ ہم صورت جو آدمیوں کے جامے میں پھرتے
چلتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔آزاد [۱۳۱]

دوسرے خط میں بھی آزاد نے اپنی جسمانی اور دماغی کیفیت کی اطلاع اپنے دوست کو دی ہے ۔ مولانا آزاد کی جب طبیعت خراب ہوتی تھی تو آنکھیں بند کر کے زمین پر لیٹ جاتے اور سانس کا عمل کرتے جس سے وہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتے تھے ۔ ایسے ہی عمل کے بارے میں لکھتے ہیں:

چلتے ہوئے حکم ہوا یہاں لیٹ کر برداشت کا عمل کرو ، چنانچہ ہوا مگر کچھ نہ ہوا
تھوڑی دُور آگے چل کر درختوں کی قطار نے سایہ ڈالنا شروع کیا۔ جاتے ہوئے
جو ہوا سامنے سے زندگی دیتی تھی اب پشت پر ہوگئی تھی۔حکم ہوا کہ رُخ
پھیرو ، ذرا ٹھہرو ، دم لو ، تبدیل کرلو ، حقیقت میں لطف عجیب حاصل ہوتا جاتا تھا ،
سینہ ہلکا ہوتا تھا ، گھبراہٹ تھم جاتی تھی۔ جوہڑ کے کنارے پر پہنچے تو ہوا کی لہریں
پانی سے مباحثہ کر رہی تھیں ! حکم ہوا کہ یہیں ٹھہرو اور ہوا تبدیل کرلو۔[۱۳۲]

حاجی بنے صاحب دہلی کے رئیس اعظم تھے اور مولانا کے والد مولوی محمد باقر کے دوست تھے ۔ اس طرح مولانا سے بھی اس کی دوستی ہوگئی۔ حاجی بنے صاحب کے نام لکھے گئے خط میں بھی مولانا محمد حسین آزاد نے آغا محمد ابراہیم کی شادی کے متعلق لکھا ہے۔ اور خوشی کا اظہار کیا ہے خط میں بیٹے کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

اوّل یہ کہ الحمد للہ کسی طرح کا تکلف درمیان نہیں ہے۔آپ تو خود بانی مبانی اس
مبارک کام کے ہیں او رسیدی عزیزی میر افضل حسین کی ننھیال کی طرف سے

قرابت قریبہ رکھتے ہیں ۔ پس کیا مناسب ہے آیا میں ان سے بہ خط راست مراسلت کروں یا نہیں۔ یہ دنیا کے لوگوں کی باتیں ہیں ورنہ مجھے تو آپ جانتے ہیں کہ کام میں تکلف نہیں رکھتا۔ جس طرح ان کی خوشی ہو عمل میں آئے ۔ [۱۳۳]

شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

پہلی صورت میں یہ ہے کہ تاریخ عقد اس طرح مقرر کی جائے کہ تیسری تاریخ بدھ کا دن گزار کر رات کو عقد ہو، ۴ پنج شنبہ کو دُلہن گھر میں آجائے ۔ اور اگر ہفتے کی چُھٹی زیادہ ہوئی تو ۱۴ ربیع الثانی تک ہوگی۔ اس صورت میں بہتر ہے کہ ۶ ربیع الثانی ہفتے کا دن بسر کر کے رات کو عقد ہو ، اتوار کو دلہن گھر میں آئیں۔ [۱۳۴]

اسی خط میں لکھتے ہیں:

جناب شیخ صاحب کیا کہوں ، میرے گھر کا حال قابل عبرت ہے برخوردار کی والدہ تنہا ہے اور بہ سبب حوادث زمانہ کے میرے اور اس کے حواس درست نہیں رہے تمام کاروبار ابتر ہیں اللہ نے سب کچھ دیا ہے اور سنبھالنے والا کوئی نہیں ۔ خدا جلد وہ دِن لائے کہ عزیزہ نورچشمی آکر اپنے گھر کو سنبھال لیں اور ہم ان کے بار خدمت سے سبکدوش ہو کر گوشہ عزلت میں بیٹھے دیکھا کریں البتہ دو وقت کے کھانے اور کچھ کپڑے کی تکلیف دیں گے ، زیادہ کچھ نہ مانگیں گے ۔ [۱۳۵]

ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کے نام ایک خط ہے جس میں مولانا نے محکمہ تعلیم میں ملازمت حاصل کرنے کی درخواست کی ہے اور ساتھ اپنے ذاتی تعارف کا حوالہ بھی دے رہے ہیں لہٰذا لکھتے ہیں:

تسلیم و آداب سر ادب سے بجا لا کر عرض رسا ہے۔

حضور کو یاد ہوگا کہ ماہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں حضور دورے سے مراجعت فرما کر تشریف لائے اور ڈاک بنگلہ لودھیانے میں رونق افروز ہوئے تو فدوی بھی شرف اندوز ملازمت ہوا تھا۔ اس وقت فدوی پرنٹر و پبلشر مطبع مجمع البحرین میں تھا کہ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خان بہادر نے بنا کیا۔ فی الحال بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں اور محکمۂ محتشمۂ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر بہادر میں سررشتہ دار ہے چوں کہ حضوری و خدمت حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے اس قسم کے فوائد متصور ہیں۔ جن سے خلق خدا رضا مند ہو اور واسطے ہمیشہ کے نام نیک یادگار رہے؛ اس واسطے فدوی بھی آرزو مند قدم بوسی حضور کا ہے امیدوار ہوں کہ بہ نظر علم پروری جوہر شناسی اپنے وقت فرصت سے فدوی کو مطلع فرمایئے کہ حاضر حضور ہوکر دولت لازوال حاصل کروں فقط زیادہ آداب۔

آفتاب دولت و اقبال تاباں رہے!

فدوی محمد حسین آزاد
سررشتہ دار محکمۂ محتشمۂ
جنرل پوسٹ ماسٹر لاہور پنجاب
۲۵ مئی ۱۸۶۱ء [۱۳۶]

خلیفہ محمد حسین صاحب کے نام ایک خط اس وقت کا ہے جب مولانا ۱۸۶۵ء میں وسط ایشیا کے سفر پر گئے تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> گھوڑے کا گوشت اس ملک میں عام و تام ہے ۔۔۔بازار ہائے قصابی میں جو بڑا عریض و طویل بازار ہوتا ہے میں نے دیکھا کہ گوشت کی رانیں اور مُچھے دوکانوں پر اور دکانوں کے آگے جو لکڑ گڑے ہوئے ہوتے ہیں، ان پر لٹکے ہوتے ہیں۔ [۱۳۷]

اسی خط میں لکھتے ہیں:

جب ہم کابل سے بلخ کو روانہ ہوئے تو 'کتل دندان شکن' سے اُترتے ہوئے ہمارے قافلہ سالار کا گھوڑا گرا (وہ اترائی بھی میل بھر سے کم نہ تھی۔ ایسے مقاموں پر گر کر گھوڑے یا اونٹ کا سنبھلنا ممکن ہی نہیں) گھوڑا چور چور ہو گیا۔ سامنے ہی ایک گاؤں تھا لوگ وہاں کے سنتے ہی دوڑے اور تکہ بوٹی کر کے لے گئے۔ اور اپنی ہانڈیاں جا گرم کیں۔[۱۳۸]

قائم علی کو یونیورسٹی چندہ بھیجنے پر خط لکھتے ہیں:

بعد اشتیاق ملاقات بہجت ومسرت آیات (؟) کہ پایان پذیر تحریر وتقریر نہیں ہے۔ مشہود خاطر محبت مظاہر ہو دربارۂ اعانت یونی ورسٹی ضلع گورداس پور میں اور فراہمی زرچندہ کو ایک رقم زائد چھ ہزار روپے سے ہے؛ ممبران یونیورسٹی اس بذل توجہات کا شکریہ کہتے ہیں۔ فی الحقیقۃ نہایت عالی شان طور سے آپ نے اپنے وعدہ کو وفا فرمایا چونکہ ایک یونیورسٹی کلکتے میں بھی ہے، معلوم ہوا کہ رقم مذکور شاید بہ باعث کسی غلطی یا سہو کے کلکتے کو بھیجی گئی اور وہ رقم وہاں کی یونی ورسٹی میں پہنچی۔ چوں کہ کلکتہ یونی ورسٹی کے قواعد جدا ہیں، یعنی اس میں اصل اصول تعلیم انگریزی (ہے) اور یہ یونیورسٹی کہ یہاں مقرر ہوئی ہے اور اس کے لیے آپ کی خدمت میں تحریک کی گئی تھی اور آپ نے بھی اس کے لیے اس قدر حسن سعی ماضی و حال میں فرمائی ہے اور اپنے کیسۂ خاص سے بھی پہلے اعانت فرما چکے ہیں، اس کی غرض اصلی یہ ہے کہ علوم دیسی یعنی عربی و فارسی وسنسکرت وغیرہ اصل اُصول ہو کر ان کے ذریعے سے علوم وفنون انگریزی بھی رائج ہوں۔ پس اس کی غرض اور اُصول وقواعد اس سے جدا ہیں، اس واسطے آپ کی خدمت میں تکلیف دی جاتی ہے کہ بابت رقم مبالغ مذکور کے دریافت حال فرما کر مطلع فرمائیں تاکہ اس امداد گراں بہا کی اطلاع لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی خدمت میں لکھیں اور موجب خورسندی خاطر (ہو)۔[۱۳۹]

سید محمد کامل صاحب، کوہ مری کو کتاب الف لیلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جس وقت سارا نسخہ ملے گا وہ میں آپ کی خدمت میں حاضر کروں گا۔

کسی دہلی کے باشندے کے نام خط میں اُردو اخبار کے متعلق ہونے والی تحقیقات کے متعلق دریافت کیا ہے لکھتے ہیں:

> بعض معتبرین کے پاس دلی سے خط آئے جس سے معلوم ہوا کہ وہاں جو غدر سے پہلے کوئی اُردو اخبار جاری تھا اُس کے باب میں تحقیقات ہوتی ہے اور ساتھ اُس کے وہاں یہ بھی خبر ہے کہ تحقیقات مذکور پنجابی اخبار کے مہتمم یا مالک کی تحریک سے ہوئی ہے۔ بہ مقتضائے محبت و یگانگی حوالہ قلم اتحاد رقم ہے کہ اگر اتفاقاً کسی مصلحت یا مجبوری وقت سے یہ امر وقوع میں آیا ہو تو اس سے مطلع فرمایئے، اور اگر متعلقان سامی سے اس معاملے میں کچھ تعلق نہیں تو بے تکلف تحریر فرمایئے کہ تہمت بے جا کا استحالہ واجبات سے ہے، اس کی تدبیر مناسب عمل میں آئے۔ [۱۴۰]

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر کی دشمنی مولانا آزاد کے ساتھ کس حد تک ہوگئی ہوئی تھی۔ کہ مولانا اُن کی طرف سے ہونیوالی کسی بھی کاروائی سے پریشان ہو جاتے تھے۔ یہ تحقیقات پنجابی اخبار کی وساطت سے ہورہی تھیں اور پنجابی اخبار کے مالک سید محمد عظیم بھی مولانا آزاد کے مخالفوں میں سے ہیں:

محرم علی چشتی مولانا آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم کے ہم جماعت تھے اور مولانا آزاد کے شاگرد تھے۔محرم علی چشتی کو مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> مشفق من منشی محرم علی صاحب سلامت!
>
> جناب ڈاکٹر صاحب اور لالہ پرسرام کے مقدمے میں جو اکثر تحریریں سفیر ہند میں چھپی ہیں، ان کی تردید میں 'پنجابی اخبار' نے کچھ کچھ لکھا اور اس انداز سے لکھا ہے جس سے بعض اشخاص کے نزدیک مترشح ہوتا ہے کہ وہ تحریریں میری ہیں آپ کو اس معاملے میں جو کچھ میرا حال معلوم ہو تو تحریر فرماویں۔۔ [۱۴۱]

'نوشاہی' کے نام بڑا مختصر سا خط ہے لکھتے ہیں:

میاں نوشاہی جی !

کوئی میرا خط ہوتو دے دیں۔

فدوی محمد حسین آزاد عفی عنہ

۴ دسمبر ۱۸۷۶ء [۱۴۲]

محمد حسین آزاد اپنے طالب علموں کو نہ صرف علم کی روشنی سے منور کرتے تھے بلکہ اُن کی ملازمت اور ترقی کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے اور طالب علموں کو وظیفے دلوانے میں بھی سر توڑ کوشش کرتے ، حتیٰ کہ اُن کے رہنے سہنے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ سجاد حسین (طالب علم) کے نام لکھے خط میں بھی مولانا آزاد کی طلبہ نوازی اور محبت پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

ایک عرضی اپنے ہیڈ ماسٹر کے نام لکھو اور اس میں میرا نام لکھ دو کہ پیچھے وظیفہ آئے تو اسے مل جائے ہیڈ ماسٹر صاحب اس پر دستخط کر دیں میں اب تمھیں دس روپے دے دوں گا۔ سہ ماہیہ لے کر رکھ چھوڑوں گا جب تم آؤ گے تو اپنے روپے وضع کر کے باقی تمھیں دے دوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ [۱۴۳]

نوح رضوی مچھلی شہری ؛ کے نام لکھے گئے خط میں بھی مولانا آزاد اپنی عدیم الفرصتی کا ذکر کرتے ہیں نوح رضوی مچھلی شہری مولانا آزاد کی فوٹو گراف لینا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

آپ تصویر منگاتے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ کئی برس ہوئے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا کبھی آئینہ سامنے آجاتا ہے تو اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ جو شخص خود اپنی صورت دیکھ کر شرمائے اُسے فوٹو گراف اتروانا اور اس تصویر کو عالم میں مشتہر کرنا کب گوارا ہو گا۔ [۱۴۴]

خط میں یہ بھی لکھتے ہیں:

حقیقتہً اب میں اپنا حال کیا عرض کروں ؛ ڈیڑھ مہینے کے بعد آج انشاء اللہ نہانے کا ارادہ کیا ہے اگر خدا پورا کرے کیا کروں فرصت نہیں ہوتی ، اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں چار سطریں لکھوں گا ، نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دربار اکبری لکھ رہا ہوں ؛ اس میں اکبر کے امرائے دربار کا حال آپ اسی طرح پڑھیں گے جس طرح 'آب حیات' میں شعرائے اُردو کا۔ [۱۴۵]

مولانا آزاد کا ایک خط بنام کارندہ راجا صاحب ہے۔

آزاد جس مکان میں رہتے تھے اُس کے مالک کا نام دھیان سنگھ راجا تھا۔ مولانا آزاد یکم جنوری ۱۸۷۹ء سے اِس مکان میں رہ رہے تھے لیکن ۲۸ مارچ ۱۸۸۲ء کو یہ مکان مولانا آزاد سے خالی کرالیا گیا۔ اِس کے بعد مولانا آزاد بنگلہ ایوب شاہ میں منتقل ہوگئے۔ یہ خط بنام کارندہ راجا صاحب اس گھر سے منتقل ہونے کے بعد لکھا ہے۔ کیونکہ مالک مکان نے مکان خالی کروانے کے بعد آزاد پر مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے مقدمہ لڑنے کی بجائے شرافت کو ترجیح دی اور مالک مکان کو اپنا پناہ دھندہ کہا۔ اس خط سے نہ صرف مولانا کے اخلاق اور حوصلے پر بھرپور روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو کتابوں سے کس قدر محبت تھی۔ ملاحظہ کریں ان کے خط کا یہ اقتباس:

جو نالش میرے نام عدالت میں دائر کی ہے اِس کا عرضی دعویٰ دیکھئے۔ لکھا ہے کہ چھ روپے مہینہ کرایہ مکان کا تھا اور تاریخ شروع لغایت کو دیکھتا ہوں تو بے اصل ، کرایہ نامہ طلب فرمایئے تو موجود نہیں اب خیال فرمایئے اس نالش کی تردید کیا مشکل تھی ؟ مگر صرف اس لحاظ سے کہ راجا صاحب کے مقابل میں برسر اجلاس کھڑے ہوکر مجھے تردید کرنی مناسب نہیں ، میں نے زرمدنا آپ کے پاس بھیجا ، اور مجھے یقین تھا کہ آپ جو کچھ لیں گے حساب کتاب کر کے لیں گے ، بلکہ اسی واسطے اپنے بھائی کے ساتھ بھیجا کہ ہر امر کو سمجھائیں گے۔ تعجب یہ ہے کہ آپ

نے بالکل خیال نہ فرمایا : کرائے نامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ایک دالان ، دو
کوٹھریاں بند ہیں ، ان میں اسباب پڑا ہے وہ خالی کر دی جائیں گی، اگر خالی نہ
ہوں گی تو ایک روپیہ مہینہ وضع کر دیا جایا کرے گا ، وہ بھی وضع نہیں ہوا۔

کرائے نامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ کوٹھریاں جو بے دروازوں کے پڑی ہیں ،
سب میں کواڑ لگ جائیں گے یہ شرط بھی پوری نہ ہوئی۔ ایک سال بعد پانچ
کوٹھریوں میں کواڑ لگے ، باقی سب کھلی رہیں۔ اسی سبب سے مکانات خالی پڑے
رہے اور نقصان مجھے اٹھانا پڑا۔[۱۴۶]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

وہ مکان آپ دیکھیے کہ میرے دل سے زیادہ شکستہ ہے ساتھ ہی برسات آئی ، وہ
گرنا شروع ہوا اور چھپروں کے پھونس اُڑ گئے۔

۔۔۔مکانوں کی تکلیف اور اسباب کی برداشت میں جو تکلیفیں ہوئیں میں ضرور
بھول جاتا ، مگر کئی لاجواب اور نایاب کتابیں گم ہوگئی ہیں۔ ان کا افسوس نہیں
بھولتا۔[۱۴۷]

پنڈت گوپی ناتھ ، کے نام مختصر سا خط ہے لکھتے ہیں:

فرمائش حالی کی تعمیل میں مقصر رہا۔ آپ جانتے ہیں کہ نہ وہاں کوئی قاعدہ
ہے نہ کوئی کسی کی سنتا ہے ، خصوصاً ہم لوگ کہ معمولی قواعد کے عادی ہیں اور
انھیں ہم لوگوں سے قدرتی لاگ ہے یقین ہے کہ آپ بھی اس عذر کو پذیرائی
فرمائیں گے۔[۱۴۸]

مولانا آزاد نے ایک خط اپنے دوست جو ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اُن کے نام
لکھا۔مولانا آزاد کو اپنے استاد ذوق اور اُن کے کلام سے عشق تھا۔مولانا آزاد نے اپنے بیٹے کا نام

بھی آغا محمد ابراہیم اپنے اُستاد مرحوم کے نام پر رکھا تھا اور اپنے استاد مرحوم کا دیوان مرتب کیا تھا۔''
بنام میاں مذاق شاگرد ذوق مرحوم'' کے نام خط میں بھی اپنے اُستاد مرحوم کے دو قصیدوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> اس ہفتے پٹنے سے کسی خدا ترس بندے کی تحریر پہنچی ، اس نے آپ کا نام مبارک لکھا ہے کہ بدایوں میں اُن کے پاس دو قصیدے اُستاد مرحوم کے ایسے ہیں کہ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہیں ، میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ عجیب نہیں جن دنوں آپ دلی میں تشریف رکھتے تھے ، والد مرحوم کی چھوٹی بیاض یا استاد مرحوم کے مسودات خاص میں سے آپ نے دو قصیدے نقل کیے۔ آپ وہ دونوں قصیدے عنایت فرمائیں تو اس مجموعے میں داخل کیے جائیں تا کہ اگر دیوان مطبوعہ میں نہیں مشتہر ہوئے تو اب مشتہر ہو جائیں ۔ [۱۴۹]

مولانا آزاد نے ایک مختصر سا خط اپنے بیٹے آغا ابراہیم حسین کو بھی لکھا ہے۔ یہ خط آغا ابراہیم کے ماموں احمد مرزا صاحب کے ہاں سے لکھا ہے۔ اِس وقت آغا ابراہیم کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے سسرال گئے ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں:

> بہتر ہے کہ آج رات کی ریل میں روانہ ہو جائیں ، کیوں کہ مجھے پٹیالے میں بھی ٹھہرنا ہے، سیدی عزیزی میر افضل حسین صاحب کو میری طرف سے سلام و دعا کہو اور رُخصت طلب کرو۔[۱۵۰]

ایک اور خط ' بنام کوتوال لاہور' ہے یہ خط آزاد کے ذہنی تعطل کے دنوں کا ہے۔ لکھتے ہیں:

> جناب کوتوال صاحب ! کرم فرمائے نیاز منداں سلامت !
> بعد از سلام نیاز آں کہ چند کتابیں کتب خانہ آزاد میں بہ اوقات مختلفہ چوری ہوگئی ہیں اس اُمید پر کہ شاید کبھی نظر آجائیں اور سرکار میں گرفتار ہو سکیں ، فہرست ارسال خدمت کرتا ہوں کہ دفتر سرکار میں امانت رہے۔ فقط۔۔۔ [۱۵۱]

ایک خط پنجابی اخبار کے مہتمم کو لکھتے ہیں ' پنجابی اخبار' دہلی کے سید محمد عظیم دہلی دروازے سے نکالتے تھے۔ سید عظیم دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس خط میں برہمو دھرم کے لکچر کے متعلق لکھا ہے۔ اور انجمن سے گلہ کیا ہے کہ اُنہوں نے اس پر کوئی کاروائی کیوں نہیں کی۔ مولانا آزاد برہمو دھرم کے لیکچر کے متعلق لکھتے ہیں:

> اُنھوں نے پہلے تو نیچے کے سُر سے کچھ کہنا شروع کیا کہ سب کے کان ادھر ہی لگ گئے کہ خدا جانے کیا اسرار کہتے ہیں ، پیچھے سر جھکا ، اور سلسلہ چلا۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنے والے نے عبارت بری نہیں لکھ دی تھی ، پر بابو صاحب اسے اچھی طرح یاد کر کے نہ آئے تھے ؛ جا بجا اُلجھتے تھے اور ٹھوکریں کھاتے تھے خصوصاً چند فقروں کے بعد جب وہ کہتے تھے کہ '' اٹ فشٹ اور دی فشٹ '' تو عجیب عالم ہوتا تھا ، جیسے مچھلی کھاتے کھاتے منہ میں کانٹا آ جاتا ہے۔۔۔ اِس میں بھی شک نہیں کہ بعض بعض مذہبوں اور ان کے خداؤں کو بُہت خراب کہا۔ مگر ہمیں اشتیاق اِتنا رہ گیا کہ اُنھوں نے خود اپنے خدا کی کچھ صفت نہ بیان کی۔ حقیقت یہ ہے کہ برہمو دھرم بُہت اچھا دھرم ہَے مگر ہمیں ہنسی اُس وقت آتی ہَے جب وہ کہتے ہَیں کہ اِس کی بنا خاص عقل خدا داد پر ہَے یہ دھرم خدائی ہَے ، جب سے خدا تھا جب سے یہ تھا۔ یہ سب مذہبوں پر مقدم ہَے کیوں کہ کوئی مذہب اس کے اُصولوں سے خالی نہیں۔ دیکھو! جو اچھی باتیں ہَیں سب مذہبوں میں اچھی ہَیں ، وہی دیکھو اس کے اصل اُصول ہیں۔ جو بُری باتیں ہَیں، سب مذہبوں میں منع ہَیں ، انھیں سے یہ ممانعت کرتا ہے۔ بس تو معلوم ہوا کہ یہ ہر مذہب سے پہلے تھا اور ہر مذہب میں اِس کے نور کا ذرہ موجود ہے۔۔۔ ہمیں انجمن سے بڑا تعجب ہَے کہ اس لیکچر کو کیوں کر گوارا کیا۔ وہ رول (قانون) آچیسن صاحب کا بندھا ہوا کیا ہوا کہ خاص مذہب کے متعلق جلسہ یہاں نہ ہوگا ، خصوصاً یہ تو ایسا جلسہ تھا کہ مذاہب خاص کی تضحیک حد سے گزر گئی۔۔۔ بات یہ ہَے کہ میں برہمو سماج کے برخلاف نہیں مگر جس طرح یہ جو اُنھوں نے ژند ، اوستا ، وید ، قرآن سے

لے کر توریت ، زبور ، انجیل ، سب کی تضحیک اور تحقیر کی اور خاکہ اُڑایا ۔ یہ مجھے
اچھا نہیں معلوم ہوتا: [۱۵۲]

۱۸۶۷ء میں مولانا انجمن پنجاب کے سیکرٹری اور اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی تھے۔ مولانا پچاس روپے ماہوار پر سائنس اور زبان اُردو و فارسی پر لکچر دیا کرتے تھے۔ اُن دنوں آزاد نے 'بنام انجمن پنجاب تجویز برائے علم طب' ایک خط انجمن کو لکھا جس میں علم طب کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور تجویز دی کہ علم طب پر ایک کتاب ایسی تصنیف کی جائے اور یونیورسٹی ایک معقول رقم اس کے انعام پر عطا کرے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> علم طب ایک ایسا علم ہے کہ غریب یا امیر ، جوان یا پیر کوئی شخص اِس کی ضرورت سے خالی نہیں ۔۔۔ خفیف سے خفیف مرض یا عارضے کے لیے بھی طبیب کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ اور اس سے بھی سخت تر قباحت یہ ہے کہ اکثر امراض مثل زکام یا کھانسی یا بعض قسم کے درد یا سوء ہضمی یا فسادِ خون جو ذرا سی بے احتیاطی سے پیدا ہو جاتے ہیں ، صرف باعث ان کی ناواقفیت علمی کے عارض ہو جاتے ہیں کہ انجام کو ان کا انسداد بہت طول کھینچتا ہے ۔۔۔ سبب اس کا اوّل تو وہی وبائے عام یعنی بے پروائی ہمارے اہلِ وطن کی ہے ، اور دوسری وجہ قوی یہ ہے کہ کتابیں جو تصانیف سابقہ علم طب کی ہیں ، مطلب بعیدہ اور عبارت مغلقہ اور ترتیبات پیچیدہ میں ہیں ۔اس واسطے مناسب ہے یہ ایک ایسی کتاب تصنیف کی جائے جس میں جملہ امراض کے سبب اور علامتیں اور معالجات مجرب عبارت اُردو میں بیان ہوں اور اس کے ساتھ ایک قرابا دین اور بیان مفردات کا بھی ہو۔ ترتیب اور بیان اس کا اس طرح کا ہو کہ تھوڑے سے صاحب استعداد کے بھی سمجھ میں آجائے اور اس کی واقفیت سے اکثر امراض عامہ کا علاج اور پرہیز ہائے واجبہ کا لحاظ رکھ سکیں ۔ ایک رقم معقول اِس کے انعام پر مدتصنیف یونیورسٹی سے عطا کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی تصنیف خالی نفع عام سے نہیں ہوگی ۔ [۱۵۳]

'چندہ دھندگان' کے نام ۲۸ مئی ۱۸۶۸ء میں لکھتے ہیں:

بخدمت صاحبان چندہ دھندگان یونیورسٹی، شہر لاہور۔

بموجب آپ کی تجویز کے جو کہ جلسۂ دربار واقعہ ۲۵ ماہ حال میں نواب لیفٹیننٹ کی خدمت میں بیان کیے گئے اور اِس پر صاحب ممدوح نے اظہار خورسندی شکر گزاری بیان کی اور وہ یہ تھا کہ جو چندہ کہ آپ صاحب دیتے ہَیں وہ مکتب حال کی نسبت کسی اور برگزیدہ کام پر لگانا چاہیے، جس سے کہ زیادہ تر فائدہ یونیورسٹی (کوہو) اور نام وری آپ کی ہو۔ اس لیے مناسب ہَے کہ فوراً اسکول موجودہ بند کیا جائے تا کہ مصارف اور زیادہ نہ ہونے پائیں، کیوں کہ فی الحال بھی ہم لوگ ایک ہزار روپے کے مقروض معلمان اور پنڈتان سکول کے ہیں۔ اس واسطے اطلاع دی جاتی ہَے کہ اس مہینے کے اخیر پر یہ سکول بند کیا جائے اس لیے مناسب ہَے کہ سب صاحبوں کو اطلاع دی جائے اور آپ سب صاحب اپنے اسم سامی اس اطلاع نامہ انسداد اسکول پر درج فرمادیں اور بقایا چندہ سابقہ اور آیندہ سال بہ سال دیتے رہیں اور حق دار اپنے حق کو پہنچیں۔

اُمید ہَے کہ اپنے مضمون میں جن لوگوں نے اچھا کام کیا ہے۔ ان کے واسطے سرکاری مکاتب میں کچھ بندوبست کرنے کی تجویز ہَے اور راقم کو یہ فائدہ دیا گیا ہَے کہ چیدہ چیدہ لوگوں سے پوچھو، جو یہ کہیں کہ کام بخوبی ادا کیا ہَے اور لائق و فاضل ہیں، جیسے کہ جگہ خالی ہوگی، ویسا عمل کیا جائے گا۔[۱۵۴]

''مہتمم ہمائے پنجاب'' کے نام مولانا آزاد نے یہ خط ۱۸۷۰ء میں لکھا۔ مولانا آزاد نے اِس خط میں انگریزوں کی ناانصافیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مشرقی علوم حاصل کرنے والوں سے انگریزی حکومت بےتوجہی برت رہی ہَے اچھی ملازمتیں دینے کے لیے نسبت و حیثیت کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ خط میں انگریزی حکومت کے رویے پر طنز کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر صاحبان انگریز ہیں اور اس میں کیا کلام ہے کہ لیاقت اور قابلیت ان عہدوں کی انھیں لوگوں کو ہے۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ یہاں کی رعایا کے گھروں کا کیا حال ہوگا اور سفید پوشوں اور قدیمی اشرافوں پر دونوں وقت کیا گزرتی ہوگی خصوصاً جس حال میں قدیمی عہد کے دیکھنے والے بھی ابھی بقیہ موجود ہیں۔[۱۵۵]

مولانا آزاد موسم گرما کی تعطیلات میں سیر و سفر پر نکلے تو ان کا گزر نکودر علاقہ جالندھر سے ہوا۔ وہاں مولانا آزاد کو کچھ وجوہات کی بنا پر رُکنا پڑا۔ چنانچہ وہاں سے آزاد یہ خط بنام مہتمم اخبار انجمن احوال نکودر لکھتے ہیں:

چونکہ بعض اسباب سے یہاں ٹھہرنا واجب ہوا، اس لیے جو کچھ معلوم ہوا یہاں کا حال بھی لکھتا ہوں۔ اگر مناسب ہو تو درج اخبار فرمائیے گا؛ یقین ہے کہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ یہ قصبہ قدیمی آبادی ہے اکبر نامہ میں بھی ذکر اس کا موجود ہے مگر یہ نہیں کھلتا کہ کس نے آباد کیا اور کب آباد کیا یہاں یہ مشہور ہے کہ نکودر کوئی راجپوت تھا؛ اس کے نام سے یہ آبادی قائم ہوئی۔ چنانچہ اس کی اولاد اب تک اس قصبے میں ہے اور غلام غوث ان میں سے معزز اور صاحب جائداد لمبردار ہے۔ یہاں کے مقبرے دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک مقبرہ محمد مومن کا ہے اور دوسرا حاجی محمد جمال کا۔ یہ دونوں شخص امرائے عہد جہانگیری سے ہیں۔۔۔تاریخ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اکبر یہاں سے گزرا تو مقام خوش فضا دیکھ کر ابوالفضل کو بیس ہزار روپے کا سونا دیا اور حکم دیا کہ یہاں ایک پل اور عمارت بنائے کہ اس میں آبشار یعنی پانی کی چادر بھی جاری ہو۔ پھر جب کہ آخر سن ۲ جلوس میں جہانگیر کا یہاں سے گزر ہوا تو اس کو بھی یہ جگہ بُہت پسند آئی چنانچہ عمارت اکبری کا ذکر بیان کر کے اپنی تو زک میں لکھتا ہے۔کہ فی الحقیقت دلچسپ اور باطراوت مقام ہے۔ جاگیردار کو حکم دیا کہ اس پل کے ایک

طرف عمارت اور باغ لگا دے تا کہ جو مسافر یہاں آ کر ٹھہریں اور لطف اٹھاویں۔ اب محمد مومن کے مقبرے میں مدرسۂ سرکاری ہے۔ یہ عمارت ۱۰۲۱ھ میں بنی تھی۔ مگر ایسا دلکش مکان ہے کہ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ [۱۵۶]

خط ''بنام مدیر اخبار'' (؟)

یہ خط ایک اُردو اخبار کے مدیر کو لکھا گیا تھا۔ اِس میں مولانا نے اپنے لیکچر پر ہونے والے اعتراضات کے متعلق لکھا ہے۔ مولانا آزاد نے یہ لیکچر نیچر کی شاعری کے متعلق ۱۸۷۴ء میں دیا تھا۔ اس لیکچر پر آزاد کے حق اور مخالفت میں آراء اخباروں میں شائع ہونے لگیں۔ قدامت پسند اور روایت پسند لوگوں کو آزاد کی تجویزیں پسند نہ آئیں۔ اور وہ اِن تجویزوں کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے لگے۔ آزاد کا لیکچر ملاحظہ کریں:

اے میرے اہل وطن ، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں ، نہیں اس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے مگر کیا کرے کہ خلعت پرانے ہو گئے اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ، ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے ، اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے ، یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو اور تمہیں افسوس نہیں آتا کہ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے اور تمہیں درد نہیں آتا۔ اپنے خزانے اور نئے توشہ خانے سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو یہ وطن کا فرض ہے کہ قرض سے زیادہ اس کا ادا کرنا واجب ہے۔

اے میرے اہل وطن آؤ آؤ ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اٹھو۔اٹھو۔ وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرانے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی اور اس فخر آبائی اور بزرگی کی کمائی سے محروم ہونا پڑے افسوس کا مقام ہے۔

اے خاکِ ہندوستان اگر تجھ میں امراءالقیس اور لبید نہیں تو کوئی کالی داس ہی نکال ، اے ہندوستان کے صحرا و دشت ! فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کردو۔ [۱۵۷]

اخبار سر رشتہ تعلیم اودھ' بابت یکم جولائی ۱۸۷۴ء میں منشی غلام حسین صاحب نے آزاد کے لیکچر پر کچھ اِسی قسم کی مخالفانہ رائے دی ۔لہٰذا اس خط میں مولانا آزاد نے اپنے مخالف سید غلام حسین کی تحریک پر شائع ہونے والے تبصرے کا جواب دیا ہے۔

مولانا آزاد کا اس تبصرے پر جواب لکھنے سے پہلے ضروری ہَے کہ یہاں پر سید غلام حسین کا تبصرہ لکھا جائے تا کہ خط کا جواب سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

سید غلام حسین لکھتے ہَیں :

۔۔۔مولوی محمد حسین آزاد کا لکچر قابل غور ہَے واقعی بڑے زور وشور کا لکچر دیا ہَے اور بڑا زور طبیعت پر ڈالا ہَے مولوی صاحب کی فصاحت و بلاغت اور علم وفضل میں کیا شک ہَے ۔ اِن کی تقریر سحر آمیز ولولہ خیز کی کیفیت تو کوئی لکھنؤ والوں کے دل سے پوچھے کہ معلوم ہوتا ہَے گویا مولوی صاحب انگریزی میں تقریر کیا چاہتے تھے بھولے سے اُردو بولنے لگے جو لوگ انگریزی دان ہیں ان کے نزدیک مولوی صاحب بہت عمدہ نمونہ ہیں اس

اُردو کا جو بظاہر ہندوستانی ہے اور بباطن انگریزی جس کا پیدا کرنا حکام والا مقام کومنظور ہے مگر جو بچارے کمبختی کے مارے انگریزی سے بے بہرہ ہیں ان کی مٹی خراب ہے وہ جب اس تقریر کو دیکھیں گے منہ دیکھتے رہ جائیں گے کہ یہ لفاظی اور یہ ترکیب اور یہ بندش وچستی وتسلسل اضافات اورحسن بیان اورطلاقت لسان کسی عالم شاعر۔ نثار داستان گو کی تحریر میں نہیں دیکھی، یہ رنگ نرالا ہے مگر ہم اپنی کم فہمی اور کند ذہنی کو روتے ہیں کہ سارا لیکچر پڑھا گیا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کوکس امر کی شکایت ہے اورکس عیب کی اصلاح میں دریا بہائے ہیں غرض بعد فکر بسیار دو تیں ذہن میں آئیں ایک یہ کہ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ اُردونظم استعارات وتشبیہات سے معرا ہوکر انگریزی کے ڈھب پر آجائے دوسرے یہ کہ عاشقانہ مضامین سے پرہیز کیا جائے ، صنائع و بدائع ، خداوند کریم کی تعریف وتوصیف یا اخلاقی مضامین نظم کئے جائیں ، پہلے امر کی نسبت ہماری یہ گزارش ہے کہ جب تک ہندوستانیوں پر علی العموم انگریزی تعلیم اور یورپ کی شائستگی کا اثر اس قدر نہ ہوگا کہ ان کے خیالات اور اخلاق و اطوار جو ہزار برس سے ایک خاص طرز پر چلے آتے ہیں بالکل متغیراور منقلب نہ ہو جائیں تب تک ان کے کلام میں ہرگز انگریزی کا رنگ نہ آئے گا اور اگر کوئی صاحب ایسا قصد کریں گے جیسے مولوی صاحب نے ایک شمۃ اس نظم جدید کا لکھا ہے جس کے اختراع کے وہ درپے ہیں تو ناحق ہنسے جائیں گے کوئی پوچھے گا بھی نہیں کہ یہ ہے کیا بلا۔ رہا سرکاری مدرسوں میں جاری کرنا تو وہ نظم جدید جس کے موجد مولوی صاحب ہیں اس قدر رائج نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان کی قومی نظم ہو جائے ، رہے استعارات وتشبیہات تو ان کے بغیر شعر کا لطف نہیں ، کیا انگریزی میں استعارات نہیں ہوتے اپنا اپنا رنگ ہے یہ کیا کہ اس قسم کے استعارات اُردو

میں بھی لائے جائیں جیسے انگریزی میں ہیں اور شعر کو استعارات سے مبرا کرنا تو ہماری دانست میں ایسا ہے جیسے کسی نازنین عورت کو زیور لباس چھین کر بالکل برہنہ کر کے سامنے کھڑا کر دیا جائے اس وقت سوائے آنکھ نیچی کر لینے کے اور لاحول پڑھ لینے کے ہم سے اور کچھ نہ ہو سکے گا۔دوسرے امر میں ہمارا سوال یہ ہے کہ آیا مولوی صاحب کی مُراد یہ ہے کہ اُردو نظم کا دارومدار مضامین عاشقانہ پر ہے اور سوائے ایسے مضامین کے اور کسی قسم کے مضامین ہوتے ہی نہیں یا یہ غرض ہے کہ متقدمین اور متاخرین نے عشق کو شعر کا ایک جزو اعظم قرار دیا ہے اور ان دونوں میں ایسی نسبت قائم کر رکھی ہے جیسے طعام اور نمک میں۔ پہلی شق کا جواب یہ ہے کہ اُردو نظم کا انحصار مضامین عاشقانہ ہرگز نہیں ، ہر قسم کے اور ہر رنگ کے مضامین اس عمدگی اور لطافت کے ساتھ نظم ہو چکے ہیں اور نظم ہوتے جاتے ہیں کہ اگر سوسائٹیاں ایسی ایسی مقرر ہوں اور سو برس تک ایسی بے سود کوششیں کریں اور لاکھ روپیہ انعام دیں تو بھی اس سے بہتر نظم نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ مشتے از خروارے میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کو دیکھئے کہ فصاحت و بلاغت جوش وخروش ولولہ و طنطنہ استعارات وتشبیہات غرض جملہ محاسن شعرا س میں موجود ہیں یا نہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ جن مضامین نازیبا کی شکایت مولوی صاحب کو ہے ان کا کہیں نام نہیں ہمارا یہ دعویٰ ایسا ہے کہ از شرق تا غرب و از جنوب تا شمال کوئی اُردو شناس ایسا نہیں جو اس کا انکار کر سکے مولوی صاحب کو لازم ہے کہ ان دونوں صاحبوں کے کلام کو جمع کر کے نظرِ تفصیلی سے دیکھیں کہ جن عیوب کے وہ شاکی ہیں ان سے ان کا کلام مبرا اور جن محاسن کے وہ خواہاں ہیں ان سے وہ آراستہ ہے یا نہیں اگر مولوی صاحب کو کچھ بھی مذاق شعر ہو گا تو ان حضرات کے کلام کو مدارس سرکاری میں جاری

کرنے کا مشورہ دیں گے اور ذوق غالب اور سودا وغیرہ کے قصاید کو نظمِ اُردو کا محک قرار دیں گے اور اُردو نظم کو انگریزی ڈھنگ پر لا کے بگاڑنے کا قصد نہ کریں گے۔

دوسری شق کا جواب سنیئے ہمارے نزدیک بے شک عشق شعر کا جز و اعظم ہے اس کے بغیر اس کا مزہ نہیں اور ہم کیا ہیں سلف سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ اب اگر یہ کہیئے کہ کیا ضرور ہے کہ جو اگلے زمانے کے لوگوں نے کیا تھا وہی آپ بھی کیجئے اور اس لکیر کے فقیر ہو جایئے۔ یہ زمانہ تو ترقی اور اصلاح کا ہے ہم کہتے ہیں مگر ترقی اور اصلاح تو اس چیز کی ہوتی ہے جس میں کوئی نقص یا عیب ہو ہم تو کہتے ہیں عشق شعر کی جان ہے، اس کے بغیر اس کا لطف نہیں اور عشق فی نفسہ بلا اضافت بغیر عقلاً امر حسن ہے قبیح ہرگز نہیں اور جب اس کی نسبت معشوق حقیقی کی طرف ہو جیسے خواجہ حافظ اور مولانا روم اور حضرت امیر خسرو اور شمس تبریز وغیرہ کا مذاق ہے تو یہ باعثِ تزکیہ نفس اور وسیلہ نجات ہوتا ہے، رہا اس کا منسوب کرنا نہ کرنا پڑھنے والے کی سخن فہمی اور نیت پر موقوف ہے، اسی طرح شعرائے اُردو کے کلام میں جو مضامین عاشقانہ ہیں ان کا مرجع ومقصود یا تو وہی معشوق حقیقی ہے یا کوئی شخص موہوم جس کا وجود بجز ذہن شاعر کے اور کسی ظرف میں نہیں ہے اور جس کی مدح و تعریف سے شعر کا مقصود صرف طبع آزمائی اور اظہار کمال اور سامع کا دل خوش کرنا ہوتا ہے۔ رہا یہ امر کہ نوجوان لڑکوں کو ایسے مضامین سمجھانا، نا مناسب ہے تو کیا ضرور ہے کہ عاشقانہ غزلیں انہیں پڑھایئے اور اس قسم کی نظمیں تعلیم کیجئے غرض ہماری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تو ہمارے نزدیک مناسب نہیں بلکہ محالِ عقل ہے کہ نظمِ اُردو کو انگریزی کے رنگ پر لا کر ایک جدید اختراع کی جائے یہ امر اس وقت ہو گا جب انگریزی تعلیم کا اثر اس

قدر ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کے خیالات اور زبان اور اطوار و عادات جو باعث حدوث خیالات ہیں ، بالکل بدل جائیں ، ہاں اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ جو طرزِ سخن ہزار ہا برس سے چلا آتا ہے اس میں ترقی تو کی جائے۔ اس طرح جا بجا مشاعرے اور شعر وسخن کی محفلیں کی جائیں اور جو لوگ عمدہ اور مفید قصیدہ وغیرہ کہیں انہیں انعام واکرام دیا جائے تو دیکھیئے چند ہی روز میں اُردو نظم کیا سے کیا ہو جاتی ہے ، باقی سب ڈھکوسلا ہے سوائے تضیع اوقات اور مضحکے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ [۱۵۸]

مولانا آزاد اِس کے جواب میں لکھتے ہیں:

آغاز مقصود میں جو فرماتے ہَیں ، خلاصہ اس کا (یہ ہے) کہ:لیکچر مذکور سے فقط دو باتیں مستنبط ہوتی ہَیں اوّل یہ کہ اُردو نظم استعاروں اور تشبیہوں سے معرا ہو کر انگریزی کے ڈھنگ پر آجائے۔ میں عرض کرتا ہَے کہ لیکچر مذکور میں صاف لکھا ہے: ''بے شک مبالغے کا اور تشبیہہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہَے لیکن نمک اُتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک ، نہ کہ تمام کھانا نمک'' پھر چند فقروں کے بعد میں نے عرض کیا ہَے کہ ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بہ موجب استعارے اور تشبیہہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے ہیں۔'' جب ان کا ارشاد اور اس بندۂ آثم کی تحریر کا مآل متفق ہَے تو پھر جو جو کچھ اُنھوں نے ارشاد فرمایا ، اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

دوسری بات وہ میرے لیکچر سے یہ استنباط فرماتے ہَیں کہ : عاشقانہ مضامین سے پرہیز کیا جائے اور صنائع و بدائع ، خداوند عالم کی تعریف وتوصیف اور اخلاقی مضامین نظم کئے جائیں۔'' اور اس پر فرماتے ہَیں کہ : اگر اس سے یہ مراد ہَے کہ اُردو نظم میں سوائے عاشقانہ مضامین کے اور کچھ ہَے، نہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔'' بعد اس کے میر انیس اور مرزا دبیر صاحب کی تصانیف کے لیے فرماتے ہیں کہ مدارس سرکاری میں پڑھائی جائیں۔ فقط۔۔۔

عاشقانہ مضمونوں کے باب میں جو کچھ اُنہوں نے فرمایا بے شک میری بھی یہی رائے ہَے کہ بے عشق کے کلام بے مزہ رہتا ہے۔ لیکن میرے تمام لیکچر میں یہ کہیں نہیں ہَے کہ عاشقانہ کلام کو بالکل ترک کرنا چاہئے۔ اور خود انگریزی کلام بھی عشق سے خالی نہیں۔ ہاں یہ بے شک عرض کیا ہَے کہ: "ہماری نظم کے مضامین عشق ،شراب ، ساقی ، بہار وخزاں فلک کی شکایت، امرا کی خوشامد وغیرہ مطالب میں ہوتے ہیں۔ اور ان محدود احاطوں سے اگر ذرا بھی نکلنا چاہیں تو بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ پس کوئی تدبیر ایسی نکالنی چاہیے جس سے میرے اور آپ کے اہل زبان میں ایسی قوت پیدا کریں کہ ہر ایک سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون کو اُسی خوبی سے ادا کرسکیں جس طرح کہ شعرا اپنی غزلوں اور قصیدوں میں دادِ سخن دیتے ہَیں یا میر صاحب اور مرزا صاحب اپنے سلام اور مرثیوں میں، بندہ آثم نے انگریزی نظم سے تشبیہہ فقط اس لحاظ سے دی تھی ، ورنہ یہ تو ہر شخص جانتا ہَے کہ کیا انگریزی ، کیا عربی ، کیا فارسی ایک زبان کے خیال جن الفاظ اور جن لباسوں میں اپنے خاص انداز سے ادا ہوتے ہَیں ، وہ دوسری زبان میں آکر بالکل بے لطف ہو جاتے ہیں۔

خاتمہ کلام پر میں اپنے دل کو خود مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ رائے مذکور میں بھی یہ تجویز مناسب تصور کی گئی ہے۔ کہ جا بہ جا مشاعرے مقرر کیے جائیں۔ اور جو لوگ عمدہ اور مفید قصیدے وغیرہ کہیں ، انھیں انعام دینا مناسب تصور کیا ہَے اور جب دونوں کا مقصود ایک ہَے تو بُہت مناسب ہَے کہ وہ بھی اس امر میں سعی فرمائیں اور ہماری قومی زبان اور قومی نظم اعتراض کا نشانہ بن رہی ہے۔ اِس سے اسے نجات بخشیں کہ اپنے اہل وطن کو عموماً اور اس ذرۂ بے مقدار کو خصوصاً گرانبار منت و احسان فرمائیں۔

امید ہَے کہ اس نیاز نامے کو براہ عنایت اخبار میں جگہ دیجیے تا کہ جن حضرات نے میری تحریر کو باعث اجمال تحریر یا نظر سرسری کے اپنی رائے (کے) مخالف سمجھا ہَے وہ شریک حال اور متفق ہو کر مساعی ہوں اور نتیجہ مطلوبہ جلد حاصل ہو ۔[۱۵۹]

مولانا کا سر سالار جنگ کے نام ایک فارسی میں لکھا ہوا خط ہے اور دوسرا مولانا کا لکھا ہوا اُردو میں سپاس نامہ ہے جو سر سالار جنگ نے ولی عہد برطانیہ کی دہلی میں آمد کے موقع پر بہ حیثیت نظام دکن پیش کیا ۔مولانا آزاد نظام کی زبانی لکھتے ہیں:

آج ایک سو بیالیس برس کے بعد نظام دکن کو حسب الطلب بادشاہ عہد کے پھر آنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ سب سے آخر آنا وہ تھا کہ ۱۱۵۱ ھ میں دربار دہلی نے طلب کیا۔ لیکن اس آنے اور اُس آنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ طلب اس لیے تھی کہ تخت و تاج کو نادری غارت و تاراج سے بچائے ؛ آج اس لیے طلب ہے کہ دربار شاہنشاہی میں قیصری خطاب کی تہنیت اور مبارک باد میں شامل ہو۔ اُس آنے میں دربار سے قلم دان وزارت ملا تھا ، آج دربار شاہنشاہی سے خطاب ---عطا ہوا ہے۔[۱۶۰]

بنام ۔ ؟

یہ خط مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہوا ہے ۔نیچر کی شاعری پر تیسرا مشاعرہ تین اگست ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا تھا جس کا موضوع ' امید' تھا۔ مولانا اِس دوست کو آگاہ کر رہے ہیں کہ :

ایک رسالہ مشاعرے کا جس میں' امید کی خوشی' پر مضامین لکھے گئے تھے وہ انجمن سے روانہ کیا گیا تھا، اس کی رسید سے بھی آگہی نہ ہوئی ۔خدا کرے مانع اس کا سوائے افکار نظم کے اور کچھ نہ ہو ![۱۶۱]

دو خط بنام محکمہ اطلاعات ہیں مولانا آزاد کو محکمہ اطلاعات عامہ عربی اخبار بھیجتا تھا اور مولانا آزاد انگریزوں سے متعلق عبارتوں کا ترجمہ کر دیا کرتے تھے کیونکہ مولانا آزاد محکمہ اطلاعات کی طرف سے عربی اخبارات کے ترجمے کرنے پر مامور تھے۔ اس مجموعے میں ایک مصری اخبار ' احیاء' کے

کالموں کے ترجمے ہیں۔جس نے انیسویں صدی میں انگریزوں کے خلاف با قاعدہ تحریک شروع کی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی مہدی سوڈانی کا حامی تھا۔ انگریز حکومت کو اس تحریک سے بڑی تشویش تھی۔ اخبار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

کل کی ڈاک میں احیاء نمبر ۱۳ مجریہ ۱۰ جولائی پہنچا اوّل ایک چار کالم کا طولانی آرٹیکل لکھتا ہے اور تمہید میں بڑی خوشی اور سحر (سرور ؟) کے ساتھ انگریزی کاروائی پر تمسخر کرتا ہے پھر جب سے مصر میں انگریزی مداخلت شروع ہوئی اور جس طرح وقت بہ وقت بڑھتی گئی ، اس کی حالت بیان کرتا ہے اور ہر کام میں بدنیتی کی تہمت لگاتا ہے آخر پر کہتا ہے جب خرطوم قبضہ انگریزی سے نکل گیا تو کیا خیال میں آسکتا ہے کہ محمد احمد کا دعویٰ مقامات محدود بند رہے گا۔ [۱۶۲]

دوسرے خط میں سید جمال الدین افغانی کے عربی رسالے عروۃ الوثقیٰ جو پیرس سے جاری ہوتا تھا کے متعلق لکھتے ہیں:

جناب عالی! اخبار عروۃ الوثقیٰ بہ زبان عربی جو پیرس میں ہوتا تھا ، اس کے ۱۸ نمبر اکتوبر ۱۸۸۴ء تک مسلسل اخبار عام میں آئے اور ترجمہ اس کا حضور میں برابر عرض کیا گیا جب سے اب تک کوئی اخبار نہیں آیا۔ [۱۶۳]

ایک خط بنام سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب ہے۔اس میں بھی عربی اخبار عروۃ الوثقیٰ کے متعلق لکھا ہے ۔مزید اس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ میں انگریزی میں ترجمہ نہیں کر سکتا اِس لیے اخبار مذکور کا اُردو میں خلاصہ کر کے بھیج دیا کروں گا۔اس کی وجہ مولانا آزاد یہ لکھتے ہیں:

آنر سر !

عربی اخبار جو پیرس سے نکلا ہے ، اس کے پہلے اور دوسرے نمبر کا خلاصہ بھیج چکا ہوں۔ وہ ترجمہ انگریزی میں میرے بیٹے نے کیا تھا ، جو کہ کل رڑکی کو روانہ ہوا۔ وہ انجینئرنگ کلاس میں وہاں پڑھتا ہے۔ اب اُمید نہیں کہ ہر وقت مجھے کوئی معتبر

اور رازدار آدمی مل سکے جو میرے خلاصے کا انگریزی میں ترجمہ کر سکے اس واسطے اخبار مذکور کا اردو میں خلاصہ کر کے بھیج دیا کروں گا۔ حضور کے عالی دفتر میں ترجمہ ہو کر آپ کے ملاحظے سے گزرے گا۔ فی الحال نمبر ۳ اور نمبر ۴ کا خلاصہ بھیجتا ہوں۔ فقط

محمد حسین آزاد

۱۸۸۵ء [۱۶۴]

اس کے بعد تین عرضیاں ہیں پرنسپل گورنمنٹ کالج کے نام جن میں مولانا آزاد نے بیماری کے سلسلے میں رُخصت مانگی ہے۔ یہ تینوں عرضیاں ۱۸۸۵ء کی ہیں جب آزاد کا ذہنی توازن بگڑ رہا تھا۔

دیوان ذوق کی تدوین مکمل ہونے پر آغا محمد ابراہیم نے اپنے والد (مولانا آزاد) سے فرمائش کی کہ وہ دیوان ذوق پر کچھ لکھ دیں۔ مولانا آزاد نے قلم پکڑا اور عالم وارفتگی میں یہ عبارت لکھ دی:

ہاں برادران عزیز! ایک حساب سے دو پشت اور دلی سے نکل کر چونتیس برس ہم تم ساتھ رہے؛ پریشانی اور سرگردانی حد سے گزری مگر رفاقتوں میں فرق نہیں آیا۔ پیارے بھائیو! اللہ نے تمھیں ہیئت مجموعی دی ہے؛ آج تک میرے پاس امن و عافیت کے دامن میں سوئے: اب اکیلے نکلتے اور آزادی کے زور سے اٹھتے ہو۔ رواج کے پروں سے اڑو، عالم کی وسعت میں پھیلو، شہرت کے شہروں میں پھرو، وقت کی درازی میں عمر پاؤ! اللہ تمھارا نگہبان ہے؛ تم بھی مجھے خدا حافظ کہو! پیارے بھائیو! دیکھنا، دنیا ایک مقام ہے، بچ کر چلنا، دشمنوں کا شمار نہیں اور دوست اللہ ہی اللہ ہے۔

یا اللہ! بد نگاہوں سے بچائیو؛ اور بدی کے قلموں کو توڑیو! بس آزاد، بے کس آزاد اس وقت ایک عالم میں بیٹھا ہے، کس کا دل ہے کہ اس کیفیت کو پائے۔ نیک استاد، پیارے استاد کے لکھے پھٹے پرانے کاغذ پرزے سامنے پھیلے ہیں۔ یہ

> لڑکپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں ، انھیں سامنے سے اٹھانا کیسے بھائیوں کو الوداع کہنا ہے۔ یہ درست ہے کہ گران سنگ قرض تھا اور گراں بہا قرض تھا جس سے آج میں ہلکا ہوا۔لیکن عمروں کا ساتھ ہے اور دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔موافست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے۔ ہائے دل گیر محنت تھی لیکن دل پذیر محنت تھی ؛ سخت کام تھا مگر مزے کا کام تھا ، اور ثواب پر انجام تھا کہ اُستاد کا کلام تھا۔ اب یہ کام کہاں ! آہ استاد کہاں ! خیر آزاد ! بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں کہ بہارنظر اور ساعت وغیرہ وغیرہ ایک ایک کر کے انسان سے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔تب وہ کیا کرتا ہے ؟ صبر کرتا ہے۔بس صبر کرکہ یہ نعمت بھی رخصت ہوئی اور نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔[۱۶۵]

ان مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے کن حالات میں کس شخصیت کو کس موضوع پر لکھا ہے۔محمد حسین آزاد کے تاثرات ،محسوسات اور شخصیت کی عکاسی ان مکتوبات میں ہوتی ہے۔ ان مکتوبات کو پڑھ کر ہم محمد حسین آزاد کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے آشنا ہوتے ہیں۔اِن کے دوست و احباب سے شناسا ہوتے ہیں۔کن سے دوستی تھی ، کن سے دشمنی۔ کاروبارِ زندگی میں خاص کرتصنیف و تالیف میں کس قدر منہمک رہے۔ یہ سب اِن کے خطوط سے واضح ہوتا ہے ۔جب مولانا آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوئے تو شروع میں ڈاکٹر لائٹنر کے ساتھ تعلقات کیسے تھے۔ لائٹنر کی کس طرح علمی اور ادبی کاموں میں اعانت کی۔سنین الاسلام نامی کتاب لکھنے میں آزاد کا کتنا ہاتھ تھا اور پھر حالات کا یکسر بدل جانا ، ڈاکٹر لائٹنر کے ساتھ تعلقات کا بگڑنا۔ کالج کے امور میں ڈاکٹر لائٹنر کا مولانا آزاد کے آگے بے جا روڑے اٹکانا خاص کرعربی کے طلباء کو وقت مقررہ سے زیادہ پڑھنے کی اجازت نہ دینا مولانا محمد حسین آزاد کی چھٹی روک لینا اور ان کو لاہور سے باہر جانے کی اجازت نہ دینا آزاد کا ان باتوں کو بُرا منانا اور دکھی ہو جانا جیسی معلومات بھی ہمیں ان کے مکتوبات سے ملتی ہیں لیکن یہ سب باتیں ان کی شخصی اور ذاتی ہیں۔ یہ خطوط کسی خاص مقصد کے تحت نہیں لکھے گئے ہیں۔ ان میں اصلاح اور قومی بھلائی کا کوئی پہلونظر

نہیں آتا۔ہم اِن کے خطوط کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں ، کہ آزاد سے پہلے خطوط ادبی حیثیت سے ہوتے تھے۔ آزاد نے خطوط میں بول چال والا انداز اپنایا ، بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی:

> اِس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد حسین آزادمرزا غالب کے مقابل اُستاد ذوق کو پسند کرتے تھے ۔لیکن خطوط میں مولانا آزاد کا جو رول ماڈل ہے وہ غالب ہی ہیں۔ آزاد نے غالب کی روایت سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد کا اسلوب نثر غالب کے اسلوب نثر کا ہی ایک تسلسل ہے۔ [۱۶۶]

مولانا محمد حسین آزاد کے مکاتیب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں تصوّرات اور امکانات کا عمل دخل زیادہ ہے اور زمینی حقائق یا تاریخی شواہد کا عنصر کم ہے۔یہ آزاد کی شخصیت کا فطری اظہار اور ان کے فن کا عمومی رویہ ہے۔ آزاد نے لاتعداد مکتوبات لکھے ہیں لیکن ان کے یہ مکتوبات منظر عام پر نہیں آ سکے۔ آزاد نے جو مکتوبات ''رفیقِ ہند'' کے ایڈیٹر مولوی محرم علی چشتی کو لکھے ہیں۔ان کا ذکر تو موجود ہے لیکن ان مکاتیب کا متن موجود نہیں ہے۔ انھی میں سے ایک مکتوب کا ذکر کرتے ہوئے ۳ اپریل ۱۸۸٦ء کے ''رفیقِ ہند'' میں یہ خبر ملتی ہے عنوان ہے

> جناب مولوی محمد حسین
>
> آج مولوی صاحب ممدوح کا ایک عنایت نامہ جو مقام تہران سے آیا ، اُس سے معلوم ہوا کہ شاہِ ایران نے کمال اعزاز کے ساتھ اِن کو اپنا وزیر صیغۂ تعلیم مقرر فرمایا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا سے ان کی خدمات اپنے ہاں منتقل کرانے کی درخواست بھی کر دی ہے۔مولوی صاحب کے احباب اسی پتے پر ان کے ساتھ خط و کتابت کریں۔ [۱٦۷]

درج بالا خبر آزاد کے ایک مکتوب پر مبنی ہے اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نے قاچاری بادشاہ کے عہد میں سفرِ ایران اختیار کیا تھا اس دور کا روزنامہ ایرج افشار نے شائع کر دیا ہے۔ جس کا نام ہے۔ '' خاطرات اعتماد السلطنہ'' اس پورے روز نامچے میں کسی جگہ مولوی محمد

حسین کا کہیں ذکر نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مولوی صاحب شاید کبھی شاہ ایران کے دربار میں باریاب ہی نہیں ہوئے۔اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کا ایک اور مکتوب ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> فی الحال میں نے ایک ڈراما اردو میں لکھا ہے، جس میں اکبر کے دربار کی بعض مفید حالتیں اور اہل دربار کی لیاقتیں دکھائی ہیں، اور یہ بھی سمجھایا ہے کہ اکبر بادشاہ غیر ملک کے ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے کس طرح گھل مل کر شیر وشکر ہو گیا تھا۔ اور کالج کے طلباء اس تصنیف کے ادا کرنے کے لیے تیار ہورہے ہیں۔ [۱۶۸]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ''ڈراما اکبر'' مکمل لکھا تھا اور کالج کے طلباء نے اسے اسٹیج کیا تھا۔ حالانکہ یہ ڈراما مولانا آزاد اپنی دیوانگی کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکے تھے اور اس ڈراما کے صرف دو ایکٹ اور خاکہ تیار کیا تھا۔ اس طرح گورنمنٹ کالج کی تاریخ جو گورنمنٹ کالج کی صد سالہ جشن پر شائع کی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ اس دور میں کوئی ڈراما اسٹیج ہوا تھا۔یہ اور ایسے بے شمار حقائق جہاں مولوی صاحب کے بعض مکتوبات میں دی گئی معلومات کو غیر مستند بناتے ہیں۔ وہاں اس بات کو بھی سامنے لاتے ہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط ان کے ادبی رویوں کا حصہ ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد علمی اور فکری رویوں سے ہٹ گئے ہیں۔

آزاد کے غیر مدّون مکتوب

جیسا کہ پچھلے ابواب میں یہ ذکر آچکا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

۱۔ بکوشش سر عبدالقادر اور میجر سید حسن بلگرامی مکتوبات آزاد ۱۹۰۷ء

۲۔ مجموعہ مکتوبات آزاد، مرتبہ آغا محمد طاہر، نبیرہ آزاد، ۱۹۲۳ء

اس مجموعے میں مجموعی طور پر ایک سو ایک تحریریں ہیں۔

۳۔ مکاتیب آزاد، مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، ۱۹۶۶ء

مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات کا یہ آخری مجموعہ مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔

اس مجموعے کے بارے میں سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی ''مکاتیب آزاد'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر مجموعے میں شائع شدہ خط تو خیر موجود ہی ہیں، ان کے علاوہ تقریباً پینتیس تحریروں کا اضافہ ہوا ہے یہ تحریریں تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہیں''۔[۱۶۹]

سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی اس پیش لفظ میں یہ بھی لکھتے ہیں:

۱۹۲۳ء میں جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرہ آزاد نے کوشش کر کے لالہ دنی چند سے ۳۲ خط حاصل کیے۔ اس مجموعے کا بھی دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے اور مجموعی طور پر سو تحریروں سے آراستہ ہے۔ مکتوبات آزاد کے اس ایڈیشن میں سید جالب دہلوی کا مقدمہ نہیں ہے، لیکن خط زیادہ ہیں۔ دو تحریریں اور بھی ہیں ایک شکریہ۔ جو آبِ حیات کے بارے میں لوگوں کی پسندیدگی پر مولانا نے اخبارات کے ذریعے نشر کیا تھا اور دوسرے سرسید کے نام خواتین پنجاب کا سپاس نامہ جسے ہم نے شامل نہیں کیا۔۔۔[۱۷۰]

سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی کے اپنے بیان کے مطابق کہ ''زیرِ نظر مجموعے میں شائع شدہ خط تو خیر موجود ہی ہیں'' لیکن میری تحقیق کے مطابق 'مجموعہ مکتوبات آزاد' میں مولانا کے ایک شاگرد سید ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام پانچ خط ہیں۔ جب کہ ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی میں سید ناصر نذیر فراق کے نام چار خط ہیں۔ پانچویں خط کا موصوف نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی صاحب نے یہ تو بتایا ہے کہ ایک شکریہ، جو آب حیات کے بارے میں لوگوں کی پسندیدگی پر مولانا نے اخبارات کے ذریعے نشر کیا تھا اور دوسرے سرسید کے نام خواتین پنجاب کا سپاس نامہ۔ مَیں نے اپنے مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اِس خط کے بارے میں مولانا مرتضٰی حسین صاحب خاموش ہیں۔ اِس کا مطلب ہے کہ یہ خط یا تو مولانا مرتضٰی کی نظروں سے نہیں گزرا۔ یا کاتب کی کتابت میں غلطی ہے۔ بہرحال مولانا محمد حسین آزاد کا اپنے شاگرد ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام لکھا ہوا یہ خط پیش خدمت ہے:

عزیز اقبال نشان من ! بعد از دعائے فراواں معلوم باد۔ خدا کا شکر ہے کہ تمھارا بھوت اُتر گیا۔ اور تم نے اپنے ماں باپ کے فرمانے سے اپنا گھر پھر بسا لیا یہ جوانی دیکھو اور یہ ستم دیکھو۔ معاذ اللہ برسوں رنڈوے بیٹھے رہے چلو اچھا ہوا کہ دوسری بیوی بھی پہلی بیوی کی طرح تمھاری خاطر خواہ مل گئی۔ اور پھر چپڑی اور دو دو۔ بیوی بھی سیدانی بُرا نہ ماننا۔ اب تمھاری دلی میں ذات وات کا بالکل خیال نہیں کرتے ، پیسہ کو دیکھتے ہیں باہر والے جو کہتے ہیں کہ دلی والے بے جڑ ہیں تو کیا جھوٹ کہتے ہیں ؟ تمھارے والد ماجد پرانے آدمی ہیں۔ اِس لیے اُنہوں نے تمھارے پسند کی جگہ بات نہ ٹھہرائی۔ اور جہاں اُنہوں نے مناسب سمجھا وہاں شادی کی۔ خاتونِ جنت کی طفیل سے یہ بیوی تمھیں سازگار ہو۔ اور تم پھولو پھلو۔

دعا کا محتاج

بندہ۔ آزاد لاہور [121]

مرتضیٰ فاضل صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجموعہ مکتوبات آزاد مرتبہ آغا طاہر نبیرہ آزاد ۱۹۲۳ء میں مجموعی طور پر سو تحریریں ہیں۔ لیکن اِس میں سو تحریریں اِس مکتوب کو شامل نہ کرنے کے بعد ہوتی ہیں ورنہ ایک سو ایک ہیں۔ کیونکہ مرتضیٰ فاضل صاحب نے اِس خط کو شامل نہیں کیا ہوا ہے اس لیے اُن کے مطابق مجموعی تحریریں ایک سو ہیں۔

دوسرا اُنھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ '' ایک شکریہ جو آب حیات کے بارے میں لوگوں کی پسندیدگی پر مولانا نے اخبارات کے ذریعے نشر کیا تھا۔ اور دوسرے سر سید کے نام خواتین پنجاب کا سپاس نامہ۔ جسے ہم نے شامل نہیں کیا۔'' [۱۳۲]

اِس میں میرا قیاس یہ ہے کہ '' شکریہ'' جو آب حیات کے بارے میں لوگوں کی پسندیدگی پر مولانا نے اخبارات کے ذریعے نشر کیا تھا اِسے مرتضیٰ فاضل صاحب کو مکاتیب آزاد میں شامل کرنا چاہیے تھا کیونکہ اِس میں مولانا آزاد کی دلی کیفیت اور ذہنی احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔ '' خواتین پنجاب کا سپاس نامہ'' نہیں شامل کیا گیا تو اُس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ سپاس نامہ مولانا آزاد نے لکھا ضرور لیکن اُس میں پنجاب کی مسلم بہنوں کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ لیکن ''شکریہ'' کو مکاتیب آزاد میں شامل نہ کرنے والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ''مکاتیب آزاد'' کا یہ مجموعہ مکمل اور حرف آخر نہیں ہے مولانا مرتضیٰ حسین خود بھی مکاتیب آزاد کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> مولانا محمد حسین آزاد کی برصغیر کے تمام علم دوست حضرات سے واقفیت تھی۔ بے شمار اکابر ، شاگردوں ، عزیزوں ، نجی دوستوں اور ایڈیٹروں سے خط و کتابت تھی۔ اگر آج ان کے خطوط کا پورا مجموعہ مل سکتا تو ایک دفتر ہوتا۔ بلاشبہ ان خطوں میں نجی معاملات ، سوانحی اشارات ، نفسیاتی مسائل مل سکتے تھے ، لیکن سردست صرف ایک سو چھتیس تحریریں مہیا ہوسکی ہیں۔ ان میں ایک سو پچیس کے قریب خط اور رقعات ہیں ، گیارہ کے قریب متفرقات ، آب حیات اور دربارِ اکبری کے سلسلے میں سینکڑوں خط ناپید ہیں۔ علمی مراسلات میں سے ایک خط بھی نہیں ملتا۔

حالی، شیفتہ ، مجروح ، ذکاء اللہ، غلام رسول ویران اور سر سید جیسے بزرگوں کے خط
مولانا کے کاغذات میں موجود ہیں لیکن اِن کے نام مولانا کے خط کیا ہوئے ؟
کِسے معلوم۔ [۱۷۳]

یہ حقیقت ہے کہ آزاد کے مدّون اور دستیاب خطوط تعداد میں بہُت کم ہیں۔ جب کہ اِن کے دوستوں ،عقیدت مندوں ،بہی خواہوں او رشاگردوں کا حلقہ بہُت وسیع تھا اور بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی ’’ آخری عمر میں تو مخالفین بھی اِس حلقے میں شامل ہو گئے تھے‘‘ [۱۷۴]

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کے لکھے گئے مکتوب جو گمنامی کے کوچے میں مدفون ہیں اُن کی تلاش و جستجو جاری ہے۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی کتاب ’’ تحقیقی زاویے‘‘ میں مولانا آزاد کے دو غیر مدّون خطوط اِسی سلسلے کی کڑی ہیں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

اس مقالے میں مولانا آزاد کے دو اہم خطوط پیش کیے جا رہے ہیں یہ خطوط نہ صِرف غیر مدّون ہیں اور مکاتیب آزاد کے کسی مجموعے میں شامل نہیں بلکہ ان کا تعلق آزاد کی زندگی کے اہم واقعے سے بھی ہے۔ دونوں خطوط مولانا آزاد کے سفر ایران سے متعلق ہیں۔جو ۱۸۸۵ء میں انجام پایا تھا اور دونوں خطوط کے مکتوب الیہ ہفتہ وار رفیق ہند کے ایڈیٹر مولوی محرم علی چشتی ہیں۔ [۱۷۵]

مولوی محرم علی چشتی جن کا ذکر مولانا آزاد کے مکتوب الیہ میں تفصیل سے آچکا ہے۔
(دیکھئے مولانا آزاد کے مکتوب الیہ)

یہ حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کے کئی مکتوبات ایسے ہیں جو ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے۔ اور اگر دستیاب ہیں تو وہ غیر مدّون ہیں مولانا آزاد کا ایک خط مولوی محرم علی چشتی کے نام مکاتیب آزاد میں بھی موجود ہے۔ جب کہ ان کے نام مولانا آزاد کے دو مکتوب غیر مدّون ہیں۔ یہ دونوں خط اس زمانہ کے ہیں جب آزاد ایران کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اِن خطوں سے پہلے مولانا کے سفر ایران کے متعلق جاننا ضروری ہے۔

سفر ایران کے لیے مولانا آزاد بروز منگل تئیس(۲۳) ستمبر ۱۸۸۵ء بمطابق بارہ ذالحجہ ۱۳۰۲ھ کو لاہور سے شام کے چھ بجے ریل میں بیٹھ کر لاہور سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔ جمعہ پچیس(۲۵) ستمبر کو مولانا آزاد کراچی پہنچے۔اگلے جمعہ دو اکتوبر کو مولانا آزاد عربیا نامی جہاز میں سوار ہو کر کراچی سے بوشہر روانہ ہوئے۔ جہاز کا سفر دس اکتوبر تک جاری رہا۔ دس اکتوبر سے سولہ اکتوبر کو مولانا دن کے ایک بجے بوشہر پہنچے۔ دس اکتوبر سے سولہ اکتوبر تک مولانا آزاد بوشہر میں رہے۔ سولہ اکتوبر کی شام کے وقت بذریعہ ایک ایرانی رہوار جو آزاد نے کرایہ پر حاصل کیا تھا بوشہر سے نکل کر شیراز کے لیے چل پڑے۔ شب و روز کی مسلسل مسافت کے بعد آزاد چھبیس اکتوبر کو شیراز پہنچے۔ شیراز میں آزاد نے پندرہ دن قیام کیا اور دس (۱۰) (نومبر کو شیراز سے روانہ ہو کر اصفہان اور طہران کا رُخ کیا۔ بارہ دن کے سفر کے بعد اصفہان پہنچے۔اصفہان میں پانچ دن قیام کیا اور چار دسمبر ۱۸۸۵ء کو کاشان پہنچ گئے۔ چوبیس دسمبر ۱۸۸۵ء کو طہران میں داخل ہوگئے۔ اور وہاں سے کتابیں جمع کرتے رہے۔سردیاں یہاں پر گزار کر تین ماہ کے بعد مولانا آزاد مشہد جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔ سمنان ، نیشاپور سے ہوتے ہوئے آزاد مشہد پہنچ گئے یہاں بارہ دن قیام کرنے کے بعد براستہ ہرات ، قندھار کوئٹہ آگئے۔ اور بعد میں بذریعہ ریل لاہور پہنچ گئے یوں آزاد کا یہ سفر ۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء سے شروع ہوا اور جولائی ۱۸۸۶ء میں ختم ہوگیا۔[۱۷۶]

چنانچہ یہ دونوں خط مولانا آزاد کے سفر ایران سے متعلق ہیں پہلا خط رفیق ہند کے ۲۸ نومبر ۱۸۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ خط آزاد نے ایران کے اندر سفر کے دوران لکھا ہے۔آزاد خود اس خط کے بارے میں لکھتے ہیں'' جب کہ میں راہ شیراز مقام برازگوں میں بیٹھا خط لکھ رہا ہوں''۔[۱۷۷]

اس خط میں آزاد نے حافظ اور سعدی کے مقبروں کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔چشمہ رکناباد کی کیفیت بیان کی ہے۔ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے کتب خانے کے لیے کتابوں کی تلاش میں بھی مصروف ہیں۔ بمبئی میں ایک ایرانی تاجر کتب کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ خاص قسم کی کتابیں بیچتا ہے۔

آزاد کے دو غیر مدون خطوط ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مسافر ایران

عزیز اقبال نشان سلامت!

یہاں میں ایسے عالم میں ہوں کہ ایک سطر لکھنے کے لیے ایک جز کے برابر توجہ چاہتی ہے۔ یہاں ساعت بساعت کے حالات تمہارے لیے ایک ایک نسخہ مفرح یا قوتی کا حکم رکھتے ہیں۔مگر فرصت کہاں؟

تم میری حالت کو کنجوسی کہا کرتے تھے۔ اب بجائے اس کے دعا کرو کہ ایسی حسبِ دلخواہ کتابیں ملیں جن میں کہ سارا روپیہ صرف ہو جائے۔ پھر ہم تم کتب خانہ میں مل کر بیٹھیں اور باتیں کریں۔ جو ارادے میرے ہیں ان کے آٹے میں یہ روپیہ نمک بھی نہیں۔تم نے دیکھا کہ دو مہینے ۲۰ دن کی سالانہ چھٹی تھی۔اس کی مجھے پوری تنخواہ ملتی اور تین مہینے کی چھٹی اس میں شامل ہوتی کام ہو جاتا۔ مدت تعطیل سے مجھے کچھ نصیب نہ ہوا ،مگر بیس دن۔ اس کی اطلاع بھی مجھے سرِ رشتہ یونیورسٹی سے نہیں پہنچی۔ انڈر سیکرٹری صاحب نے دی۔ اب مجھے اس کے سوا چارہ نہیں کہ چھ مہینے کی چھٹی حاصل کروں۔ ۴۵ مہینا خرچ کروں یعنی ۴۵۰ روپے۔کیونکہ اس ملک میں زیادہ رہنا میری بیماری کے لیے نہایت مفید اور مؤثر دوا ہے۔

لیفٹیننٹ گورنر بہادر اور انڈر سیکرٹری نے درخواست رخصت سے اب تک کیسی عنایتیں اور رعایتیں مبذول فرمائی ہیں۔ انھیں خوش کرنا میرا اور وابستوں کا فرض اور عین سعادت ہے۔ وہ گویا میری صحت میں سعی فرماتے ہیں جو کہ شافی مطلق خدا دیتا ہے۔

مجھے جہاز کا کرایہ سہ چند دینا پڑا۔ کیونکہ میل انگریزی میں بیٹھ کر آیا ہوں۔ ایرانی جہاز میں آتا تو کفایت ہوتی۔ سبب اس کا وہی تنگی وقت تھا۔ انتظار کرتا تو دیر لگتی اور برف سر پر نظر آتی تھی۔ گھبرا کر اسی میں جا بیٹھا۔ جہاز کی تکلیفوں کی شرح لکھوں تو کاغذ سڑی مچھلی کی کھال ہو جائے اور یہ ایک ادنیٰ بات ہے۔ حق پوچھو تو مجھے بڑی تکلیف تنہائی کے سبب سے ہوئی اور ابھی تک ہے۔ کل تک ایک آدمی ہاتھ آیا ہے جب کہ میں راہِ شیراز مقام براز گون میں بیٹھا خط لکھ رہا ہوں۔ اس تکلیف کا عذاب بھی شیطان کی گردن پر ہے۔

جو نا اہل کہ میری چھٹی میں ہارج تھے وہ خوش ہوں گے کہ ہم نے آزاد کو اتنے روپیہ کا نقصان پہنچایا۔ مگر آزاد خوش ہے کہ اہل نظر دیکھیں گے اور ان پر نفرین کریں گے۔

راہِ شیراز گیارہ دن میں طے ہوئی۔ آخیر کے چار پانچ دن سردی نے بڑی تکلیف دی۔ بہر حال ہزار شکر ہے اب میں اس شہر میں بیٹھا ہوں جس کی خاک سے خواجہ حافظ اور شیخ سعدی اٹھے اور وہیں سو رہے۔ جو وقت ان کی قبروں پر گذرا اس میں بڑا اثر دیکھا۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلّٰے را

خواجہ حافظ کا مقبرہ حافظیہ مشہور ہے۔ جس دن یہاں پہنچا اسی دن ان کی خوابگاہوں پر پہنچا۔ رکنا باد کا چشمہ اب تک اسی طرح جاری ہے اور ہزاروں آدمی جمعرات کی شام کو زیارت کو جاتے ہیں۔ دونوں بزرگوں کی قبروں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا تمہارے مطبع سے چینی مسجد میں۔ یہاں عرفی شیرازی کا

دیوان اس طرح عام نہیں جس طرح ہندوستان میں ، مَیں نے سوچ کر اس کے قطعہ کا شعر یاد کیا کہ انہوں نے خواجہ حافظ کی قبر پر جا کر لکھا تھا۔

بہ گردِ تربتِ حافظ کہ کعبہ سخن است

برآمدیم بہ عزمِ طواف در پرواز

تمھیں معلوم ہے ، میرا اصلی کام تلاشِ کتب ہے کہ کتب خانہ آزاد آباد ہو جائے۔ اس کا حال یہ ہے کہ نایاب اور عمدہ کتابیں ہیں مگر قیمت زیادہ ہے اور گھر گھر میں پھر کر تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ البتہ چھپی ہوئی کتابیں عام ہیں۔ وہ یہاں سے لینی مناسب نہیں۔ طہران سے جا کر لوں گا کیونکہ یہاں بھی وہاں سے آتی ہیں۔ اب یہاں سے ۱۲ دن کی راہ اصفہان اور ۱۰ ، ۱۲ دن طہران ہے۔

یہاں کے لوگوں کے محاسن اخلاق کی تعریف ایسی ہے جیسی زعفران کی خوشبو کی تعریف۔ یہاں کے علاوہ بوشہر میں بھی جن جن اشخاص سے ملاقات ہوئی انھوں نے میری کتابوں کے مطالب کو سن کر پسند کیا اور آگے کے واسطے اپنے احباب کے لئے خطوط لکھے۔

جامع لغات فارسی کے لئے اس سے بہتر موقع نہ ملے گا اور سفر نامہ شاہ اور نئی تصنیفات یہاں آئے بغیر ہرگز قابل اعتبار نہیں ۔ بلکہ تصانیفِ قدیمہ کے مطالب بھی اکثر یہاں آ کر حل ہوتے ہیں۔ تفصیل لکھوں تو وقت چاہیے اور محنت۔ ہم اب تک نوٹوں کو کیش منی سنتے تھے لیکن بوشہر میں میں نے اپنی نوٹوں کی ہنڈی چاہی کہ شیراز ، اصفہان ، طہران پر ہو جائے۔ سوداگر نے کہا کہ چار فیصدی بٹہ لگائیں گے۔ کیونکہ بمبئی میں نرخ گھٹ گیا ہے۔ جب میں نے گفتگو کی اس نے کہا کہ تم بجائے اس کے ہمیں قران یعنی شاہی سکہ اپنے

خزانہ سے دلوا دو جہاں کو کہو گے چٹھی ہم کر دیں گے۔ صاحب اسسٹنٹ ریذیڈنٹ نے خزانچی کو بلا کر کہا۔ مختصر یہ ہے کہ اس نے بھی نہ مانا۔ میں نے دیکھا کہ گیارہ سو روپیہ میں میرے چوالیس جاتے ہیں اور اس معاملہ کو ملتوی کیا اور سمجھا کہ آگے کسی شہر میں دیکھ لوں گا اور کچھ اور رستہ سوچوں گا شاید نکل آئے اس وقت روپیہ بچانا چاہیے۔

یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ صرافہ کا کام اورخزانچی وغیرہ کی خدمت یہودی کرتے ہیں۔ ذرا خیال کرنا ، روپیہ کو کس قدر نفرت ہے مسلمان کے ہاتھ سے۔

تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے اپنے لیکچروں میں بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ جس ملک کی ہم زبان بولیں جب تک خود وہاں جا کر نہ رہیں تب تک نہیں آتی۔ ان تقریروں میں جو کچھ بیان کیا وہ اور رنگ ہے۔اب ایک اور لطیفہ سنو ، کارروان میں میں نے دیکھا کہ قاطرون اور گھوڑوں کی گردنوں میں بڑے بڑے گھنٹے یعنی زنگ لٹکاتے ہیں۔ تا کہ رات کو جو مسافر رستہ سے بھٹک جائے آواز پر آجائے۔ رستہ کی گانو والے بھی آگاہ ہو جائیں وغیرہ ، وغیرہ۔ میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑے کے دونوں پہلوؤں میں بڑے بڑے گھنٹے لٹکاتے ہیں کہ ان کا ارتفاع ۱۰ ، ۱۰ گرہ قطر دائرہ گرہ۔ اس کے بجانے کو ایک لکڑی کا ڈنڈا لٹکاتے ہیں۔یہ دونوں ایک ڈیڑھ گز کی زنجیر سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔اور جب کاٹھی یا پالان کسنے لگتے ہیں تو زنجیر اٹھائی پشت پر ڈال دی اوپر بوجھ لاد دیا گھوڑا روانہ ہوا ، یہ گھنٹی ایک نقارہ یا ڈھول سے کم آواز نہیں دیتی۔ اتفاقاً مجھے خیال آیا کہ شاید اس کا نام کچھ اور ہو۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ''کوس''۔۔۔ اب خیال کرو کہ ''کوس رحلت

اور کوس رحیل'' کے جو معنے علی العموم ہندوستان میں پڑھاتے ہیں۔ ''کوچ کا نقارہ'' اسے کیا کہیے گا ؟ مغیلان کے معنی اہلِ ہند کبھی کریل'' کبھی کیکر، کبھی ببول بتاتے ہیں وہ ایک اور ہی درخت ہے۔ البتہ خار دار ہے۔ شیراز نام ایک مشہور دشت سمرقند کے پاس ہے۔ خواجہ حافظ کا مشہور شعر ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بہ خال ہندو اش بخشم سمر قند و بخارا را۔

ترک، سمرقند بخارا، کے لحاظ سے شیراز کو وہی دشت شیراز خیال کیا جائے تو مناسب تر ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ترکوں کو باعتبار اصلیت کے شہر شیراز سے کچھ تعلق نہیں۔ غرضیکہ کہاں تک لکھوں۔ ہزاروں باتیں ہیں۔

جو دوست مجھے کچھ لکھنا چاہیں تو نشان یہ ہے!

'اصفہان' مطبع اخبار فرہنگ، معرفت سرکار آقا محمد تقی خان سرتیپ۔

راقم

محمد حسین آزاد

۲۰ محرم روز پنجشنبہ

ہاں ایک بات لکھنی بھول گیا۔ بمبئی میں ایک ایرانی ہے۔ وہ خاص قسم کی کتابیں چھاپہ ایران کی منگا کر بیچتا ہے اور قیمت اضعاف المضاعف لیتا ہے۔ مناسب ہے کہ اس کا رستہ الگ کھولا جائے تا کہ فائدہ جو ایک شخص کو ہے وہ پبلک کو ہو۔ یہ کام ایک کمیٹی کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ برکت علی خان صاحب سے ملنا۔ میں انھیں خود بھی لکھتا ہوں۔ منہ۔ [۱۷۸]

آزاد کا دوسرا خط رفیق ہند میں ۲۷ مارچ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ خط مولانا آزاد نے طہران میں بیٹھ کر لکھا تھا۔طہران میں آزاد نے صرف ایک ماہ رکنا تھا لیکن سردی اور برف باری کی وجہ سے آزاد کو تین ماہ قیام کرنا پڑا ۔سخت جاڑے کی وجہ سے آزاد بیمار بھی ہوگئے اور نایاب اور نادر کتابوں کی دستیابی بھی وہاں قیام کا سبب بنی۔آزاد نے اس خط میں طہران میں مقیم ایران کی بعض علمی اور سیاسی شخصیات سے ملاقات کی تفصیل بھی بیان کی ہے

(۲)

ایڈیٹر صاحب !

۲۱ جنوری ۱۸۸۶ء کو طہران سے میری درخواستِ رخصت آئی۔ ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء سے لغایت جولائی ۱۸۸۶ء پانچ مہینے کی رخصت حاصل کی۔

گیارہ فروری ۱۸۸۶ء کو ارادہ مصمم تھا کہ مشہد مقدس کو روانہ ہو جاؤں مگر جاڑا ایسا سخت معلوم ہوا کہ میں بیمار ہوگیا۔ ناصحوں کی نصیحت نے پورا اثر کیا اور میں جگہ سے جنبش نہ کر سکا۔ طہران میں پہنچ کر ۱۰۔۱۲ دن نہایت سخت گذرے۔مگر الحمدللہ کہ اب کمال آسائش و آرام و سامان کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہوں۔تم نے سنا ہو گا کہ جام جم ایک جغرافیہ زبان فارسی ہے اور وہ شہزادہ فرہاد مرزا کی تصنیف ہے۔یہاں میں ان کی خدمت میں مشرّف ہوا۔ وہ حاجی اور زائر نہایت نیک طینت متو رع پرہیز گار ہیں۔صبح سے چاشت تک روز دربار کرتے ہیں۔ ہفتہ میں دو دن ۱۱ بجے تک علماء کا جلسہ ہوتا ہے اور علوم عقلی و نقلی میں گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ گردکتب معتبرہ چنی ہوتی ہیں اور انواع و اقسام کی تحقیقیں رہتی ہیں۔ یہ علوم متداولہ میں ایسے ماہر ہیں ایسے ماہر کہ ایسا ویسا ملاّ ان کے سامنے بات نہیں کرسکتا۔ باوجود اس کے صاحب اخلاق ہیں۔ مجالس اخلاق انھوں نے پہلی صحبت میں عنایت فرمائی۔ان کے

صاحبزادے احتشام الدولہ عبدالعلی مرزا باوجود عنفوان جوانی کے باپ کے خلف الرشید ہیں۔ انہوں نے مجھے یاد فرما کر خود آدمی بھیجا۔ اسباب اٹھوا منگایا۔ نواب معتمد الدولہ فرہاد مرزا فرزند خاص عباس مرزا ولی عہد مرحوم کے ہیں۔ جو کہ فرزند ہیں فتح علی شاہ جنت آرامگاہ کے۔ عبدالعلی مرزا فاضل ہیں دو دفعہ ''شرح اشارات'' علماو فضلا کے جلسوں میں پڑھا چکے ہیں۔ چنانچہ ایک نسخہ قلمی مجھے عنایت فرمایا۔ بہت پرانا ہے اور صحیح ہے اور کئی کتابیں اور بھی دیں اور ہر وقت حضوری میں حاضر رکھتے ہیں۔ مگر میں نا قابل ہوں کہ تلاش کتب میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ انہی کی بدولت نواب مخبر الدولہ وزیر تعلیم اور نواب ضیغ الدولہ سے ملا۔ سب ان کا ادب کرتے ہیں کئی سبب سے ؟ اوّل عباس مرزا کے بیٹے جس کی تلوار کو عالم نے مانا۔ دوسرے ہمیشہ مناصب عالی کو سرانجام دیا۔ تم نے دیکھا ہوگا جب شاہ نے سفر فرنگستان کیا تو دارالسلطنت میں انہیں اپنی جگہ چھوڑا تھا۔ علاوہ براں کئی برس تک فرمانفرمای فارس رہے جس کا دارالحکومت شیراز ہے۔ مدت تک کردستان کے حاکم رہے۔ اب بسبب ضعف وپیری کے گھر بیٹھے ہیں۔ دو آدمی بغل میں ہاتھ دے کر اندر سے باہر لاتے ہیں جب وہ دربار کرتے ہیں۔

نواب مخبر الدولہ وزیر تعلیم ہیں اور اس کے علاوہ بھی متفرق مدسپرد ہیں۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔ ایسی سعادت مند اور بالیاقت اولاد خدا نے دی۔ سب فرنچ اور اطالیہ و جرمنی زبانوں میں ڈگریاں حاصل کر کے آئے ہیں اور تمغے وہاں کے کالجوں کے ان کے پاس ہیں۔ بڑا بیٹا تلغرانہ قانون کا ڈائرکٹر ہے۔ انہی مخبر الدولہ کے والد رضا قلی خان مرحوم تھے جنھوں نے ''فرہنگ انجمن آرائے ناصری''، ''روضتہ الصفاناصری''، ''تذکرۃ الشعرای فارسی'' دو جلدوں میں لکھا وغیرہ وغیرہ اور ان کی اکثر کتابیں ہیں جو ابھی چھپی نہیں ہیں۔

نواب ضیغ الدولہ کو علوم اور تصانیف کی مد سپرد ہے ان کا بڑا کام ہے اور اس کے کئی دائرے ہیں۔ ایک دائرہ میں چار عالم فاضل عربی و فارسی کے ماہر کتابیں تصنیف کر رہے ہیں۔ دوسرے میں اخبارات عالم ترجمہ ہوتے ہیں اور اخبار چھپتا ہے۔ تیسرے میں فرنچ اور اطالیہ ، جرمنی وغیرہ وغیرہ سے کتابیں ترجمہ ہوتی ہیں اور مدارس کے لیے چھپتی ہیں۔ چوتھی میں مطبع اور تصحیح اور فروخت کتب ہے۔

مجھے ان سب حضرات سے بہت فائدے ہوئے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ کہ شاہ کا سفر نامہ اول و دوم فرنگستان کا ، اول سے آخر تک حرف بحرف میں نے پڑھا۔ یہ کام عام علما اور انشا پردازوں سے نہ نکلتا۔عبدالعلی مرزا موصوف کے فرنچ میں ماہر ہیں ، فرزندان نواب مخبر الدولہ بہادر نے گھنٹوں میرے ساتھ بیٹھ کر اس کے الفاظ کی تحقیقیں لکھوائیں اور فرنچ کی کتابیں سامنے رکھ کر اطمینان کیا۔ دولتیں جو مجھے ان سے حاصل ہوئیں محض خدا کی عنایت تھی اور ہے ورنہ کسے نصیب ہوسکتی ہیں۔ مجھ کو اور کسی کو سلام نصیب ہونا بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

آخری جنوری کو چلہ بزرگ ختم ہوگا اور غالباً یہاں سے روانہ ارض مقدس ہوں گا۔ ایک مہینا بلکہ ۳ ، ۴ دن زیادہ رستہ میں لگیں گے۔ خدا نے چاہا تو مارچ کی ۴ ، ۵ کو مشہد جا پہنچوں گا۔ کتابیں ابھی تک کچھ لی ہیں اور کچھ نہیں لیں۔ یہاں بھی لوں گا اور انشاء اللہ مشہد میں ۲۰ ، ۲۵ دن ٹھہر کر اور لوں گا غالباً مارچ میں وہاں رہنا ہوگا۔ وقت تھوڑا ، فرصت کم ، کام بہت ، سفر درپیش۔ بزرگوں کی خدمت میں حاضر باشی۔ اس واسطے دوست احباب کی

خدمت میں کچھ لکھ نہیں سکا۔ سب دوست احباب معاف فرمائیں اور دعائے
خیر سے بدل یاد فرمائیں۔ بحصول مقاصد خیریت سے پھر خدا ملا دے۔

راقم

بندہ آزاد محمد حسین آزاد
پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور
حال مسافر ایران [۱۷۹]

مولانا محمد حسین آزاد کا ایک اور خط جو مکاتیب آزاد کے کسی مجموعے میں نہیں چھپا ہے۔ اور غیر مدون ہے۔ یہ خط مولانا آزاد نے مولوی محمد فیروز الدین فیروز ڈسکوی کے نام لکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ آزاد کا یہ خط نقل کیا جائے۔ مولوی فیروز ڈسکوی کا تعارف کروانا ضروری ہے۔

مولوی محمد فیروزالدین فیروز ڈسکوی ۱۸۶۴ء میں ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام قاضی امام الدین قریشی تھا اور وہ ڈسکہ کے سرکاری قاضی تھے۔ فیروز ڈسکوی نے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے درجہ اوّل میں ایس۔وی کا امتحان پاس کیا۔ اورنٹیل کالج لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس ملازمت اختیار کر لی۔شروع میں ڈسکہ میں ملازمت کی۔اس کے بعد ۱۸۸۷ء سے میونسپل بورڈ ہائی سکول اور گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ میں فارسی کے مدرس اوّل کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ اوراپنی وفات تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔

مولانا حسام الدین کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ اِن کے دو بیٹے تھے۔ فیروز ڈسکوی نے مارچ ۱۹۰۷ء میں وفات پائی اور تحصیل پسرور کے ایک گاؤں پیچو کی میں دفن ہوئے۔ مولوی صاحب ایک جامع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مدرس ، عالم دین ،مترجم قرآن ،مفسر ، سیرت وسوانح نگار، لغت نویس اُردو اور پنجابی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ لغات فیروزی ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

فیروز ڈسکوی مولانا آزاد کے ہم عصر تھے ۔ مولانا آزاد سے نہ صرف دوستانہ تعلقات تھے بلکہ اُن کو آزاد کے شاگرد ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔چنانچہ فیروز ڈسکوی محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں'' اُردو زباندانی میں آزاد بندہ کے بھی استاد'' [۱۸۰]

فیروز الدین ڈسکوی کے نام لکھا ہوا مولانا آزاد کا خط درج ذیل ہے جو ابھی تک غیر مدوّن ہے۔

صاحب من!

میں نے بہ نظر سرسری حصہ نظم کا دیکھا اشعار آپ نے وہی اختیار کیے ہیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق ہیں اگر سررشتہ تعلیم منظور کرے تو بہتر ہوگا۔

آزاد

۱۲ جولائی ۱۸۸۹ء [۱۸۱]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی فیروز ڈسکوی مولانا آزاد سے شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔ خط مختصر ہے لیکن اہم ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا ایک اور رقعہ جو اُنہوں نے مولوی خلیل الرحمٰن کو لکھ کر پھاڑ دیا۔ مولوی خلیل الرحمان نے اُنھی کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ رقعہ ہذا درج ذیل ہے'' عزیزمن، چوں از چیف کورٹ بہ خانہ روند بر کتب خانہ آزاد بگذرند، والسلام۔ آزاد۔'' [۱۸۲]

درج بالا رقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے محمد خلیل الرحمٰن کو لکھا تھا۔ اِس کا ذکر محمد خلیل الرحمٰن نے اپنے اُس خط میں کیا ہے۔ جو ۱۷ دسمبر ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر محمد صادق کو لکھا تھا۔محمد خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

میرے مخدوم و قدر افزا! علیکم السلام و زادت معالیکم۔

اسی وقت پانچ منٹ ہوئے کہ گرامی نامہ تاکیدی و یاد دہانی پہنچا۔ آپ کا کرم نامہ ۲۲ نومبر عین رمضان شریف میں ملا تھا۔ میں ان دنوں نہ مُردوں میں ہوتا ہوں نہ زندوں میں۔ سوچا یہ تھا کہ بعد از عید، خدمت مبارک میں خط لکھوں گا۔ میرے اور تمام پرائیویٹ خطوط یوں ہی رکھے ہوئے ہیں، مگر اس وقت تک میں معذور رہا۔ وجہ بھی عرض کردوں۔ آپ کو شاید تعجب ہو (مگر نہیں ہونا چاہیے) کہ

اس Heaven born صوبے سے عربی اور اُردو کا جنازہ اُٹھ چکا ہے۔ میں نے دس برس کے غور و خوض کے بعد پچھلے سال اُردو کے لیے ایک انجمن قائم کی ، وہ حضراتِ (ناپسندیدہ) کے ہاتھ میں چلی گئی اور اس کا مردہ عبقات عالیات پہنچ گیا، الحمدللہ ! عربی کی لاش کا اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ۱۹۳۷ء میں جوامتحانات ہوئے ہیں ان میں انٹرینس میں تمام صوبے بھر میں۔۔۔اور یہ صوبہ کچھ چھوٹا نہیں ہے۔۔۔کل ۷۷ لڑکے بیٹھے اور ایف اے میں ماشاء اللہ کل نو (یعنی ایک کم دس) لڑکے، نہ معلوم ان میں کتنے پاس ہوئے۔

میں نے انجمن عربی قائم کی ، پرسوں اس کا سالانہ جلسہ ہے اور میری رپورٹ سنائی جائے گی۔ مانا کہ یہ جلسہ انجمن حمایت اسلام جیسا جلسہ نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ مری مصروفیت اور افکار کا اندازہ لگا سکتے ہیں ، اس پر اُردو کی انجمن کا احیاء کرنا ہے۔غرض کیا بتلاؤں کہ میں کس آفت میں مبتلا ہوں۔سوچتا یہ تھا کہ سالانہ جلسے کے بعد آپ کو نیاز نامہ لکھوں گا ،مگر آپ کی تاکید نے مجبور کیا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے ،لکھتا ہوں۔ اگر جلدی میں تسلی بخش جواب نہ ہوتو مجھے معذور رکھیے۔

پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ مولوی (محمد حسین) آزاد صاحب اور اُن کے خاندان سے مجھے کیا تعلق رہا ہے تا کہ آپ کو میری حیثیت معلوم ہو جائے۔میں چیف کورٹ (متوفی) میں نوکر ہوا اور یکم فروری ۱۸۸۹ء کو لاہور پہنچا اور اگست ۱۹۲۷ء میں ریٹائر ہوا مگر چیف کورٹ سے نہیں ، بلکہ ایجنٹ ریلوے کے دفتر سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی برابر میرے تعلقات لاہور سے چلے جاتے ہیں۔ یوں قریباً پچاس برس سے مجھے لاہور سے تعلق ہے۔اب قسمت نے پریاگ میں لا ڈالا ہے۔ نہ معلوم ہڈیاں کہاں کی ہیں۔ وماتدری نفس بای ارض تموت۔ اس عرصے میں اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے لاہور میں کیا کیا انقلاب دکھلائے اور کن کن لوگوں سے ملوایا اور کس کس کی یاد دل میں زخم ڈالے ہوئے ہے۔

غرض چیف کورٹ میں (مولوی محمد حسین آزاد کے صاحبزادے) آغا ابراہیم مرحوم کے ماتحت کیا گیا۔ یہ کہنا چاہیے کہ یکم فروری ۱۸۸۹ء سے ہی میرا تعلق مولوی آزاد صاحب مرحوم سے پیدا ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا ہوں تو سبزہ آغاز تھا، یعنی داڑھی بھی نہیں نکلی تھی ، لاہور چھوڑا تو داڑھی سفید تھی۔ مجھے بچہ سا دیکھ کر آغا صاحب کی والدہ محترمہ نے مجھ سے مادرانہ سلوک کیا۔ آغا صاحب کی شادی گویا میرے سامنے ہوئی۔مولوی (محمد حسین) آزاد ذرا دیر آشنا تھے۔ ان کی شفقتیں شروع ہونے میں دیر لگی ،مگر شروع ہوئیں تو دیوانہ ہونے تک قائم رہیں ، وغیرہ وغیرہ۔

سوالات ۱، ۲، ۳ کے جوابات میں نہیں دے سکتا ، یا نہیں دیتا (کیونکہ وہ معتبر نہ ہوں گے) آزاد کو کالج کی خدمت لائٹنر نے دلوائی تھی۔ کشیدگی کی وجہ جہاں تک مجھے علم ہے صرف یہ تھی کہ لائٹنر ایک فاضل ادب عربی تھا ، اور آزاد اس کو چے کے پورے آشنا نہیں تھے۔ بدمزگی بڑھ گئی، بلکہ اس نے طول کھینچا۔ آزاد نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو بچے۔''سنین الاسلام'' کا زیادہ تر مواد لائٹنر نے دیا اور اس کو آزاد نے مرتب کیا۔ اس کے متعلق کئی مرتبہ آزاد نے تذکرہ کیا۔''سنین الاسلام'' کا پہلا حصّہ غالباً ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء میں چھپا۔دوسرا حصّہ ، آزاد کا دیا ہوا میرے کتب خانے میں ہے اور ۱۸۷۶ء کا چھپا ہوا ہے مگر میری رائے ناقص میں اُن کا بڑا کارنامہ رسوم ہند کا اسلامی حصّہ اور اُردو کی پہلی کتاب وغیرہ کا سلسلہ ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ''رسوم ہند'' میں جو ناول ہے، وہ بہترین ہے۔

اوپر دیکھیے، میں نے عرض کیا کہ لائٹنر سے بگڑنے کے بعد آزاد نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ ، پنڈت من پھول اور لائٹنر ایران و ترکستان گئے ، غالباً بلکہ یقیناً لائٹنر کی سفارش پر ، آزاد اور من پھول نے فقیری بھیس کیا اور لائٹنر نے عالم دین کا بانا اختیار کیا اور خوب نمازیں پڑھائیں۔ آزاد نے ایران و ترکستان میں تنور جھونکا اور روٹیاں بھی پکائیں ۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ ایران و ترکستان جانے سے

پہلے مولوی آزاد کسی قدر دیوانے بھی ہو گئے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ واقعی یا غیر واقعی ۔۔۔مشہورتو غیر واقعی تھے ۔

آزاد کی صاحبزادی میرے لاہور پہنچنے سے بہت پہلے انتقال کر چکی تھیں ۔ ان کا اکثر آزاد ، آغا اور اُن کی والدہ مرحومہ سے تذکرہ آیا۔ ماں باپ دونوں آبدیدہ ہوتے تھے ۔ وہ واقعی بڑی قابل بی بی تھیں۔خود آزاد نے مجھ سے کہا کہ اُن کے ہی مسودوں کو بعد از اصلاح ، میں کام میں لایا ہوں۔ ریویو کے لئے آزاد کے پاس بہت کتابیں آتی تھیں ، وہ سب ان صاحبزادی کو دے دی جاتی تھیں او ر اُن ہی کے ریویو آزاد کے نام سے چھپتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اُن کو فارسی پر خاصی قدرت تھی (اُردو کا ذکر نہیں) عربی نہیں جانتی تھیں۔ کچھ خیال سا ہے کہ آزاد نے یہ کہا تھا کہ اُنہوں نے عربی بھی پڑھی تھی مگر گھبرا گئیں ، مگر اس کو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے دماغ کی یہ کیفیت ہے کہ نام کسی (آدمی کے ہوں یا کتاب وغیرہ کے) یاد نہیں رہتے۔ اُن کا نام بارہا سنا ، مگر یاد نہیں آتا۔ اُن کی شادی پٹیالے کے خلیفوں کے خاندان میں ہوئی تھی۔ میں نے اُن کے داماد کو دیکھا ہے، غالبًا یہ مر چکے ہیں ۔ نام یاد نہیں آتا ۔ آزاد کا نواسا۔ اکثر لاہور میں آتے تھے ، نانہال میں رہتے تھے اورمہینوں رہتے تھے۔ اُن کا بھی نام یاد نہیں آتا۔ آزاد کی کتابوں کے سرورق پر (آغا طاہر کے جوان ہونے سے پہلے) آپ کو چھپا ہوا ملے گا۔ جہاں تک مجھے علم ہے لڑکی کی سسرال سے کوئی بڑی ناراضگی نہ تھی ، جو کچھ تھی ، وہ ویسی ہی تھی جیسی لڑکی والوں کو ہوتی ہے مگر میں اس کے متعلق وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

آزاد بڑے غالی تبرا باز شیعہ تھے ۔تقیہ کا یہ عالم تھا کہ مدتوں کے بعد معلوم ہوتا تھا اور وہ بھی اتفاقاً کہ یہ رافضی ہیں۔ ''آب حیات'' میں مرزا جان جاناں کا واقعہ پڑھیے۔ نہ میں نے اُن کو پابند صوم دیکھا ، نہ صلوۃ۔شیعوں کی طرح تقیہ

کے زور میں چھپ کر نماز شاید پڑھتے ہوں ، لیکن برسوں اُن کو روزہ دار نہیں دیکھا۔ آغا مرحوم کی والدہ البتہ پابند تھیں۔ باوجود اس کے شیعوں کے مذہبی مراسم بڑے جوش سے ادا کرتے تھے۔ اس میں زیادہ دخل اُن کی بیوی کا تھا۔ وہ مجھ سے پس پردہ باتیں بھی کر لیا کرتی تھیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ سائیں دھیان شاہ کے (ایک مجذوب جو میاں سلطان کی سرا میں رہتے تھے) بہت معتقد تھے۔ قریباً روزانہ اُن کے پاس جاتے تھے۔ آغا کو اور مجھے بھی تاکید کرتے رہتے تھے دو تین مرتبہ بجبر مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ان (دھیان شاہ) کی زبان سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یورپ کے رہنے والے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ نچلے لکھنؤ کے شاہزادے تھے۔ مگر لکھنؤ خاص کر اس کے نمک حرام شاہی خاندان کی زبان یورپی نہیں ہے ، اس واسطے شاہزادگی کا طرہ یاروں کی من گھڑت ہے !! لیکن اگر وہ واقعی تھے تو آزاد کی اُن سے عقیدت کی وجہ ظاہر ہو جاتی ہے لکھنؤ کا واجد علی شاہ ، خاص کر اُس کا خاندان بڑا (متشدد) شیعہ ہے لیکن سائیں صاحب کی زبان سے کبھی شیعیت کا اظہار نہیں ہوا۔ غرض یہ عجیب بات ہے۔

اگر آپ لاہور کے رہنے والے ہیں تو ایک اور عجیب بات آپ کو سناتا ہوں کہ جنرل سکندر خاں (؟) کا بیٹا رستم خان باوجودیکہ عیسائی تھا مگر سائیں صاحب کا معتقد تھا اور اُن کی قبر پر مرتے مرتے ہر جمعرات کو فاتحہ پڑھ آیا کرتا تھا۔ رستم خاں مر گیا ، اُن کا بیٹا غلام مسیح قلعہ گوجر سنگھ کے باہر رہتا ہے ، اُس سے پوچھیے۔

طبیعت بشاش تھی۔ لطائف وظرائف بہت کہتے تھے مگر یاس وقنوط ضرور بہت تھا۔ کسی کو اپنا دوست نہیں سمجھتے تھے ، جو خیر خواہ ہوتا تھا (مثلاً میں اور سید ممتاز علی مرحوم وامثالہم) اُس کو فریب کار و مکار سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ غدر کی مصیبت تھی۔ لوگوں کا ذکر کرتے تھے تو ان کی غداری ضرور ظاہر کرتے تھے۔ کسی سے اپنے

سچے دلی خیالات یا اپنے گھر کے حالات نہیں بیان کرتے تھے۔ اپنی بہو (نوہ) سے ناراض تھے مگر مجھ سے پانچ چار مرتبہ اور مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم سے کچھ زیادہ اس کا تذکرہ اس لیے کیا کہ اپنے دوست آغا کو سمجھاؤ۔ آزاد کے لطائف وظریف اتنے ہیں کہ اُن کے لئے ایک رسالہ چاہیے۔ اکثروں میں رفض کی بدبو ہوتی تھی۔

یاد پڑتا ہے کہ کلکتے بھی گئے تھے۔ یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ یہ معلوم ہو کہ کیوں؟ میرے خیال میں آغا کو بھی معلوم نہیں ہو گا۔ '' طبیعت فطرۃ مذہبی تھی '' اس کا جواب اوپر آ گیا ہے۔ دنیا کو سارے شعراء بے وقعت کہتے آئے ہیں مگر جہاں تک مجھے اندازہ ہے یہ برائے گفت ہی آزاد میں تھا۔

میں نے اُن میں موسیقی کا کوئی خاص شوق و ذوق نہیں دیکھا جیسے اور لوگ کن رسیا ہوتے ہیں ، وہ ہوں تو ہوں ۔خوراک : اس میں کوئی خاص تکلف نہ ہوتا تھا۔ یہ کہنا چاہیے کہ سادہ ہی ہوتی تھی۔ گوشت دونوں وقت ہوتا تھا۔ مجھے بارہا ، شاید سینکڑوں مرتبہ اُن کے اور آغا صاحب کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا ہے بلکہ اس کے متعلق ایک لطیفہ بھی ہے جس کو میں قلم انداز کرتا ہوں۔ نہ جائے رہائش میں کوئی خاص تکلف تھا۔ وہی شرفاء دہلی کا رویہ ، معمولی ۔تکلف سے بری تھے۔ اکثر دوپہر کو تنگ دھڑ تنگ غرقی باندھے رہتے تھے ، ظاہر ہے کہ بے پروا تھے۔

طبیعت میں قنوط لیے ہوئے شگفتگی تھی۔ جو شخص کہ دیر آشنا ہو ، اُسے میں ملنسار نہیں کہوں گا ، لیکن جس سے ملتے تھے ، خوب ملتے تھے ، بالطبع خاموش نہ تھے ۔فکر شعر ونثر کے وقت بالکل خاموش رہتے تھے بلکہ خشک ہو جاتے تھے۔ ایسی حالت میں بہت ٹہلا کرتے تھے۔ طبیعت میں آمد بہت کم تھی اور آورد بہت ہی زیادہ۔اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ مجھے ایک رقعہ لکھا ، جس کے الفاظ اب تک مجھے یاد ہیں ، وہ یہ تھا:

''عزیز من ، چوں از چیف کورٹ بہ خانہ روند بر کتب خانہ آزاد بگذرند ، والسلام آزاد' سخت گرمی ، جون کا مہینہ۔ دیوان ذوق کی ترتیب میں دن رات کی (بلا مبالغہ) مصروفیت ۔ کتب خانے گیا تو ہر طرف سے دروازے بند۔ دستک دے کر ایک دروازہ کھلوایا اور فوراً بند کر دیا گیا۔ اندر اندھیرا گھپ منت سماجت کر کے دروازہ کھلوایا ۔ دیکھا کہ رقعہ متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ ،ٹھیک یادنہیں رہا کہ کتنے) مختلف اُلٹ پھیر کے ساتھ مسودے میز پر پڑے ہوئے ہیں۔

۔۔۔آزاد کے دشمن میرے زمانے میں تو بہت ہی کم تھے ، پہلے ہوں گے۔ ذکی الحس بے شک بہت تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بدگمانی سے اُن کا خمیر تھا۔ اپنی بدگمانیوں وغیرہ نے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ مسلمانوں کی طرف توجہ فرماتے ،لیکن یہ نہیں تھا کہ درد نہ ہو ان کے سخت شاکی اور ان کے ادبار پر بڑا رنج کرتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ:

وہ کون ہے جو مجھ پہ تأسف نہیں کرتا
پر میرا کلیجہ دیکھ کر میں اُف نہیں کرتا

ہابی کہیے یا مشغلہ۔۔ میں نے تصنیف و تالیف ہی دیکھا تھا۔ کتے پالنے کا بڑا شوق تھا، جو بہ حالت دیوانگی بھی رہا۔ اس کے متعلق ایک لطیفہ میرے ساتھ بھی بڑا لطیف ہوا، طول ہو جائے گا ، ورنہ لکھتا۔

ایام غدر کے مصائب کا طبیعت پر بہت ہی زیادہ اثر تھا۔ نہ پوچھیے ۔ میں نے صبح کی ہوا خوری یا شام کی فرصت میں بار ہا چھیڑا اور انجام آنسوؤں پر ہوا۔

دہلی دروازے سے باغوں باغ ہو کر اکبری دروازے کو آیئے تو دہلی دروازے سے بہت قریب اور اکبری دروازے سے ذرا دور کتب خانہ آزاد واقع تھا۔ یہ عمارت ۱۹۲۷ء تک تو باقی تھی ، غالباً اب بھی بہت سے آدمی آپ کو نشان دے دیں گے۔

'' دربار اکبری '' کے طبع ہونے کے وقت آزاد دیوانے تھے۔ اُس کے دیباچے کے متعلق جو کچھ آپ نے دریافت کیا ہے ، وہ تمام حالات و واقعات مجھے خوب معلوم ہیں۔مولوی ممتاز علی صاحب اور آغا صاحب کی صلح و صفائی میں ، میں ایک واسطہ بھی رہا۔مگر اس کے متعلق باوجود ہر بات سے واقف ہونے کے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا مجھے معاف فرمایئے ، یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے اور میرے تعلقات طرفین اور اُن کی اولاد سے یکساں ہیں۔۔۔

دیوانگی کا قصہ میں نے سب سے مؤخر کیا ہے ، میں اوپر یہ عرض کرنا بھول گیا کہ یہ دیوانگی دوسری تھی۔ پہلی ، جس کا ذکر آچکا ہے ، اُس کو اس میں شامل نہ کیجیے۔ اس سے پہلے صاحب زادی کے انتقال کے بعد بھی دیوانے رہ چکے تھے ،مگر وہ زیادہ دن نہیں رہی۔یہ آخری ، یا دوسری دیوانگی سفر آخرت تک اُن کی رفیق رہی ۔

اس کا قصہ اور شروعات گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک طالب علم نے یہ بیان کیا کہ ہم نے بی۔اے میں عربی لی تھی۔مولانا کے پاس عربی بھی تھی ۔ہم نے اُن کو بہت تنگ کیا ، اس لیے وہ دیوانے بن بیٹھے ،مگر یہ بالکل لغو ہے۔ اب وہ صاحب جنہوں نے یہ قصہ گھڑا تھا ، انتقال کر چکے ہیں ، اُن کو کیا کہا جائے ، اللہ دونوں ہی کو بخشے ۔صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ اُن میں دیوانگی کا مادہ پہلے ہی تھا۔غدر کے مصائب کی یاد ،طبیعت کی بدگمانی ، بہو سے شکایت وغیرہ وغیرہ ، رفتہ رفتہ کام کرتے رہے۔ اُس پر قیامت یہ ہوئی کہ دیوان ذوق کی ترتیب شروع کر دی۔ اُس میں دن رات کا انہماک و استغراق رہا۔ راتوں اسی اُدھیڑ بن میں لگے رہتے۔ اُستاد کی غزلیں پوری کرتے ۔گرمیوں میں اس پر محنت زیادہ ہوئی ، نیند میں کمی آگئی۔ دیوان تو جوں توں کر کے چھپ گیا مگر مراق کی کیفیت پیدا ہوگئی اور یہ حالت ہوئی کہ ایک مرتبہ میں اور مولوی ممتاز علی مرحوم ملنے گئے۔ اُن دنوں وہ امام باڑے میں رہتے تھے۔ اب ایک لطیفہ یہ ہوا کہ صحن میں دو چارپائیاں

بچھی تھیں۔ ایک پر آزاد بیٹھے تھے۔ مولوی (ممتاز علی) صاحب از راہ ادب پائینتی بیٹھ گئے ۔ میں بھی دوسری خالی چارپائی پر پائینتی بیٹھا۔ مجھ سے مولانا نے کہا کہ'' میاں ! کس کے لیے وہاں بیٹھے ہو، سرہانے ہو بیٹھو'' میں نے فوراً تعمیل کی ۔مولوی (ممتاز علی) صاحب سے بھی انہوں نے دو تین مرتبہ کہا کہ'' آگے کو ہو بیٹھو''۔ اُنہوں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ'' اچھا بیٹھا ہوں'' آخر مولانا کو غصہ آ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ'' بیوقوف ، گدھا ' احمق ! میری ادھوائین ٹوٹی جا رہی ہے یہ کہتا ہے کہ اچھا بیٹھا ہوں'' مولوی صاحب جھٹ اُوپر ہو بیٹھے ، بیٹھے مگر بہت شرمندہ۔ ۔۔

غرض بے خوابی اور بدخوابی اور مراق بڑھتا گیا ، ایک اور قیامت یہ ہوئی کہ اُن ہی دنوں پلین شیٹ نکلی تھی ۔ آغا کہیں سے خرید لائے اور باپ سے اس کا ذکر کیا۔ باپ نے دیکھنے کو مانگی اور اُس کا تجربہ کیا۔ ہوتے ہوتے کہیں میر تقی میر کی روح کو بلاتے ہیں کہیں سودا کی اور ہر ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ اب گھر والوں کو بھی شبہ ہوا اور چند ہی روز میں یقین ہو گیا۔ دوا کھانے کو جو کہتے ہیں ،تو کسی طرح نہیں مانتے ، گالیاں دیتے ہیں۔حکیم بزرگ شاہ سے رجوع کیا گیا۔ اُنہوں نے خاص طور پر توجہ کی ،مگر دوا کون کھاتا پیتا۔ علاج یہ تجویز ہوا کہ نیند آنی چاہیے میں نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹری دوائیں مقدار میں بہت کم ہوتی ہیں ، ڈاکٹری علاج کیجیے ، ڈاکٹر رحیم خان مرحوم نے بھی نیند ہی علاج تجویز کیا۔ اُنہوں نے دوا بتلائی اور کہا کہ کسی کھانے میں ملا دیا کرو۔ مولانا کو دہی مرغوب تھی ، اُسی میں ملا کر دی گئی ۔ پھر کچھ شبہ ہو گیا تو دہی بھی چھوڑ دی مگر نیند نہ آنی تھی نہ آئی ۔۔۔

دیوانگی عجیب تھی ۔ پانچ ، دس منٹ ،بعض وقت آدھا ، پون گھنٹہ ، بہت اچھی طرح باتیں کر رہے ہیں ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں ، حافظہ اور دل اچھا ہے اور یکا یک دیوانگی شروع ہو گئی۔ لوگ دھوکے میں رہ جاتے تھے اور

حیران ہوتے تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ ''دربار اکبری'' کا مسودہ نکالا گیا۔ ایک روز ایک خاص کام کے لیے میں مولانا کے پاس گیا۔آغا ڈیوڑھی میں رہے۔ مجھے دیکھتے ہی چور چور کا شور مچایا اور مسودے کی چوری لگائی۔ میں واپس ہوا تو میرے پیچھے پیچھے مولانا ! آغا کہیں چھپ رہے۔مولانا پولیس کی تلاش میں رہے۔ میں بھاگ آیا۔تیسرے چوتھے روز اسی حیثیت سے پھر گیا، آغا پیچھے رہے۔ مجھے دیکھ کر بہت اخلاق سے پیش آئے ، بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور اچھی طرح ہوش میں۔کچھ بگڑنے لگے تھے۔ کہ اتفاقاً ایک بڑھیا آئی۔ مولانا نے پوچھا: ''مائی کیا کہتی ہے؟'' اُس نے کہا کہ: تھوڑی جئی مستی چاہی دی ہے، سر دھون لئی ، اوصبون والا کدر گیا '' (ڈیوڑھی میں ایک شخص صابن بنایا کرتا تھا اور ''مستی'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو صابن کے اوپر آجاتی ہے)۔مولانا ، از راہ شفقت اُٹھ کر بڑھیا کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ: ''مائی اب تو ہم بوڑھے ہو گئے ، اب مستی کہاں ! '' وہ غریب شرمندہ ہو کر چلی گئی اور میں بھی موقعہ پا کر بھاگ آیا۔

ایک واقعہ اور سن لیجیے ، اسی پر یہ خط ختم ہے۔مولوی صاحب کی صبح کی ہوا خوری اس حالت میں بھی ناغہ نہیں ہوئی۔ ایک روز میں دفتر کو جا رہا تھا۔ ہائی کورٹ کے سامنے جو ناکا سڑک پر ہے وہاں دور سے مولانا آتے نظر آئے میں سخت پریشان ہوا کہ برسوں سے نہیں ملا ہوں دیکھیے کیسی بنتی ہے۔مولانا نے مجھے دیکھ لیا اور کھڑے ہو گئے مجھ سے کہنے لگے تم بہُت عرصے سے نہیں ملے کہیں باہر گئے تھے کہ یہیں ہو ، میں نے عُذر کیا کچھ اور باتیں بالکل ہوش کی کرتے رہے میرے ایک ایک لڑکے کی نام بہ نام خیریت پوچھی پڑھنے لکھنے کو پوچھا میں نے کہاں فلاں فلاں نے ایم ۔اے کیا ہے ایک بی ۔اے میں ہے۔۔۔ وغیرہ سن کر بہُت خوش ہوئے ۔ بہُت مبارک دی عربی پڑھوانے پر زور دیا آدھا گھنٹہ گرفتار رکھا مجھے دفتر کی جلدی ۔ شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا کہ آپ کی بھی بہُت دنوں سے

زیارت نہیں ہوئی بس پھر کیا تھا کہنے لگے کہ تو ایسا بے ایمان پاجی ہے کہ تو نے میری کب خبر لی ، میرے اُوپر کیا کیا بن گیا تو نے کروٹ نہیں لی۔ پاجی پوچھتا ہے کہ بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی ارے ! تجھے خبر بھی ہے میرے ساتھ کیا دغا ہوئی ؟ میں نے پوچھا کہ خیریت ؟ کہنے لگے کہ میرے ساتھ ذکاء اللہ نے پھر دغا کی اس کی ماں کی۔۔۔ اُس کی بہن کی ۔۔۔ میں ایک روز ہوا خوری میں دہلی پہنچ گیا۔ ذکاء اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھہرایا ، مجھے کیا معلوم کہ اس کے دل میں کیا دغا ہے۔ اِس کے مکان کے قریب ایک برات آ کر ٹھہری، مجھ سے کہنے لگا کہ '' آزاد'' تو بھی برات دیکھ آ ۔ میں گیا برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا ! آزاد آیا ! مجھے بڑی خاطر سے دولہا کے پاس بٹھا دیا مجھے کیا خبر کہ ذکاء اللہ نے ، اُس کی ۔۔۔کیا فریب کیا ہے ، اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اورمہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا اور ایسا جکڑا کہ رسوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہو رہا ہے جس طرح ہو سکا میں رسوں کو توڑ کر ابھی چلا آ رہا ہوں۔'' نہ پوچھیے کہ مجھے کتنی ہنسی آئی ہے۔ یقین کیجیے کہ ریل کے دفتر تک میں ہنستا ہی چلا گیا۔ بار بار خیال ہوتا تھا کہ دیکھنے والے کیا کہتے ہوں گے۔

غرض یہ تھی آزاد کی دیوانگی۔ اس واقعے سے اس کا بھی پتہ لگتا ہے کہ اُن کو لوگوں سے کتنی بدگمانیاں تھیں۔

اب یہ خط ختم ہوتا ہے۔ میں نے بڑی محنت سے ، اپنا بڑا ہرج کر کے سخت عجلت میں یہ لکھا ہے۔ آپ اتنی مہربانی کیجیے کہ اس کی رسید ایک کارڈ پر مجھے دے دیجیے تا کہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ میرے محنت ضائع نہیں گئی ۔ اللہ کرے کہ یہ کار آمد ہو۔ مجھے کچھ اور بھی کہنا تھا ، پھر کبھی سہی ، یار زندہ صحبت باقی۔

(میرا پتہ : ۱۷۔ بیلی روڈ ، الہ آباد)

محمد خلیل الرحمٰن
۱۷۔دسمبر ۱۹۳۷ء [۱۸۳]

یہ تفصیل اِس خط کی تائید میں کافی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کو کانٹ چھانٹ کرنے کی بہت عادت تھی۔ اور کتر بیونت کرتے رہتے تھے۔

ایک مکتوب جو مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد میں تو موجود ہے لیکن مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے مجموعے میں موجود نہیں ہے۔حالانکہ موصوف کے اپنے مطابق یہ مکتوب مکاتیب آزاد میں موجود ہے ایک بہت بڑی غلطی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اسی طرح محمد حسین آزاد کے چار غیر مدوّن مکتوب بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں ان مکتوبات سے ہمیں ان کے سفرِ ایران ، ایران کی تہذیب اور ایران کی صنعتوں کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں جہاں یہ چار غیر مدوّن مکتوب مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات میں ایک اضافہ ہیں وہاں اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ محمد حسین آزاد نے بے شمار مکتوبات اپنے دوست و احباب کو لکھے تھے لیکن افسوس بقول آغا محمد طاہر'' کہ دریا میں سے قطرہ بھی ہاتھ نہ آیا''[۱۸۴]

اس طرح محمد حسین آزاد جیسی عظیم ادبی شخصیت کے ان چار مکتوبات کا مل جانا شائقین ادب کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

مکتوبات آزاد کا باہمی موازنہ

مولانا آزاد کے مکتوبات کا پہلا مجموعہ'' مکتوبات آزاد شائع کردہ مرغوب ایجنسی'' میں مخزن میں شائع ہونے والے ہی مکتوب شامل ہیں مخزن میں مولانا محمد حسین آزاد کے کل ۲۸ مکتوب شائع ہوئے تھے جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ اپریل ۱۹۰۶ جلد ۱۱ نمبر ۱ میں چھ، مئی ۱۹۰۶ جلد ۱۱ نمبر ۲ میں چھ، جولائی ۱۹۰۶ جلد ۱۱ نمبر ۴ میں آٹھ، اگست ۱۹۰۶ جلد ۱۱ نمبر ۵ میں پانچ اور ستمبر ۱۹۰۶ جلد ۱۱ نمبر ۶ میں تین مکتوب شائع ہوئے۔ اس طرح یہ کل مکتوب ۲۸ ہیں۔ جو مولانا محمد حسین آزاد کے دوست میجر سید حسن بلگرامی کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ ۲۸ مکتوبات کا موازنہ شائع کردہ تینوں مجموعوں سے کیا جا رہا ہے۔ اگلے کالموں میں صرف دو مجموعوں'' مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد'' مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا موازنہ ہے۔ مجموعہ مکتوبات آزاد میں ۱۰۱ تحریریں ہیں، اس لیے انھی ۱۰۱ تحریروں کا ہی موازنہ کیا گیا ہے۔

مکتوبات کی ترتیب ''مکتوبات آزاد شائع کردہ مرغوب ایجنسی'' اور ''مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد'' ایک جیسی ہے لیکن ''مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی'' کی ترتیب اِن سے یکسر مختلف ہے۔ ان مکتوبات کے باہمی موازنے میں اول الذکر کی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

مکتوب نمبر	مکتوبات آزاد (مخزن)	مکتوبات آزاد (مرغوب ایجنسی)	مکتوبات آزاد (مرتبہ آغا محمد طاہر)	مکاتیب آزاد (مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل)
۱	ہی	ہے	ہے	ہے
	پتہ	پتا	پتا	پتا
	بھاگا بھاگ گیا	بھاگ گیا	بھاگا گیا	بھاگا بھاگا گیا
	مفقود	مفقود	مقصود	مفقود
	حرج	ہرج	ہرج	ہرج
	۲۶ ستمبر ۸۲ء	۲۶ ستمبر ۱۹۰۶ء	۲۶ ستمبر ۸۲ء	۲۶ ستمبر ۸۲ء
	مجھے	مجھے	مجھے	مجھے
۲	سرمایہ مجھے دو	سایہ مجھے دو	سایہ مجھے دو	سایہ مجھے دو
	پھپھی	پھپھی	پھوپھی	پھوپھی
	زکی الطبع	زکی الطبع	ذکی الطبع	ذکی الطبع
	الجھا ، سلجھایا	الجھا ، سلجھایا	الجھا ، سلجھایا	الجھا ، سلجھایا
۳	جنابِ من! دام امجد کم العالی۔تسلیم	جنابِ من! دام مجدکم العالی	جنابِ من! دام مجدکم العالی	جنابِ من! دام مجد کم العالی
	ادائے شکریہ	ادائے شکریہ	ادائے شکریہ	ادائے شکر
	فضولی سمجھ کر	فضولی سمجھکر	فضول سمجھ کر	فضول سمجھ کر

	آب حیات کے باب میں جو کچھ فرمایا ہے	آب حیات کے باب میں جو کچھ فرمایا ہے	آب حیات کے باب میں جو کچھ فرمایا ہے	آب حیات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے
۴	گنہگار	گنہگار	گنہگار	گنہ گار
	مجھے	مجھے	مجھے	مجھے
	سلسلہ	سلسلہ	سلسلہ	سلسلے
	سن کر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں	سن کر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں	سن کر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں	سن کر کیا فرماتے ہیں
۵	کئی دفعہ آپ سے ذکر آیا تھا	آپ سے کئی دفعہ ذکر آیا تھا	آپ سے کئی دفعہ ذکر آیا تھا	آپ سے کئی دفعہ ذکر آیا تھا
	بُدہ	بُدھ	بُدھ	بُدھ
	سر پر لال چھینٹ کا کن ٹوپ	سر پر بال چھینٹ کا کن ٹوپ	سر پر بال چھینٹ کا کن ٹوپ	سر پر بال چھینٹ کا کن ٹوپ
	داڑھی	ڈاڑھی	ڈاڑھی	ڈاڑھی
	کپورتھلہ	کپورتھلہ	کپورتھلہ	کپورتھلے
	یارکندی یابو	یارقندی یابو	یارقندی یابو	یارقندی یابو
	کاپر پلیٹ ہو	کاپر پلیٹ ہو	کاپر پلیٹ ہو	کاپر پلیٹ پر ہو
	نامہ	نامہ	نامہ	نامے
	۹ جنوری ۸۳ء۔ ۳ بجے شب	۱۱ جنوری ۸۳ء	۱۱ جنوری ۸۳ء	۱۱ جنوری ۸۳ء
۶	سُنئے	سُنئے	سُنئے	سُنیے
	یونیورسٹی پنجاب	یونیورسٹی پنجاب	پنجاب یونیورسٹی	یونی ورسٹی پنجاب
	اڑہائی	اڑھائی	اڑھائی	اڑھائی

	حوالہ	حوالہ	حوالہ	حوالے
	پڑہا	پڑھا	پڑھا	پڑھا
	ـــ	ـــ	ـــ	پچاس
	ابہی	ابھی	ابھی	ابھی
۷	یونیورسٹی پنجاب	یونیورسٹی پنجاب	یونیورسٹی پنجاب	پنجاب یونیورسٹی
	بتائے	بتائے	بتایئے	بتایئے
	کریم وکارساز	کریم کارساز	کریم کارساز	کریم کارساز
۸	عالی جناب من	عالی جناب من	عالی جناب من	جناب من
	منہہ	مُنہ	مُنہ	مُنہ
	ہو چکا تھا اور ہو چکا ہوں	ہو چکا ہوں	ہوچکاہوں	ہو چکا ہوں
	آزاد ـ باقی دارد	---	---	---
	ہمارے بزرگوں کی تصانیف ہی ایک ایسی لازوال دولت ہمارے پاس ہے جس کو ہمارے بچے ہمارے بعد فضول خرچیوں میں اُڑا نہیں سکتے۔	---	---	---
۹	من	ما	ما	ما
	بچائے	بچائے	بچایئے	بچایئے
	پانوسمجھیں	پاؤں سمجھیں	پاؤں سمجھیں	پاؤں سمجھیں
	صلاح	اصلاح	صلاح	صلاح

۱۰	جناب من۔تسلیم	جناب من۔تسلیم	جناب من۔تسلیم	جناب من ! تسلیم
	لکھدیئے	لکھدئے	لکھ دیے	لکھ دیے
	غلطی مجھ سے ہوئی	غلطی مجھسی ہوئی	غلطی مجھ سے ہوئی	غلطی مجھ سے ہوئی
۱۱	عالی جناب من تسلیم۔	تسلیم	جناب من تسلیم	جناب من تسلیم
	مجہے	مجھے	مجھے	مجھے
	دونوں	دونوں	دونو	دونوں
	ڈڈیکشن	ڈڈیکیشن	ڈڈیکیشن	ڈڈیکیشن
	پہر	پھر	پھر	پھر
	سنبہالتا	سنبہالتا	سنبھالتا	سنبھالتا
۱۲	جناب من ۸ اپریل ۸۳ء تسلیم۔	جناب من ۸ اپریل ۸۳ء تسلیم۔	جناب من ۸ اپریل ۱۸۸۳ء تسلیم۔	جناب من تسلیم
	مُنہہ	مُنہ	مُنہ	مُنہ
	ریگیا	رہ گیا	رہ گیا	رہ گیا
	مجہے پنشن بھی دیے دینگے	مجھے پنشن بھی دیدینگے	مجھے پنشن بھی دیدیں گے	مجھے پنشن بھی دے دیں گے
	آزاد	آزاد	آزاد	آزاد ۱۸ اپریل ۱۸۸۳
۱۳	کہ رہا تھا	کہہ رہا تھا	کہہ رہا تھا	کہہ رہا تھا
	بُھلاوا	بھلاؤ	بہلاؤ	بہلاؤ
	دیدہ ام	دیدہ الم	دیدہ ام	دیدہ ام
	از آب و از آیینہ	از آب و از آیینہ	از آب از آیینہ	از آب از آیئن ہ

۱۴	ی	ہے	ہے	ہے
	اگر زندہ ہوتا	اگر وہ زندہ ہوتا	اگر وہ زندہ ہوتا	اگر وہ زندہ ہوتا
	بڑہا	بڑہا	بڑھا	بڑھا
	جناب من لاہور بنگلہ ایوب شاہ تسلیم ۱۴۔ اگست ۸۳	جناب من لاہور بنگلہ ایوب شاہ تسلیم ۱۴۔ اگست ۸۳	جناب من لاہور بنگلہ ایوب شاہ تسلیم ۱۴۔ اگست ۸۳	جناب من
	سیدھا پڑیگا	سیدہا پڑیگا	سیدھا پڑیگا	سیدھا پڑے گا
	مجبوری	مجبوری	مجبوری	مجبوری
	محمد حسین آزاد	محمد حسین آزاد	محمد حسین آزاد	محمد حسین آزاد ۲۴ اگست ۱۸۸۳ء
	دیئے	دئے	دیے	دیے
۱۶	کئی دن سے	کئی دنوں سے	کئی دنوں سے	کئی دنوں سے
	راجہ مان سنگہ	راجہ مان سنگھ	راجہ مان سنگھ	راجہ مان سنگھ
	حضور جناب عالی کے ملاحظہ سے بھی گذرا ہے	حضور جناب عالی کے ملاحظہ سے بھی گذرا ہے	حضور جناب عالی کے ملاحظہ سے بھی گذرا ہے	حضور عالی کے ملاحظے سے بھی گزرا ہے
	۱۵۔۲۰ دن	۱۵۔۲۰ دن	۱۵۔۲۰ دن	پندرہ بیس دن
۱۷	باریاب خدمت ہوگا	باریاب خدمت ہوگا	باریاب خدمت عالی ہوگا	باریاب خدمت عالی ہوگا
	ابھی	ابہی	ابھی	ابھی
۱۸	نورمل سکولوں	نورمل سکولوں	نارمل سکولوں	نارمل اسکولوں
	پڑہائی	پڑہائی	پڑھائی	پڑھائی

لیکچر	لیکچر	لکچر	لکچر	
تین سو	۳۰۰	۳ سو	۳ سو	
مگر ملا ہے چار ہزار روپیہ مہینہ	مگر ملا ہے ۴ ہزار روپیہ مہینہ	مگر ملا ہے ۴ ہزار روپیہ مہینہ	مگر لائے ۴ ہزار روپیہ مہینہ	۱۹
سنوایئے	سنوائے	سنوائے	سنوایئے	
فرمایئے	فرمایئے	فرمائے	فرمایئے	
شگفتیِ طبع	شگفتی بطع	شگفتگی طبع	شگفتگی طبع	۲۰
بہ درجہا	بدرجہا	بدرجہ ہا	بدرجہ ہا	
پچاس روپے پنشن	۵۰ روپے پنشن	۵۰ روپے پنشن	۵۰ روپے پنشن	
ایک قطعہ شفق ارسال کیا ہے	ایک قطعہ شفق ارسالِ خدمت کیا ہے	ایک قطعہ شفق ارسالِ خدمت کیا ہے	ایک قطعہ شفق ارسالِ خدمت کیا ہے	۲۱
جایئے	جایئے	جائے	جایئے	
کہہ دیا	کہہ دیا	کہدیا	کہدیا	۲۲
سمجھا	سمجھا	سمجھا	سمجھا	
طفل بہ مکتب نمی رود	طفل بہ مکتب نمیرود	طفل یہ مکتب نمیر ود	طفل بہ مکتب نمیر ود	
لکچروں	لکچروں	لکچروں	لیکچروں	
تین پرچے جس کے سولہ سترہ کاغذ	۳ پرچے جس کے ۱۶ ۱۷ کاغذ	۳ پرچے جس کے ۱۶ ۱۷ کاغذ	۳ پرچے جس کے ۱۶ ۱۷ کاغذ	
تڑپ	تڑپھ	تڑپھ	تڑپھ	۲۳
نکاح کر رکھا ہے	نکاح کر رکھا ہے	نکاح کیا ہوا ہے	نکاح کیا ہوا ہے	
تمام گریک کے تھے	تمام گریک تھے	تمام گریک تھے	تمام گریک تھے	
دو تین سو	۲۔۳ سو	۲۔۳ سو	۲۔۳ سو	

	۴-دسمبر ۸۴ء	۴-دسمبر ۸۴ء	۴-دسمبر ۸۱ء	۴-دسمبر ۸۴ء
۲۴	ضائع	ضائع	ضائع	ضائع
	بے پروائی	بے پرواہی	بے پروائی	بے پروائی
	بلاتا	بھلاتا	بھلاتا	بھلاتا
	سنبہالا	سنبھالا	سنبھالا	سنبھالا
۲۵	ابہی	ابہی	ابھی	ابھی
	پڑہاؤ	پڑھاؤ	پڑھاؤ	پڑھاؤ
	سمجہتے	سمجھتے	سمجھتے	سمجھتے
	مضایقہ	مضائقہ	مضایقہ	مضائقہ
	پالسی	پالسی	پالسی	پالیسی
	آزاد لاہور بنگلہ ایوب شاہ	آزاد بنگلہ ایوب شاہ	آزاد بنگلہ ایوب شاہ	آزاد بنگلہ ایوب شاہ
۲۶	سِلی ہوئی	سلی	سیلی	سیلی
	ہارئیے	ہارئے	ہاریے	ہارئے
	۳-۴ سو	۳-۴ سو	۳-۴ سو	تین چار سو
	رہئے	رہئے	رہئے	رہیئے
۲۷	سمجہے	سمجھے	سمجھے	سمجھے
	سکرٹری	سکرٹری	سکرٹری	سکریٹری
	دیکہی	دیکھی	دیکھی	دیکھی
	چُپ چُپ	چُپ چاپ	چُپ چاپ	چُپ چاپ
	کئے	کئے	کئے	کیے
۲۸	سمجہا	سمجھا	سمجھا	سمجھا
	بڑہانا	بڑہاتا	بڑھانا	بڑھانا

	ڈراما	ڈراما	ڈرامہ	ڈراما
	بڑہاپے	بڑہاپے	بڑھاپے	بڑھاپے

مکتوب نمبر	مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر	مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل
۲۹	کتاب الف لیلہ کے باب میں	الف لیلہ کے باب میں
	فقط زیادہ نیاز	--
۳۰	دیکھئے	دیکھیے
	بے کسی طرح کی	بے کسی طرح
۳۱	میاں غلام نبی صاحب نے کتاب کے باب میں کیا بندوبست کیا	میاں غلام نبی صاحب (کذا) نے کتاب کے باب میں کیا بندوبست کیا
۳۲	عنایۃً	عنایتاً
	ہفتہ عشرہ تک	ہفتے عشرے تک
	فی الحقیقۃ	فی الحقیقت
	ضابطہ	ضابطے
۳۳	عنایت نامہ	عنایت نا ے
	میاں غلام نبی صاحب کہتے ہیں	میاں غلام نبی صاحب (کذا) کہتے ہیں
	ک کتاب الف لیلہ	ک، الف لیلہ
	معاملہ	معاملے
	منگا	منگوا
	چنانچہ	چناں چہ

	شبہہ	شبہ
	اُنہی	اُنھی
	خاتمہ	خاتمے
	شرمندہ	شرمند
۳۴	منشی غلام نبی کا	منشی غلام نبی (کذا) کا
	معاملہ	معاملے
	مبادلہ	مبادلے
	چنانچہ	چناں چہ
	للعہ کو	چار روپے آٹھ آنے کو
	پیرایہ	پیرائے
	روپیہ	روپے
	زمانہ	زمانے
	وہ بھی ایک ۲۵۔۳۰ روپے	وہ بھی ۲۵۔۳۰ روپے
	۱۰ جون ۱۸۷۹ء	(۱۸۷۹ ع)
۳۵	جنابِ من ۔ تسلیم	جنابِ من !
	ء۔ے کو	پندرہ روپے کو
	نہوئی	نہ ہوئی
	عہدہ دار اعلیٰ	عہدے دار اعلےٰ
	پچیں	پچی
	ء۔۔ے کو	چوبیس روپے کو
	۳۰ راتیں	۳۰ (تیس) راتیں
	شایق	شائق
	ـــ	(۱۸۷۰ ع ؟)

۳۶	بندہ	بندے
	مشاعرہ	مشاعرے
۳۷	آنتڑی	انتڑی
	رستہ	رستے
	عمل خوب ہوا	عمل خواب ہوا
	۳	تین
	شبہہ	شبہ
	ٹھیرو	ٹھہرو
	کنارہ	کنارے
	رستہ	رستے
	دستر خوان زیادکیا	دستر خوان زیادہ کیا
	۱۲ بجے	بارہ بجے
	۱۱۔۱۲ بجے	گیارہ بارہ بجے ہیں
	ـــ	۱۸۹۲ ع بعد
۳۸	چہرہ	چہرے
	سفید داڑھی کے نور نے روشن کیا تھا	سفید داڑھی نے روشن کیا تھا
	جبّہ	جبے
	انہیں	انھیں
	انہوں	اُنھوں
	لمحہ	لمحے
	کھچا	کھنچا
	پنجرہ	پنجرے

	جامہ	جامے
۳۹	چاہئے	چاہیئے
۴۰	۱۴	چودہ
	لودیانہ	لودیانے
	سہ سرا	سہ نثر
	ہمرقعہ	پنج رقعہ
	شرح شابار	شرح شبنم شاداب
	جم عفیر ہفتاد و دولت کا مجمع ہے	جم غفیر ہفتاد و دوملت کا ہے
	زیر سایہ قلعہ کے	زیر سایہ (کذا) قلعے کے
	شہر میں انارکلی	شہر ، انارکلی
	کرایہ	کرایے
۴۱	۱۹ دن	انیس دن
	۱۴	چودہ
	۲۰	بیس
	۱۵	پندرہ
	پیالہ	پیالے
۴۲	بیج	بھیج
	---	جنوری ۱۸۷۶ ع
۴۳	۱۷ سے ۲۴	سترہ سے چوبیس
	۲۱ دن	اکیس دن
	پیالہ	پیالے

	اورشب ۲۵ کی صبح ہوتے ۵ بجے	اورشب بست وپنجم کی صبح پانچ بجے
	موقعہ	موقع
	تمہاری	تمھاری
۴۴	مزاج مایل	مزاج مائل
	دونو	دونوں
	مدرسہ	مدرسے
	ءلے	دس روپے
	لکھئے	لکھیے
	شائد	شاید
	---	ستمبر ۱۸۷۶ء
۴۵	سولکھ چکا	---
	بات وہی کہ ڈاکٹر صاحب یکم اکتوبر تک آ جائیں گے جب تک وہ نہ آئیں کچھ ہونہیں سکتا	---
	کہئے	کہیے
	پیالہ	پیالے
	رہئے	رہیے
	شملہ	شملے
	۲ ؍ محصول	دوآنے محصول
	لودھیانہ	لودیانہ
	بے ڈہب	بے ڈھب
	---	گا
۴۶	دعا ہائے	دعا ہائے (فراواں)

	معاملہ	معاملے
	معہ	مع
	پھر قانون پر محنت کی اور ـــــہ میں امتحان تحصیلداری کا پاس کیا۔	---
	اُدہر	اُدھر
۴۷	خدا جانے یا تم بیہوش ہو	خدا جانے تم بے ہوش ہو
	۳	تین
	دیجئے	دیجیے
	وظیفہ	وظیفے
	بہ مشاہرہ ء ـــ روپیہ	بہ مشاہرہ پینتیس روپے
	درجہ	درجے
	ـــــہ میں قانون یاد کر کے تحصیلداری کا امتحان پاس کیا	---
	عہدہ	عہدے
	عاید	عائد
	کلمہ	کلمے
۴۸	اس کا بھی وہی ہوا	اس کا وہی ہوا
۴۹	وعدہ	وعدے
	دونو	دونوں
	دو کلمہ	دو کلمے
	جس طرح ہو	جس طرح ہوا
	---	(نشاں)
	مگر کیا ہوں	مگر کیا ہو

	مگر دعا کرو	دعا کرو
	معاملہ	معاملے
	اکیلی دکیلی	اکیلی دوکیلی
۵۰	عمامہ	عمامے
	جوڑہ ۷ گزہ بیشک	جوڑا سات گزہ ۳۵ روپے
	کیجئے	کیجیے
	گئی	گئی ہے
	ڈاکٹر	ڈائریکٹر
	سمجھوں	سمجھوں
۵۱	مجبور	مجبوراً
۵۲	۱۲	بارہ
	---	اکتوبر (۱۸۸۵)
۵۳	بکشوونڈ	نکشوونڈ
	دو عملے نہیں ہیں	دو عملے میں ہیں
	لودیانہ	لودیانے
۵۴	نشائین	نشأتین
	نواب صاحب یہاں سے تبدیل ہوکر انبالہ سے آگئے ہیں	نواب صاحب یہاں تبدیل ہو کر انبالے سے آگئے ہیں
	علیحدہ	علحدہ
۵۵	نتیجہ	نتیجے
	بہانہ	بہانے

	آنے کے بارہ میں	آنے کے بارے میں
	مدرسہ	مدرسے
	پٹیالہ	پٹیالے
	لکھئے	لکھیے
۵۶	۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء یوم شنبہ	--
	درجہ	درجے
	کہئے	کہیے
	جوڑہ	جوڑا
۵۷	معاملہ	معاملے
	سکولوں	اسکولوں
	سکول	اسکول
	ہفتہ	ہفتے
	سٹیشن	اسٹیشن
	چلے جاؤ	چلے آؤ
	---	(۳۰ مارچ ۱۸۷۷ ع)
۵۸	شملہ	شملے
	ادہر	ادھر
	شکرگذار	شکرگزار
	پٹیالہ	پٹیالے
	دونو	دونوں
	مدرسہ	مدرسے
	مالگذار	مال گزاری
	---	اگست ۱۸۷۷ ع

۵۹	معاملہ	معاملے
	کہنا ضرور ہے	کہنا کیا ضرور ہے
	سن چکے وہ	سن چکے ہو وہ
	باحسن	بہ احسن
	کئے	کیے
	لی	لی ہے
	۱۰ کو	دس کو
	شملہ	شملے
	بدھ	بدھ
	سکول	اسکول
	بتصدق ائمہ ہدیٰ	بہ تصدیق ائمہ ہدیٰ
	صہ صہ تک	پانچ پانچ روپے تک
	جوڑہ	جوڑا
	ہفتہ دو ہفتہ	ہفتے دو ہفتے
	سمجھئے	سمجھیے
	۸	آٹھ آنے
۶۰	۹	۹۔ (نو)
	علاقہ	علاقے
	۱۵ کو علاقے پر	پندرہ کو علاقے پر
	رکھئے	رکھیے
	۱۵۔۲۰	پندرہ بیس
	کہئے	کہیے
۶۱	آدہی	آدھی

	کچھ بھی نہ کام آئے	کچھ بھی کام نہ آئے
	معہ	مع
	سٹیشن	اسٹیشن
	رفع کے لیے	رفع (تردد) کے لیے
	۵	پانچ
۶۲	۔	۔
۶۳	کلیجہ	کلیجا
	نکشووند	بکشووند
	ہونے باقی ہیں	ہونے سے باقی ہیں
	معاملہ	معاملے
	۳۰ روپیہ مہینہ	تیس روپے مہینے
	پٹیالہ	پٹیالے
	لدہیانہ	لدھیانے
۶۴	دعا ہائے	دعاہائے (فراواں)
	ٹھیری	ٹھہری
۶۵	البتہ از ملاحظہ فراغ دست دارہ باشم	البتہ از ملاحظہ فراغ یافتہ باشد
۶۶	رستہ	رستے
	ٹھیرئے	ٹھہریے
	بہت جاتے آتے ہوئے	بُہت جاتے ہوئے
	تولہ	تولے
	پورا ہی کرو	ہی (؟) پورا کرو
	روپیہ	روپے

دوسرے یہ لوگ	دوسرے یہ کہ لوگ	
دعا ہا (ے فراواں)	دعا ہائے	٦٧
مشاعرے	مشاعرہ	
بالاستیعاب	بالاستعجاب	
میرے اُوپر جو تمھیں خیال ہے	میرے اوپر بھی جو کچھ تمہیں خیال ہے	
شاید اس کا اثر بہ نسبت اس کے	شاید اس کا اثر کچھ بہ نسبت اس کے	
روپے	روپیہ	
پٹنیس (۳۵)	ــــــ	
پچاس ساٹھ روپے	۵۰ ٦۰ روپیہ	
دونوں	دونو	
---	فقط	
دعاہائے فراواں	دعا ہائے	٦٨
شملے	شملہ	
---	کہ ہمیر سنگھ اس کا بھائی بھی وہاں پہنچ گیا ہے کوٹھے پر دونو مزے سے رہتے ہیں	
جو لکھتا تھا	جو کچھ لکھنا تھا	
آپ اس معاملے میں حضرات	آپ اسی معاملے میں اور حضرات	
جاؤں گا	جاؤں	
دلی	دلی میں	
بالا خانہ	بالائے خانہ	٦٩

	وظیفہ	وظیفے
	سکول	اسکول
۷۰	ے	سات
	ہم بھی چلیں	ہم چلیں
	جمعہ	جمعے
	پٹیالہ	پٹیالے
	طیار	تیار
	ہفتہ	ہفتے
	انبالہ	انبالے
	سٹیشن	اسٹیشن
	لدھیانہ	لدھیانے
	ڈاکٹر لائٹرز	ڈاکٹر لائٹنر
	ـــ	(جمعہ ؟ اگست ۱۸۷۶ع)
۷۲	سلامت	سلامت باد
	درجہ	درجے
	غزلیں تمہاری احتیاط سے رکھ چھوڑی ہیں	غزلیں رکھ چھوڑی ہیں۔
	اعلےٰ	اعلیٰ
۷۳	سید ناصر نذیر فراق	سید ناصر نذیر فراق سلامت
	دعا ہائے سلامت ۔ بعد از دعا فراواں معلوم باد	بعد از دعا ہائے فراواں معلوم باد
۷۴	جابجا صلاح	جا بہ جا اصلاح

	بندہ۔آزاد۔لاہور	بندہ آزاد
۷۵	فرایض	فرائض
	کام	یہ کا
	بچارہ	بے چارہ
	ضائع	ضایع
	صفحہ	صفحے
	کثر	کسر
	پس بھئی	بس بھئی
۷۶	مقدمہ	مقدمے
	معاملہ	معاملے
۷۷	--	۸۰ تا ۷۰
۷۸	مدت معود	مدت معہود
	لہ روپیہ	نو روپے
	۸۔۹۔۱۰	آٹھ، نو، دس
	گذر	گزر
	---	چھتیس روپے گیارہ آنے
	دیکھئے	دیکھیے
	کرایہ نامہ	کرائے نامے
۷۹	شاید کبھی	کہ شاید کبھی
	شاجہان	شاہ جہاں
	اول چند ورق	چند ورق
	رسایل	رسائل
	عقاید	عقائد

	چھاپہ	چھاپے
	صدر	صدرا
	چھاپ	چھاپہ
۸۰	ایک شاگرد کے نام	بنام نا معلوم
	کیا شمار	کیا حال شمار
	اوئے اوئے	اوئی اوئی
	۴ گز پھر ۷، ۸، ۱۰، ۱۲ عہ گز	چھ گز ، پھر سات ، آٹھ ، دس ، بارہ ، سولہ گز
	۲۰، ۲۰	بیس بیس
	للّی۔ ۔	چالیس پچاس
	تم اُن سے مل کر گفتگو کرو اور کہو کہ ایک بیوقوفی کرتا ہوں ، سب بھائی بندمل اُس کا بوجھ بٹالو	۔۔۔تم اُن سے مل کر اُن کا بوجھ بٹالو
	۵۔۶	پانچ چھ
	۶ ۶	ایک روپے سات یا آٹھ آنے
	۔۔۔	۱۸۸۵ ع
۸۱	کسی شاگرد کے نام	بنام نا معلوم
	ڈرامہ	ڈرامے
	۔۔	(ہی)
	تھیں	تھی
	اعلےٰ	اعلیٰ
	انشائیہ	کا انشائیہ
	شملہ	شملے

	اعلےٰ علےٰ عہدہ دار	اعلیٰ اعلیٰ عہدے دار
	ڈرامہ	ڈراما
	یہ ہی	یہی
	--	۱۸۸۵ع
۸۲	گذر	گزر
	سکشہا سبھا	شکشا سبھا
	جلسہ	جلسے
	دہرم	دھرم
	جو بُر ہیں	جو بُری باتیں ہیں
	اور سب	سب
	سمجھے	سمجھتے
	بُری نہیں	کہاں بُری نہیں
	عقبےٰ	عقبیٰ
	ساتا	ساتے
	راجہ	راجا
	---	(کذا)
	کتی است	کتی ست
	آتی تھی	آتی ہے
	رول --	رول (قانون)
	برہمو دھرم	برہمو سماج
	ضبطی	ضبطے
	بہ مِی	بہ مئے
	ربطی	ربطے

	---	۱۸۶۵ء
۸۳	Nil	
۸۴	معاملہ	معاملے
	شیطنتیوں	شیطنتوں
	رکھئے	رکھیے
	اپنے نخ کے	--نخ کے
	عذر	عذر
	--	(۱۸۷۱ء)
۸۵	کتبہ	کتبے
	رسالہ	رسالے
	--	(۱۸۷۰ء)
۸۶	بنام چھٹی رساں	بنا نوشاہی
	نوشاہی	نوشاہی
	محمد حسین عفی عنہ ۴ دسمبر ۷۶ء	فدوی محمد حسین آزاد عفی عنہ ۴ دسمبر ۱۸۷۶
۸۷	شکر گذار	شکر گزار
	خدمتگذار	خدمت گزار
	کرادیں	کروادیں
	عہدہ	عہدے
	دون	دوں
	موقعہ	موقع
۸۸	-	-

٨٩	ذمہ	ذمے
٩٠	سکرٹری	سکریٹری
٩١	کالج لاہور	گورنمنٹ کالج لاہور
٩٢	رہ گذر	رہ گزر
	درجہ	درجے
	رستے	راستے
	لکھی ہیں	لکھی گئی ہیں
	مصنف سے	مصنف سے
	--	(قبل ١٨٦٩ ع)
٩٣	مولوی سید علم دار حسین	مولوی علم دار حسین
	۴۵ ، ۵۰	پنتالیس ، پچاس
	--	(١٨٧٠ ع)
٩۴	انہیں	انھیں
	عذر	عذر
	صرف وقت	وقت صرف ہونے میں
	گھنٹہ	گھنٹے
	--	(١٨٧١ ع)
٩۵	نہیں ہوتا	نہیں آتا (ہوتا؟)
	فضیلت	(امتحان) فضیلت
	۲۵	پچیس
	مدرسہ	مدرسے
	۳۰	تیس

---	صاحبزادہ کابل کے درمیان کا رہنے والا ہے برس دن سے زیادہ ہوا کہ عزلی اونٹے جماعت کی پڑھتا ہے حصہ اوّل زبدہ پڑھ چکا ہے۔ ۲۰۔۲۲ برس کی عمر ہوگی	
فرمائش	فرمایش	
تک درست	تک بھی درست	
گھنٹے	گھنٹہ	
قریب پچاس برس	قریباً ۵۰ برس	
اول کی پچاس برس	اول مین ۵۰ برس	
چالیس	۴۰	
کچوئل	کچوئل	۹۶
(۲۳ فروری ۱۸۸۵ ع)	--	
ڈیکل سارٹیفکیٹ	میڈیکل سارٹیفکیٹ	۹۷
(۱۸۸۵ ع)	--	
گزارہ	گذارہ	۹۸
بارہ	۱۲	
رفع ہوگئی ہے	رفع ہوئی ہے	
خدایگان	خدائگان	۹۹
دورے	دورہ	
لاہور میں اور محکمہ	لاہور میں پہنچا اور محکمہ	
خلق خدا رضا مند ہو	کہ خلق خدا کو فوائد حاصل ہوں اور خدا اور نائبان خدا رضا مند ہوں	
دفعتاً	دفعتہً	۱۰۰
مع	معہ	

(۱۸۷۱ء)	--	
---۲۰ فروری	اخبار انجمن ۲۰ فروری	۱۰۱
مسل	مثل	
(۱۸۷۱ء)	--	

مخزن میں شائع ہونے والے مکتوبات ، مرغوب ایجنسی سے شائع کردہ مکتوبات ، مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد اور مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی صاحب کے باہمی موازنہ سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مخزن اور مرغوب ایجنسی سے شائع ہونے والے مکتوبات میں بہت کم فرق ہے ان میں اختلافات بھی کم ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مرغوب ایجنسی نے بھی مخزن میں شائع ہونے والے مکتوبات کو ہی شائع کیا تھا۔مخزن میں شائع ہونے والے مکتوبات میں اس دور کی رائج اردو کے الفاظ ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ مثلاً سمجھے ،سکرٹری ، دیکھی ، کئے ، پڑہا وغیرہ ۔ مخزن کے مکتوبات کا متن اصل کے زیادہ قریب ہے ۔مرغوب ایجنسی سے شائع کردہ مکتوبات میں کچھ تبدیلیاں تو آ گئی ہیں جیسا کہ اوپر درج کی گئی ہیں۔لیکن پھر بھی دوسرے دونوں مجموعوں مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر اور مکتوبات آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی سے بہت کم ہیں ۔ اسی طرح اگر ہم ان دونوں مجموعوں مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد اور مکاتیب آزاد مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کو دیکھتے ہیں تو مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر کا مجموعہ بھی ان دونوں مخزن میں شائع کردہ مکتوبات اور مرغوب ایجنسی سے شائع کردہ مکتوبات کے متن کے قریب قریب ہے۔اور اس کے مکتوبات بھی میرے نزدیک اصل متن کے قریب ہیں ۔ چونکہ یہ مکتوبات تعداد میں زیادہ ہیں اس لیے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ مکتوبات آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر کے مکتوبات کو آزاد کا مستند اور تنقیدی متن قرار دیا جا سکتا ہے ۔ مکاتیب آزاد کا متن آج کے دور کی رائج اردو کے مطابق ہے۔لیکن ان کے متن میں کئی کئی جملے حذف ہیں اِسی طرح بعض مکتوبات میں جو تاریخ دی گئی ہے وہ قیاس آرائی سے

دی گئی ہے ، کوئی مصدقہ ثبوت کے ساتھ نہیں دی۔ بہت سے الفاظ خود سے بدل لیے ہیں۔ اسی طرح بعض مکتوبات میں تاریخ مکتوبات کے شروع میں دی گئی ہے لیکن مکاتیب آزاد میں تاریخ شروع میں نہیں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح مکاتیب آزاد کے متن میں بہت سی تبدیلیاں ہیں یہ تبدیلیاں مکتوب کی عبارت کو تو واضح کرتی ہیں لیکن مکتوب اپنے اصل متن سے ہٹ جاتا ہے۔ البتہ مجموعہ ''مکاتیب آزاد'' میں قاری کے لیے یہ سہولت ہے کہ انھوں نے حاشیے میں تقریباً ہر بات کی وضاحت کر دی ہے جس کی کمی اوّل الذکر مجموعوں میں محسوس ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد ۱۹۶۶ء، ص ۸۹

۲ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۔۱۶

۳ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد ''مکتوبات آزاد''، نظام الدین گیلانی پریس لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۱

۴ ایضاً ، ص ۱۲

۵ ایضاً

۶ ''مکاتیب آزاد''، ص ۱۸۸

۷ ایضاً ، ص ۱۸۹

۸ ایضاً ، ص ۱۹۳

۹ ایضاً ، ص ۱۹۵

۱۰ ایضاً ، ص ۲۴۰

۱۱ ایضاً ، ص ۱۷۱

۱۲ ''مکتوبات آزاد''، ص ۲۰

۱۳ ایضاً ، ص ۲۲

۱۴ ایضاً

۱۵ ''مکتوبات آزاد'' ص ۲۴

۱۶ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، '' مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۷

۱۷ ایضاً ، ص ۲۰۰

۱۸ ایضاً ، ص ۲۱۵

۱۹ ایضاً ، ص ۲۲۳

۲۰ ایضاً ، ص ۱۸۸

۲۱ ایضاً ، ص ۱۹۳

۲۲ ایضاً ، ص ۱۹۵۔۱۹۶

۲۳ ''مکتوبات آزاد'' ص ۱۹

۲۴ ایضاً ، ص ۱۶

۲۵ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۹۱

۲۶ ایضاً ، ص ۱۷۷

۲۷ ایضاً ، ص ۱۷۷۔۱۷۸۔۱۷۹

۲۸ ایضاً ، ص ۱۷۹

۲۹ ایضاً ، ص ۱۸۱

۳۰ ایضاً ، ص ۲۱۳

۳۱ ایضاً ، ص ۲۱۴

۳۲ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۲

۳۳ ایضاً ، ص ۱۷۴

۳۴ ایضاً ، ص ۱۷۷

۳۵ ''مکتوبات آزاد'' ص ۱۵

۳۶ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۹۰

۳۷ ایضاً ، ص ۱۸۳

۳۸ ایضاً ، ص ۱۸۴۔۱۸۵

۳۹ ایضاً ، ص ۱۸۶

۴۰ ایضاً ، ص ۱۹۱

۴۱ ایضاً ، ص ۱۹۴

۴۲ ایضاً ، ص ۲۱۹

۴۳ ایضاً ، ص ۲۲۲

۴۴ ''مکتوباتِ آزاد'' ص ۳۰

۴۵ ''مکاتیب آزاد'' ص ۲۱۲

۴۶ ایضاً ، ص ۲۲۱

۴۷ ایضاً ، ص ۹۰

۴۸ ایضاً ، ص۹۴

۴۹ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد ، ۱۹۶۶ء، ص ۹۸

۵۰ ایضاً ، ص ۹۸

۵۱ ایضاً ، ص ۹۹

۵۲ ایضاً ، ص ۱۰۲

۵۳ ایضاً ، ص ۹۰

۵۴ ایضاً ، ص ۹۰

۵۵ امداد صابری چوڑیوالاں دہلی، ''تاریخ صحافت اُردو'' (جلد دوم) ۱۹۵۳ء، ص

۵۶ ''مکاتیب آزاد'' ص ۹۰۔۹۱

۵۷ ایضاً ، ص ۹۶

۵۸ ایضاً ، ص ۹۷

۵۹ ایضاً ، ص ۹۔۹۸

۶۰ ایضاً ، ص ۹۸

۶۱ ایضاً

۶۲ ایضاً ، ص ۹۹

۶۳ ایضاً ، ص۱۰۲

٦٤ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد ، ١٩٦٦ء، ص١٠٣

٦٥ ایضاً ، ص ١٠٣

٦٦ ایضاً ، ص ١٠٥

٦٧ ایضاً ، ص ١٠٧

٦٨ ایضاً ، ص ١٠٨

٦٩ ایضاً ، ص١٠٩

٧٠ ایضاً ، ص ١١١

٧١ ایضاً ، ص ١١٢۔١١٣

٧٢ ایضاً ، ص ١١٤

٧٣ ایضاً ، ص ١١٥

٧٤ ایضاً ، ص ١١٧

٧٥ ایضاً ، ص ١١٩

٧٦ ایضاً ، ص ١٢٢

٧٧ ایضاً ، ص ١٢٢

٧٨ ایضاً ، ص ١٣٠

٧٩ ایضاً ، ص ١٣١۔١٣٤

٨٠ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد، ١٩٦٦ء، ص ١٣٣۔١٣٤

٨١ ایضاً ، ص ١٣٤۔١٣٥

٨٢ ایضاً ، ص ١٣٥۔١٣٦

٨٣ ایضاً ، ص ١٣٨۔١٣٩

٨٤ ایضاً ، ص ١١٣

٨٥ ایضاً ، ص ١١٦

٨٦ ایضاً ، ص ١١٧

٨٧ ایضاً ، ص ٥٠۔٥١

٨٨ ایضاً ، ص ٥٨

٨٩ ایضاً ، ص ٥٩۔٦١

٩٠ ایضاً ، ص ٦٠۔٦١

٩١ ایضاً ، ص ٦٤۔٦٥

٩٢ ایضاً ، ص ٧٤

٩٣ ایضاً ، ص ٧٥

٩٤ ایضاً ، ص ٧٤۔٧٥

٩٥ ایضاً ، ص ٧١

٩٦ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' ازمولانا محمد حسین آزاد، ۱۹۶۶ء، ص ۷۲

٩٧ ایضاً ، ص ۷۶

٩٨ ایضاً ، ص ۶۸

٩٩ ایضاً ، ص ۷۵۔۷۶

۱۰۰ ایضاً ، ص ۶۹

۱۰۱ ایضاً ، ص ۷۰

۱۰۲ ایضاً ، ص ۶۶

۱۰۳ ایضاً ، ص ۶۶

۱۰۴ ایضاً ، ص ۶۷

۱۰۵ ایضاً ، ص ۷۷

۱۰۶ ایضاً ، ص ۷۸۔۷۹

۱۰۷ بحوالہ پیش لفظ ''مکاتیب آزاد''، ص ۱۷

۱۰۸ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۵۰۔۱۵۱

۱۰۹ ایضا ، ص ۱۵۱۔۱۵۲

۱۱۰ ایضاً ، ص ۱۵۲

۱۱۱ ایضاً ، ص ۱۵۳

۱۱۲ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزادؔ'' از مولانا محمد حسین آزاد، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۴

۱۱۳ ایضاً ، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۱۱۴ ایضاً ، ص ۱۵۵

۱۱۵ بحوالہ پیش لفظ ''مکاتیب آزادؔ''، ص ۱۷

۱۱۶ مکاتیب آزاد ، ص ۲۶۸

۱۱۷ ایضاً ، ص ۲۵۹

۱۱۸ ایضاً ، ص ۲۶۰

۱۱۹ ایضاً ، ص ۲۶۱

۱۲۰ ''مکتوبات آزادؔ'' ، ص ۸۸

۱۲۱ ''مکاتیب آزادؔ'' ص ۲۳۷۔۲۳۸

۱۲۲ ایضاً ، ص ۱۴۵۔۱۴۷

۱۲۳ ایضاً ، ص ۲۴۷۔۲۴۸

۱۲۴ ایضاً ، ص ۲۴۹۔۲۵۰

۱۲۵ ایضاً ، ص ۲۵۰۔۲۵۱

۱۲۶ ایضاً ، ص ۲۵۱

۱۲۷ ایضاً ، ص ۲۵۲

۱۲۸ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۲

۱۲۹ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' (حصہ اوّل) انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اُردو روڈ، کراچی، ص ۳۶۴۔۳۶۵

۱۳۰ مکاتیب آزاد، ص ۲۶۱۔۲۶۳

۱۳۱ ایضاً ، ص ۲۶۷۔۲۶۹

۱۳۲ ایضاً ، ص ۲۷۱

۱۳۳ ایضاً ، ص ۲۵۳۔۲۵۴

۱۳۴ ایضاً ، ص ۲۵۴

۱۳۵ ایضاً ، ص ۲۵۵

۱۳۶ ایضاً ، ص ۳۱۔۳۲

۱۳۷ ایضاً ، ص ۴۰۔۴۱

۱۳۸ ایضاً ، ص ۴۱

۱۳۹ ایضاً ، ص ۱۸

۱۴۰ ایضاً ، ص ۷۳۔۷۴

۱۴۱ ایضاً ، ص ۷۷۔۷۸

۱۴۲ ایضاً ، ص ۱۳۳

۱۴۳ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' از مولانا محمد حسین آزاد، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۸

۱۴۴ ایضاً ، ص ۱۵۹

۱۴۵ ایضاً ، ص ۱۵۹۔۱۶۰

۱۴۶ ایضاً ، ص ۱۶۲

۱۴۷ ایضاً ، ص ۱۶۴

۱۴۸ ایضاً ، ص ۲۰۳

۱۴۹ ایضاً ، ص ۲۴۴۔۲۴۵

۱۵۰ ایضاً ، ص ۲۶۔۲۵۷

۱۵۱ ایضاً ، ص ۲۶۳۔۲۶۴

۱۵۲ ایضاً ، ص ۳۷۔۳۸

۱۵۳ ایضاً ، ص ۴۴۔۴۵

۱۵۴ ایضاً ، ص ۴۶

۱۵۵ ایضاً ، ص ۵۲

۱۵۶ ایضاً ، ص ۵۵۔۵۶

۱۵۷ آزاد، شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب، ''نظم آزاد''، مفید عام پریس، لاہور، ۱۸۹۹ء، ص ۴۔۸

۱۵۸ محمد صادق ، ڈاکٹر ، ’’ آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین‘‘ مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع اوّل ۱۹۷۳ء ، ص ۶۶۔۷۱

۱۵۹ ’’مکاتیب آزاد‘‘ ، ص ۸۳۔۸۵۔

۱۶۰ ایضاً ، ص ۸۷۔۸۸۔

۱۶۱ ایضاً ، ص ۹۳

۱۶۲ ایضاً ، ص ۲۲۶

۱۶۳ ایضاً ، ص ۲۴۰

۱۶۴ ایضاً ، ص ۲۳۹۔۲۴۰

۱۶۵ ایضاً ، ص ۲۶۵۔۲۶۶

۱۶۶ گوہر نوشاہی ، ڈاکٹر ، سے راقمہ کی براہ راست گفتگو بمقام اسلام آباد بتاریخ ۸ جون ۲۰۰۷ء

۱۶۷ محرم علی چشتی ، مولوی ، ’’رفیق ہند‘‘ جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۱۴ رفیق ہند پریس لاہور ، ۳ اپریل ۱۸۸۶ء ، ص ۳

۱۶۸ ’’مکاتیب آزاد‘‘ ، ص ۲۴۷

۱۶۹ ’’مکاتیب آزاد‘‘ ، پیش لفظ ص ۱۵

۱۷۰ ایضاً ، ص ۱۴۔۱۵

۱۷۱ ’’مکتوبات آزاد‘‘ ، ص ۸۸،

۱۷۲ ’’مکاتیب آزاد‘‘ ، ص ۱۴

۱۷۳ ایضاً ، ص ۱۳۔۱۴

۱۷۴ گوہر نوشاہی ، ڈاکٹر ،''تحقیقی زاویے'' مجلس فروغ تحقیق، اسلام آباد ۱۹۹۱ء ، ص ۳۳۵

۱۷۵ ایضاً ، ص ۳۳۷

۱۷۶ گوہر نوشاہی ، ڈاکٹر ،''تحقیقی زاویے'' مجلس فروغ تحقیق، اسلام آباد ۱۹۹۱ء ، ص ۳۳۸

۱۷۷ ایضاً

۱۷۸ ایضاً ،ص ۳۳۹۔۳۴۴ ، نیز رفیق ہند ۲۸ نومبر ۱۸۸۵ء ، ص ۹۔۱۰

۱۷۹ ''تحقیقی زاویے'' ، ص ۳۴۴۔۳۴۶

۱۸۰ مولوی فیروز الدین ڈسکوی ،'' اُردو لغات فیروزی'' اُردو بازار لاہور ، ۱۹۸۹ء

۱۸۱ ایضاً

۱۸۲ ''راوی'' محمد حسین آزاد نمبر گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۸۳ء ، ص ۱۵۴

۱۸۳ ایضاً ، صفحہ نمبر موجود نہیں۔

باب پنجم

مکاتیب آزاد اور آزاد کا اُسلوب نثر، ایک تنقیدی جائزہ

مکاتیب آزاد اور آزاد کا اُسلوب نثر

مولوی محمد حسین آزاد کا مقام انشاپردازی میں بہت اہم ہے۔فن کو سنوارنے اور اس میں رنگینی پیدا کرنے کی طرف آزاد نے توجہ دی اس لئے ان کی نثر میں نظم کا سا لطف آتا ہے۔مگر ان کے خطوط میں یہ کیفیت دکھائی نہیں دیتی۔بقول ڈاکٹر ملک حسن اختر:

> اِنھیں ماضی سے بھی بڑی محبت ہے، وہ ماضی کے واقعات کو جس حسن اور خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں، وہ حال کے واقعات کے بیان میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوبات میں انشاپردازی کا وہ جوہر نہیں جو ان کی دوسری تصانیف میں نظر آتا ہے۔[1]

آزاد نے اپنے مکتوبات میں انشاء پردازی کی بجائے عام بول چال کا انداز اپنایا ہے۔مکتوبات میں سادہ صاف اور شستہ زبان استعمال کی ہے۔ سادگی اور بے تکلفی کی روش کو اپنایا ہے۔آزاد نے خطوط میں اس نئی روش کو اس انداز سے اختیار کیا ہے کہ گویا دلی کی زبان بول رہے ہیں۔ ان کے بعض مکتوب مرزا غالب کے خطوط سے اس قدر ملتے ہیں کہ اگر یہ خطوط مرزا غالب کے خطوط میں شامل کر دیے جائیں تو اُن دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے۔مثلاً غالب کے خطوط میں سلاست و روانی ہے۔مولوی محمد حسین آزاد نے غالب کے اس طرز کو اس قدر اپنایا کہ ان کے خطوط میں بھی یہ خوبیاں آ گئی ہیں۔

ملاحظہ ہو مولانا آزاد کا یہ خط:

عزیز من! جو کچھ تم کہو سچ ہے، کیوں کہ حق بہ جانب تمھارے ہے مگر میں کیا کروں کہ یہاں جو جو مسلک تدبیر کے ہیں وہ سب طے کیے اور کرتا ہوں اور کوئی رہبر رستہ نہیں ملتا۔[۲]

ایک اور خط ملاحظہ فرمائیں۔ جس میں مولانا آزاد کی سلاست و روانی جیسی صفات کا اندازہ ہوتا ہے:

جناب من! ہزار لعنت ہے مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں، اور لاکھ لاکھ لعنت ہے میرے اعمال و اشغال پر کہ مجھے ایسے عالم میں ڈال رکھا ہے کہ جو بھی چاہتا ہے اور واجب و فرض عینی ہے وہ کر نہیں سکتا۔ بھائی! تم تو سچے ہو، مگر تمھیں میرے حال کی بھی خبر ہے۔[۳]

آزاد کا اُسلوب نگارش اس طرح ہے جیسے مکتوب الیہ اور وہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں مثلاً ''اجی آؤ صاحب! آپ نے تو بڑی راہ دکھائی، میں نے تو جانا روٹھ گئے، اب دیکھیے کیوں کر منیں گے''۔[۴]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

صاحب! آپ تو دور بیٹھے مجھے احمق بناتے ہیں، اصل بات جو ہے وہ مختصر ہے۔ اب جھوٹے ڈھکوسلے آپ کے خوش کرنے کو بناؤں، یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خلیفہ صاحب سے ہو سکے۔ خط، چٹھی، جو ہو لکھوا لیجیے آپ کو یہ ارمان نہ رہ جائے۔[۵]

آزاد کے خطوط برجستگی اور بے ساختگی قلم کا نمونہ ہیں بے تکلفی اور خلوص اِن کے خطوں کی خوبی ہے۔ بے تکلفی سے ان کی نجی زندگی بھی ہمارے سامنے آگئی ہے۔ اِن کے خطوط میں اخلاص و

محبت کی چاشنی ہے اور کہیں سے یہ نہیں اندازہ ہوتا کہ کاتب نے اِن مکتوبات کو لکھنے میں کسی طرح کی سعی و کاوش کی ہے بلکہ ان مکتوبات میں بے ساختگی اور آمد کا عنصر نمایاں ہے۔ تصنع اور آورد بالکل نہیں ہے۔ اپنے بعض خطوں میں آزاد اپنے آپ کو غائب فرض کر لیتے ہیں مکتوب کے خاتمہ پر کبھی محمد حسین عفی عنہ، کبھی بندہ اور کبھی نیاز مند لکھتے ہیں اور کبھی صرف فقط پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

آزاد بعض اوقات رسمی القابات سے خط شروع کرتے ہیں لیکن کبھی، القاب و آداب کی پروا کیے بغیر، اس طرح مخاطب ہوتے ہیں: ''اجی آؤ صاحب! آپ نے تو بڑی راہ دکھائی۔ میں نے تو جانا روٹھ گئے''۔[۶] ''میاں بھائی! بہ موجب گفتگوے زبانی کے میں نے جہاں تک ہو سکا، آئین شرافت اور وضع داری کی پابندی کی، یقین ہے کہ آپ بھی طریقہ سلامت روی کی حفاظت فرمائیں گے۔۔۔[۷]''میاں نوشاہی جی! کوئی میرا خط ہوتو دے دیں''۔[۸]

ایک اور خط اِس طرح شروع کرتے ہیں ''ہاں صاحب! میں جو دلی گیا تو وہاں ابرو کو چیچک نکل آئی، بڑا: اضطراب رہا۔ غرض کہ انیس دن وہاں رہنا پڑا''۔[۹] ''صاحب! آپ کو تو خدا جانے کیا ہوگیا ہے؟ کارسٹیفن صاحب کی خبر پوچھتے ہو! بھائی میں کہہ چکا کہ یہاں وہابیوں کی عمل داری فرعونی ہے۔[۱۰]

''صاحب! خدا جانے تم بے ہوش ہو یا میں لکھنا پڑھنا بھول گیا، شکر گزاریاں تو اتنی، مطلب کی بات کا پتہ بھی نہیں ہے''۔[۱۱]

ان خطوں میں براہ راست مخاطب کرنے کے ساتھ ساتھ بے تکلفی بھی پائی جاتی ہے۔ بے تکلفی آزاد کے مکتوبات کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مثلاً ''لغات کی تالیف کے طعنے کیوں دیتے ہو؟ تمھاری نظر لگ گئی؛ اس دن سے ایک حرف لکھا ہوتو قسم لو''۔[۱۲]

چند مثالیں اور ملاحظہ فرمائیں

''لو صاحب، مبارک ہو! نائب تحصیلداری کیجیے اور جس طرح چاہیے ہم رعیتی لوگوں کو دبائیے۔[۱۳]

’’ ارے میاں ! کیوں مجھے جلاتے ہو ، بھلا میں اور ڈروں گا ؟ مگر میں کیا کروں
کہ میں جانتا ہوں تم بلکہ اور کوئی بھی نہیں جانتا‘‘۔[14]

’’صاحب کیا کہوں ، پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لو تو جب میرے خط کو پڑھو
اور مجھ سے خط و کتابت کرو‘‘۔[15]

ان کی بے تکلفی کے متعلق فرزانہ سید لکھتی ہیں:

’’مولانا محمد حسین آزاد اپنی قوت متخیلہ ، تمثیل اور مکالمے سے بھی پورا پورا کام لیتے
ہیں۔وہ بے تکلفی کو بھی بڑی خوبصورتی سے نبھاتے ہیں ۔ان کی یہ بے تکلفی ان
کے مکاتیب میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔۔۔‘‘[16]

لو صاحب ! آج تک انتظار میں خط لکھا ہوا رکھ چھوڑا کہ جواب با صواب
ملے ،مگر مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود ابھی تک رجسٹراری سے محروم ہیں!
اپنے لیے کوشش کر رہے ہیں اور کارگر نہیں۔[17]

’’میاں میرے ! تم تدبیروں کے رستم ہو ؛ جو کوئی نہیں کرتا سو تم کر گزرتے ہو۔
قسمت تمھاری کچھ زبردست ہے کچھ کمزور ہے‘‘۔[18]

’’تسلیم ۔ اللہ اللہ ! اس وقت کیا دل خوش ہوا ہے اور کیا غصہ آیا ہے۔ میں تو
صبر کر بیٹھا تھا ، اب سیلی ہوئی بارود کو آگ دینی کیا ضرور تھی ۔ مجھے آپ خط
نہ لکھا کریں۔؟‘‘[19]

’’جناب من ! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے الف لیلہ کے باب میں آپ سے کچھ
التماس کیا تھا ؛ یقین ہے کہ آپ نے میاں غلام رسول صاحب سے فرمایا
ہوگا‘‘۔[20]

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے مکتوبات میں روزمرہ اور محاورات کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے بقول ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی:

> روزمرہ و محاورات کا استعمال اتنا برجستہ کرتے ہیں کہ گویا لفظ کیا ہے نگین ہے کہ انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔جس طرح انیس کے شعر میں سے کوئی لفظ اِدھر اُدھر نہیں کر سکتے ، گویا یہ لفظ بس اُسی جگہ کے لیے موزوں ہے بلکہ اسی طرح ، آزاد کے خطوط میں یہ ہی تاثر پیدا ہوتا ہے۔[۲۱]

مولانا لکھتے ہیں:

> چھلا اگر ہو سکے تو مجھے بنوا دو اور ضرور بنوا دو ، ملا مترب نے پان سو روپے بھر کا احسان رکھ کر ایک دیا مگر معلوم ہوا کہ وہ مغشوش ہے۔ یہ کام فقیری کا ہے ، تم جیسے شاہ لوگوں سے ہوتا ہے نہ کہ شاہ لوگوں سے۔ جو کچھ لاگت ہوگی وہ میں دوں گا۔[۲۲]

> ''تمھارے لڑکوں نے کھنہ تک جو جو قدم زمین پر رکھے وہ میرے سر اور آنکھوں پر رکھے''۔[۲۳]

> ''پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لو تو جب میرے خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو''۔[۲۴]

اپنے خطوں میں محاروں ، ضرب الامثال اور کہاوتوں کا استعمال بھی موقع محل کی مناسبت سے کرتے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ''باقی جو رہ گیا۔۔۔ وہی بچوں کا کھیل کہ'' دودھ بھاتی منا کھائے ، چھی چھی چھی کوکو کھائے''۔[۲۵]

''اس پر وہ ناز کہ زمین اور آسمان میں نہیں سماتے کہ جو میرے گھر سوراجا کے نہیں''۔[۲۶]

اسی خط میں لکھتے ہیں:

''ان کی صورت دیکھ کر مجھے وہ مثل یاد آتی ہے کہ مرد کو شرم داڑھی کی ہوتی ہے، جب خدا داڑھی مونچھ کچھ نہ دے تو اس سے کیا بہتر؟''[۲۷]

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''فرمایئے تین آنے کی کتاب پر دو آنے رجسٹری کے دیتا تو آپ کو کیا جواب دیتا۔ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈھائی''۔[۲۸]

''میں گوش بہ آواز اور گربہ، بہ سوراخ موش بیٹھا ہوں''۔[۲۹]

''میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں، نہ ساون ہرا نہ بھادوں سوکھا''۔[۳۰]

''مگر یہ معاملہ تم جانتے ہو کہ نہایت نازک، بات ہونٹوں سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی''۔[۳۱]

مولوی محمد حسین آزاد کے مکتوبات کی ایک اور اہم خوبی ظرافت ہے لیکن اس ظرافت میں وہ حد سے آگے نہیں نکلتے۔ اِن میں ایک وضع داری، شرافت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ان کی ظرافت میں چُبھتے ہوئے نشتر نہیں ہیں۔ دھیما پن ہے۔

اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو کچھ سامان خرید کر بھجوانے کے لیے کہا، شاگرد نے کچھ عذر کیا۔ اسے آزاد خط میں لکھتے ہیں:

''جو خریدنا ہو خاطر جمع سے خریدو، گھبراہٹ کیا ہے،کوئی ابرو کا بیاہ تو سر پر نہیں، اب نہیں پھر، پھر نہیں پھر''۔[۳۲]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''خیر میں نے کون سا پنجاب سے نکاح کر رکھا ہے''۔[۳۳]

مولوی محمد حسین آزاد کے ایک دوست ملتان گئے ، لیکن وہاں سے اُن کی کوئی خبر نہ آئی۔ مولوی محمد حسین آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''بھائی وہ ملتان میں کہیں متعہ کر کے بیٹھ گئے''۔ [۳۴]

ان فقروں سے آزاد کی ظرافت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد اگر طنز بھی کرتے ہیں تو اُس میں بھی محبت اور خلوص کی حلاوت ہوتی ہے۔ان کا شاگرد (لالہ دنی چند) لاہور آ کر اِن سے ملے بغیر واپس چلا گیا۔ آزاد اُسے خط لکھتے ہیں:

''بعد از دعاہا معلوم باد ، تم لاہور میں آئے اور مجھ سے بے ملے چلے گئے ؟ شاباش ! شاباش ! خدا تمھیں ایسا بڑا کرے کہ مجھے پہچان بھی نہ سکو۔ میں بھی اسی میں خوش ہوں''۔ [۳۵]

اس طنز میں غصّے اور زہر خند کا شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ محبت اور خلوص کا عنصر نمایاں ہے۔ اِس طنز میں آزاد کی پوری شخصیت کا حسن عیاں ہے۔

ڈاکٹر لائٹز کو لکھتے ہیں ''میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے۔آپ اگر روکیں تو کسی لیفٹیننٹ کو روکیں ، کسی گورنر کو روکیں ، محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لیے کچھ فخر نہیں''۔[۳۶]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

اور اِتنی بات اور بھی دیکھ لیجیے گا کہ وہ شخص نیک طبع ہو۔ نیک طبع کیا ؟ اِس سے یہ مطلب نہیں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ،مولوی ،متقی ، پرہیز گار ہو ، پناہ بخدا!

ایسے سے تو میں بڑا ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں ضرور دغا دے گا۔ آپ نے مجھے دیکھ لیا کہ ہنستا ہوں ، ہر طرح تمسخر کرتا ہوں ۔مگر وہ خوشی اتنی ہی ہے اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی۔ بس وہ بھی اس قدر شگفتہ مزاج ہو تو ہرگز عیب نہیں۔[۳۷]

مولانا محمد حسین آزاد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اِن کے خطوط بعض اوقات جذبات و احساسات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ۔ مثلاً

''صاحب کیا کہوں ، پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لوتو جب میرے خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو۔خلیفہ جی پونے تین مہینے کے ہوئے تو انہیں بھی ملا صاحب کے پہلو میں جا کر سلا آیا''۔[۳۸]

آزاد کے اس خط میں ایجاز و اختصار بھی ہے اور اثر انگیزی بھی اثر انگیزی کی ایک اور مثال آزاد کے اِس خط سے ملتی ہے۔جس میں آزاد کی ذہنی کیفیات و احسات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ اور معصومیت اور سادگی بھی نمایاں ہے:

''ہزاروں کتے کہ شیر کی کھالیں پہنے تھے ، آپ نے اُنھیں مارا مگر اب تک یہ آپ کو نہ معلوم ہوا کہ شیر فقط ایک ہی بات میں شکار ہو جاتا ہے''۔[۳۹]

مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں ، کیوں کہ جو ستا ہے افسوس کرتا ہے اگر دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں کیوں کہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں ، میں اسی خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا ، وہ افسوس کرے گا ، یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا۔[۴۰]

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اب شکوے کی جگہ رہی نہ شکایت کا موقع ، اب وہ وقت آ گیا کہ بہ موجب

اپنے وعدے کے جاؤں گا اور سینہ چیر کے دکھاؤں گا کہ کتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے
یہ زخم بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں''۔[۴۱]

مولانا آزاد کے خطوط میں مرزا غالب کا سا مکالماتی انداز ہے۔ اگر اُن کے بعض خطوط کو مرزا غالب کے خطوط میں شامل کر دیا جائے تو واقعی تمیز کرنی مشکل ہو جائے مولانا محمد حسین آزاد کے خط سے اقتباس غور طلب ہے۔

''اجی آؤ صاحب ! آپ نے تو بڑی راہ دکھائی ، میں نے تو جانا روٹھ گئے ، اب
دیکھئے کیوں کر منیں گے''۔[۴۲]

مرزا غالب کا خط:

''کیوں صاحب ! روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں
منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو''۔[۴۳]

مولوی محمد حسین آزاد نے گو یہ خط اِس قصد یا ارادے سے نہیں لکھے کہ یہ شائع ہوں گے یہ خط اپنی ضروریات کے تحت اپنے دوست احباب کو لکھے ہیں۔ لیکن ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے مکتوب میں ہوتی ہیں۔ بعض خطوں میں تصویر کشی اور جزئیات نگاری اِس انداز سے کی ہے۔ کہ اِن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً صاحب مہتمم ''پنجابی اخبار'' کے نام لکھتے ہیں:

اب کے ہولی کے بعد ایک عجب تماشا دیکھنے میں آیا ، یعنی قریب شام میرا گزر''
سکشا سبھا'' کے آگے سے ہوا تو کچھ سواریاں باہر اور بہت سے لوگ اندر جاتے
ہوئے دکھائی دیے ، میں بھی مشتاق ہو کر اندر گیا ، دیکھا تو جلسے کا ساماں ہے ، مگر
اتنا فرق ہے کہ معمولی میز کے اُوپر ایک چوکی اور رکھی ہے اور اس پر ایک سفید
دھوتی پھیلی ہوئی ہے۔[۴۴]

پھر لکھتے ہیں:

> ہمارے خیال میں یہ تھا کہ وہ بھی ننگے سر آئیں گے مگر برخلاف اس کے ان کے سر پر اطلسی مخمل کی ٹوپی تھی ، بلکہ اس میں ایک طرہ لٹکتا تھا۔ ان کا قد بہت چھوٹا سا ، چہرہ خشک ، رنگت جس قدر سخت سیاہ ، اتنے ہی کپڑے بہت اُجلے ، بغل میں اپنے ہی قد کے برابر کتاب ، پاؤں میں گرگابی ، منہ پر فقط مونچھیں ، سر پر معمولی دو چار اُنگل بال تھے۔ مگر ٹوپی ان کی یہاں بھی نہ اُتری ۔ سیدھے آئے اور جا کر کھڑے ہوئے ۔ [۴۵]

ایک خط میں لکھتے ہیں:

> آپ نے تصویروں کا کچھ بندوبست نہ فرمایا۔ مجھے اکبر کی ایک تصویر ہاتھ آئی کہ تین چار ترک عورتیں بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچہ بیچ میں کھیلتا پھرتا ہے۔ رات کا وقت ہے شمع روشن ہے جھنجھنے وغیرہ سامنے پڑے ہیں۔ [۴۶]

مولوی محمد حسین آزاد کے خطوط انشا پردازی اور پاکیزگی تحریر کی شان لیے ہوئے ہیں۔ ہر فقرہ سادگی کے ساتھ ساتھ پُرکاری کا حامل ہے۔ گو خطوط میں مولوی محمد حسین آزاد کا وہ مرجبہ اندازِ بیان نہیں ہے جو ان کی دوسری تصانیف میں ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کے اندازِ بیان کی یہ جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثلاً میجر سید حسن بلگرامی کے نام لکھا ہوا یہ خط:

> اس کا مضمون یوں تصور فرمائیے کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دست کاری خرچ کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اُتر آئے، دسوں عقلیں ، پانچوں حواس ، غوروفکر ، وہم و خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے دوربینیں اُٹھائیں اور شش جہت میں

نگاہیں دوڑائیں ، کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی مگر وہ ایوان عالی شان وغیرہ۔ہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو ایسی جسارت زیبا نہیں۔آزاد نے کہا سحر کا نور شفق کی سُرخی ، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے اہل دل کہتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ صبا ونسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دل کہتا ہے صلی علی ، اس میں آفتاب سے اجازت ، اس میں خسرو گل سے استمزاج کون کرتا ہے۔[۴۷]

آزاد کے خطوط میں کہیں کہیں مقفیٰ عبارت بھی ہے۔ایک خط کا اقتباس دیکھیے :

یا اللہ ! بد نگاہوں سے بچائیو : اور بدی کے قلموں کو توڑیو! بے بس آزاد ، بے کس آزاد اس وقت ایک عالم میں بیٹھا ہے ، کس کا دل ہے کہ اس کیفیت کو پائے۔ نیک استاد ، پیارے استاد کے لکھے پھٹے پرانے کاغذ پرزے سامنے پھیلے ہیں۔ یہ لڑکپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں ، انہیں سامنے سے اٹھانا کیسے بھائیوں کو الوداع کہنا ہے۔ یہ درست ہے کہ گران سنگ فرض تھا اور گراں بہا قرض تھا جس سے آج میں ہلکا ہوا۔لیکن عمروں کا ساتھ ہے اور دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔موافقت رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے۔ ہاے دل گیر محنت تھی لیکن دل پذیر محنت تھی ؛ سخت کام تھا مگر مزے کا کام تھا ، اور ثواب پر انجام تھا کہ استاد کا کلام تھا۔ اب یہ کام کہاں! آہ استاد کہاں ![۴۸]

اِسی طرح کبھی کبھی بے تکلفی اور بے ساختہ پن کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ایک تعزیتی خط میں لکھتے ہیں۔

ہائے افسوس ! صد ہزار افسوس ! آسمان ٹوٹ پڑا ، زمین تہ و بالا ہوگئی، خدا جانے کیا ہوا اور کیوں مر گئے اچھا اب کیا ہوسکتا ہے۔یا ارحم الراحمین رحم کر بہ حق محمد وآل محمد! اوّل ان کے لئے رحمت ومغفرت کی دعا کرنی چاہیئے بعد اس کے یہ سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے ۔[۴۹]

مولوی محمد حسین آزاد بات میں سے بات نکالتے اور دلچسپ اور لطیف نکتے پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کو نصیحت کرتے ہوئے گورنمنٹ کے متعلق لکھتے ہیںؒ:

گورنمنٹ کو جو کرنا تھا وہ کر دیا، جو کچھ ہو گیا وہی مناسب ہے۔ اب خاموشی اور عرق ریزی سے اس کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ لیکن اتنا خیال ضرور ہے کہ سیکرٹری ہیں، صاحب قلم نہیں، فقط قلم ہو جائیں، جو کہا سو کر دیا، جو حکم دیا اس کی تعمیل کر کے لکھ دیا؛ اپنی طرف سے سرمو دخل نہ دیں۔[۵۰]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''یہ کام فقیری کا ہے، تم جیسے شاہ لوگوں سے ہوتا ہے۔ نہ کہ شاہ لوگوں سے''۔[۵۱]

مولوی محمد حسین آزاد کے خطوط کے اُسلوب کے بارے میں ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی لکھتے ہیں:

آزاد خطوط میں خطوط کا سا اعتدال رکھتے ہیں اور اُن میں افراط و تفریط نہیں نہ انشاپردازی کا زور دکھاتے ہیں۔ نہ کسی کو مرعوب کرتے ہیں۔ ان کے خطوط ایک وقار سکون، تحمل اور محبت و شفقت کا پاکیزہ نمونہ ہیں۔ وہ پرانی تہذیب کے صحیح معنوں میں نمائندے تھے۔۔۔آج سے تقریباً سو سال پہلے کی زبان اُنھوں نے اِس طرح خط میں سمودی ہے کہ وہ گویا آج کی زبان ہے۔ جس میں کہیں بھی کہنگی کا اثر نہیں آیا۔۔۔[۵۲]

آزاد کے خطوط آزاد کی طبیعت اور فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی قناعت پسندی، اُصول پسندی اور خود دار طبیعت کو اِن کے خطوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ میجر سید حسن بلگرامی نے آپ کو کچھ مشورے دیے۔ جواب میں مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

جن جن نسخوں کے لئے آپ نے ارقام فرمایا ہے، بے شک حصول مقاصد اور مطلب برآری کا رستہ یہی ہے، مگر کیا کروں کہ طبیعت ایسی واقع نہیں ہوئی، میں

ہمیشہ یک رخی بازی کھیلا ہوں ، اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا ، جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے۔ کبھی تو ہمارا پانسہ بھی سیدھا پڑے گا۔[۵۳]

ڈاکٹر لائٹنر سے اِن کے تعلقات بگڑ گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اِس سلسلے میں بڑے وقار سے کام لیا۔ اور ڈاکٹر لائٹنر جیسے ڈکٹیٹر کو خوش اور راضی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے خط میں لالہ دنی چند کو لکھتے ہیں:

میرا حال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں اُن سے کالج ہی میں ملا ؛ استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا ، دوسرے دن گھر پر ہی جا کر مل آیا۔ اِس دن سے پھر گھر پر نہیں گیا۔ اور زیادہ طریقہ یہی رکھا ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا ، ابھی تک تو وہ سیدھے سیدھے چلے جاتے ہیں میں بھی چلا جاتا ہوں آگے کا خدا مالک ہے آپ بدھ کے دن تک میرے خط کا انتظار کیجئے:[۵۴]

آزاد مکتوب الیہ کے مقام اور مرتبے کا خیال رکھتے ہیں اور وہ مخاطب کے ساتھ اُسی انداز کی گفتگو کرتے ہیں جس حیثیت یا رُتبہ کا وہ اہل ہوتا۔ دوستوں کے ساتھ دوستانہ مراسم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اور شاگردوں کے ساتھ استادانہ رویہ روا رکھتے ہیں۔ ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام لکھے گئے خطوط ان کی شُستہ اُردو کے وہ بے مثال نمونے ہیں جن کی لطافت اور حُسن بیان ، اُردو ادب میں نظیر نہیں رکھتی۔ آزاد مذہباً شیعہ تھے اور ان کو شیعیت کے ساتھ بے پناہ محبت تھی اِن کا میلان روا داری کی طرف تھا جیسا کہ ان کی دوسری تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے لیکن خطوط میں اِن کی یہ رواداری دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی آزاد کو ان سماجی معززین ، یعنی فقرا اور علماء سے بھی کوئی عقیدت تھی جن کی زندگیاں ظاہر داری لیے ہوئے ہوتی ہیں لالہ دنی چند کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

ایک اور مجتہد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں۔ میں تو ان کے ڈر کے مارے نواب کے ہاں بھی شملے سے آکر نہیں گیا۔ میرے نزدیک بہ نسبت ان لوگوں کے

> کہ جہاں جائیں دو وقتہ تر نوالے پلاؤ قورمے کے کھاتے ہیں اور گٹھڑیاں باندھ باندھ کر نقد وجنس لے جاتے ہیں۔ وہ دلی کے تباہی زدہ زیادہ تر استحقاق رکھتے ہیں کہ نہ کوئی انھیں دیتا ہے ، نہ کوئی ان میں سے کسی سے مانگ سکتا ہے اور سینکڑوں فاقے گزر جاتے ہیں۔[۵۵]

آزاد کو تحقیق کا شوق اور کتابوں سے لگاؤ تھا۔ میجر حسن بلگرامی کے نام لکھے گئے خطوط میں اِن کے اِس شوق اور لگاؤ کی جھلک پوری طرح آشکار ہے۔ مثلاً میجر سید حسن بلگرامی کے نام خط لکھتے ہیں:

> یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مآثر الامراء اور سوانح اکبری کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں؛ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتہ لگایا تھا ؛ چھ دن میں بھاگا بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا ، جو کچھ ہاتھ لگا اُسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ مآثر الامراء بھی مل گئی ؛ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے وہ مآثر الامراء سے بہُت زیادہ نکلا ، پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے۔ اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو دربار اکبری کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو مآثر ہاتھ نہیں آئی ۔[۵۶]

اس خط سے آزاد کی تحقیق کی جستجو اور کتابوں سے محبت کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ کِسی بھی چیز کی گہرائی میں جانے کے لیے کِس قدر سعی کرتے تھے۔ اِسی طرح اپنے خطوط میں اپنی غیر مطبوعہ تصانیف ''دربارِ اکبری'' '' قند پارسی '' ''سخن دان فارس'' سفر نامہ اور دوسری مجوزہ تصنیفات، مثلاً فارسی لغت اور ڈرامہ اکبر کے متعلق بھی بار بار لکھتے ہیں۔ جس سے ایک تو اِن کی مصروفیت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرا کتابوں سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ میجر سید حسن بلگرامی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

تذکرۃ العورات' کا حال جو آپ نے پہلے مرحمت نامے میں لکھا تھا۔ معلوم نہیں
کہ اس میں چاند بی بی کا بھی تذکرہ ہے۔ یا نہیں ، یہ بھی بڑی بالیاقت اور صاحب
ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے ؛ اسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے ، آپ وہاں سے اُس
کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشاء اللہ کبھی کام آئیں
گے۔ اِس طرح مصالحہ اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔[۵۷]

ایک اور خط میں اپنی تصنیفات سے محبت کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

''اچھا مجھے پنشن بھی دے دیں گے تو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پُورا کروں
گا ؛ اپنے لختِ جگر بچوں کو نیم جان تڑپتا نہ چھوڑوں گا''۔[۵۸]

اپنی تصنیفات کو مولانا محمد حسین آزاد نے لختِ جگر کہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نصاب مرتب کرنے کو اپنے لئے ایک مصیبت گردانتے تھے۔ مگر اس کے باوجود اِس کام کو دل لگا کر کرتے تھے انتخاب کرنے میں بھی محنت مشاقہ سے کام لیتے تھے۔ اس کا اندازہ اِن کے اِس خط سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جو اُنہوں نے میجر سید حسن بلگرامی کے نام ۳ فروری ۱۸۸۳ء کو لکھا:

باوجود اس کے کورس بنانے کے لئے ہم پکڑے جاتے ہیں فرسٹ آرٹ اور
بی۔اے کورس عربی و فارسی کے باب میں رائے طلب ہوئی ، اب بنانے کے لئے
حکم ہے کہ جلدی دو۔ اگر چہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے، مگر میں مصروف کار
ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے انتخاب میں آسان بات
یہ ہے کہ کتاب اٹھائی ، لکھ دیا کہ فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک ، مگر اسے دِل
پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے ایسا انتخاب ہو کہ طلباء کے لئے مفید تعلیم بھی ہو اور
پڑھنا اس کا ہر شخص کے لئے باعث شگفتگی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہُت ہے بس
اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔[۵۹]

مولانا محمد حسین آزاد کے ایک اور خط سے بچوں کی کتابوں کے بارے میں ان کے اندازِ نگارش کی وضاحت ہوتی ہے۔یہ خط ڈاکٹر لائٹنر کے نام ہے۔جس میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتاب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔آزاد لکھتے ہیں:

اس کتاب کو میں نے اکثر جگہ سے دیکھا، بچوں کے مناسب حال ہے۔ اور دیہاتی مدارس میں پڑھانے کے لیے خوب ہے اگر چاہیں تو بعض جگہ توضیح کر کے دلچسپ کر سکتے ہیں، مثلاً ملتان کی چھینٹ ایک زمانے میں اورشہروں میں جا کر اشرفی گز بکا کرتی تھی۔ اس کی آب و ہوا کو رنگ کی شوخی اور پختگی میں قدرتی تاثیر ہے۔انگریزی چھینٹوں کے آنے سے وہاں کے کارخانے بند ہو گئے۔ مینا کاری کا کام بہ نسبت اورشہروں کے اچھا ہوتا ہے، البتہ کشمیر کے برابر رنگ میں تیزی نہیں۔شہر ملتان بہ سبب راہ گزر کے ہندوستان اور خراسان کی منڈی ہے، لیکن پشاور سے دوسرے درجے پر امیر تیمور اسی راستے سے ہندوستان آیا تھا، اور بادشاہ بھی اسی راستے سے گزرتے رہے ہیں۔

طریقہ تعلیم کی کتابیں اُردو میں پہلے بھی لکھی گئی ہیں۔ جو بات اس کتاب میں ہے، کسی کتاب میں نہیں، مصنف نے مطالب کو خوبی سے ادا کیا ہے۔طرز ادا نے سہولت کے خط میں لیا ہے۔ اور انھیں دلچسپ بنا دیا ہے۔ انگریزی میں پہلے بھی جا بجا جاری تھیں مگر جو لوگ اِس سے بے بہرہ تھے وہ پوچھ پوچھ کر ترجمے کرتے پھرتے تھے۔ اب اُردو ہوگئی، گویا ہر شخص کے حصے میں آگئی۔ عبارت سلیس ہے اور الفاظ آسان۔ سہولت سے مطلب سناتے ہیں اور طریقہ سمجھاتے ہیں۔[٦٠]

اس خط سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کو بچوں کی کتابوں کے بارے میں ماہر سمجھا جاتا تھا اور ان کی رائے حاصل کی جاتی تھی۔ دوسرا ان کے طریقہ تصنیف پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ آسان زبان کو بچوں کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔

ان کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ وہ بچوں کو کیا سکھانا چاہتے ہیں اور ان کے لیے کون سا اُسلوب مناسب رہے گا۔ مولانا محمد حسین آزاد اس اُصول سے اچھی طرح واقف تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے بچوں کی نفسیات کے مطابق درسی کتابیں تصنیف کرنے کی رائے دی۔ مولانا محمد حسین آزاد یہ بھی جانتے تھے کہ ابتدائی کتابوں میں انداز بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اسے بچوں کے لئے عام فہم ہونا چاہیئے۔ اور ایسی سوچ صرف وہی رکھ سکتا ہے۔ جس کو خود اُسلوب پر دسترس حاصل ہو۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے تذکرہ ''آب حیات'' پر ریویو لکھنے پر شکریے کے خط میں بھی اِس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کتابیں لکھ رہے ہیں اور اس کے لئے اِنھیں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے اُنھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا۔ لکھنا اور مٹانا۔ بڈھا ہو کر بچہ بنا پڑا۔ پھرتے چلتے، جاگتے سوتے بچوں کے ہی خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔[۶۱]

اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد بچوں کی نفسیات سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ کہ وہ بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں کو کھلونے کہتے ہیں۔ آزاد جانتے ہیں کہ بچوں کی یہ عمر کھلونوں سے کھیلنے کی ہے۔ کتابیں بھی اِن کے لیے کھلونوں کی ہی مانند ہونی چاہیں تا کہ بچے دلچسپی سے اِن کتابوں کو کھیل ہی کھیل میں پڑھ جائیں۔ اور بیزاری اور اکتاہٹ کی بجائے لطف لے کر مزے اُڑائیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط کی ایک اور خوبی خلوص اور صداقت ہے۔ مولانا آزاد

کے شاگرد سید ناصر نذیر فراق خاندانی سید تھے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا عرصہ تک دوبارہ شادی کے لیے تیار نہ ہوئے۔آخر کار والدین کے شدید اصرار پر ایک جگہ مناسب رشتہ کرلیا۔ آزاد کو شادی کی خبر ہوئی ۔ اس واقعہ نے ان کو متاثر کیا اور بہت خوش ہوئے ، مولانا نے سید ناصر نذیر فراق کو مبارکباد کا خط لکھا۔ یہ خط ایسا صاف اور کھلا ہے کہ مولانا آزاد کے دل کی کوئی بات چھپی نہیں رہی۔ آزاد کا یہ خط مسرت سے بھر پور ہے۔لکھتے ہیں:

خدا کا شکر ہے کہ تمھارا بھوت اُتر اگیا اورتم نے اپنے ماں باپ کے فرمانے سے اپنا گھر بسا لیا یہ جوانی دیکھو اور یہ ستم دیکھو۔ معاذ اللہ برسوں رنڈوے بیٹھے رہے چلو اچھا ہوا کہ دوسری بیوی بھی پہلی بیوی کی طرح تمھاری خاطر خواہ مل گئی اور پھر چپڑی اور دو دو۔ بیوی بھی سیدانی بُرا نہ ماننا۔ اب تمھاری دلی میں ذات وات کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ پیسہ کو دیکھتے ہیں باہر والے جو کہتے ہیں کہ دلی والے بے جڑ ہیں تو کیا جھوٹ کہتے ہیں تمھارے والد ماجد پُرانے آدمی ہیں۔اس لیے اُنہوں نے تمھارے پسند کی جگہ بات نہ ٹھہرائی اور جہاں اُنھوں نے مناسب سمجھا وہاں شادی کی۔ خاتون جنت کی طفیل سے یہ بیوی تمھیں ساز گار رہو اور تم پھولو پھلو'۔[۶۲]

ایک اور خط میں اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو لکھتے ہیں:

''صاحب ! آپ تو دور بیٹھے مجھے احمق بناتے ہیں ؛ اصل بات جو ہے وہ مختصر ہے۔ اب جھوٹے ڈھکوسلے آپ کے خوش کرنے کو بناؤں ، یہ مجھ سے ہونہیں سکتا''۔[۶۳]

اس خط میں بھی محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔

''صاحب ! خدا جانے تم بے ہوش ہو یا میں لکھنا پڑھنا بھول گیا ،شکر گزاریاں تو اتنی ،مطلب کی بات کا پتا بھی نہیں ہے''۔[۶۴]

ایک اور خط اس طرح شروع کرتے ہیں:

"ہزار لعنت ہے مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں اور لاکھ لاکھ لعنت ہے میرے اعمال و اشغال پر کہ مجھے ایسے عالم میں ڈال رکھا ہے کہ جو جی بھی چاہتا ہے اور واجب فرض عینی ہے وہ کر نہیں سکتا"۔[۶۵]

ان جملوں میں کتنا خلوص اور پیار ہے یہ جملے انتہائی اعتماد کی دلیل ہیں۔ آزاد کے خطوط میں زندگی کی دلچسپاں بھی ہیں۔ اور زندگی کی حرارت بھی موجود ہے۔

آزاد کے وہ خطوط جو دوستوں اور شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں اُن کی نجی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔اِن میں آزاد کی شخصیت پوری طرح عیاں ہے وہ اپنی خواہشوں کا اور حسرتوں کا اظہار بھی کرتے ہیں۔اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا رونا بھی روتے ہیں۔ ناراض اور مشتعل ہوتے ہیں۔ انسان دوستی اور شرافت نفس کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ اور اِنسانی ہمدردی اور دل نوازی کا اِظہار بھی کرتے ہیں۔اِن خطوط میں وہ بے تکلفی ، محبت ، خلوص وصداقت ہے جس سے آزاد کی شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ وہ پرانی تہذیب کے صحیح معنوں میں نمایندے تھے یہ خط ایک ماضی پرست اور انتہائی جذباتی انسان کو جو اپنے جذبات کو عام طور پر عیاں نہیں کرنا چاہتا ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ابتداء میں کثرتِ غم اور بعد میں تصنیف و تالیف کی کثرت نے اِن کو زیادہ خط لکھنے کے مواقع نہیں دیے۔ اور نہ ہی اُنہوں نے خطوط کو وقت گزارنے کا ذریعہ بنایا۔ اِس لیے اِن کے خطوط تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن اپنی قدر و قیمت میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ زندگی کی دلچسپیاں ان کے ہر ہر لفظ سے ٹپکتی ہیں۔

آزاد کے اُسلوب کے بارے میں ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

آزاد کا اُسلوب بعینہ ان کی طبیعت کا آئینہ دار ہے ہم نے ان کی بحیثیت انسان جتنی خصوصیتیں بیان کی ہیں ، وہ سب ان کے اُسلوب میں بھی موجود ہیں۔خواہ ہم اُن کی شخصیت سے اُسلوب کی طرف آئیں یا اُسلوب سے شخصیت کی طرف ایک ہی ہے۔

دونوں سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزاد طبعاً جذباتی اور اعلیٰ تخیل سے بہرور تھے ۔ یہ دونوں خصوصیتیں ان کے اُسلوب میں منعکس ہیں ۔[٦٦]

آزاد کے نثری اُسلوب کی نمایاں خصوصیات بھر پور توانائی اور تخیلی وضع ہیں ، وہ جیسے بھی چاہیں سادہ ، پُرکار ، پرشکوہ ، پُرجوش عبارت لکھ سکتے ہیں ۔لیکن مکاتیب میں اُسلوب نثر آزاد کی باقی تصانیف کی بہ نسبت سادہ ہے ۔ اِن خطوط میں نہ تو وہ اپنا مخصوص انشا پردازی کا زور دکھاتے ہیں اور نہ ہی کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔لیکن بعض مکتوبات میں کہیں کہیں ان کی انشاء پردازی کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے ۔محمد حسین آزاد کے مکتوبات میں خلوص صداقت اور بے تکلفی ہے ۔ سادگی کا عنصر بھی نمایاں ہے ۔لہٰذا ان کے خطوط ایک وقار ، سکون ، تحمل اور محبت و شفقت کا پاکیزہ نمونہ ہیں ۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی :

> آزاد نے خطوط میں ادبی لہجے کی بجائے بول چال کی زبان استعمال کی ہے ۔ آزاد کا اُسلوب تخیلی Imaginary تھا تصویروں کی شکل میں اُن کے ذہن میں باتیں آتی تھیں ۔پہلے خطوط ادبی حیثیت سے ہوتے تھے ۔آزاد نے بول چال والا انداز اپنایا ۔[٦٧]

باب پنجم (حصہ ب)

مکتوبات آزاد میں سوانح آزاد کی جھلک

مکتوبات آزاد میں مولانا آزاد کی سوانح کی جھلکیاں ہمیں جا بہ جا ملتی ہیں مکتوبات آزاد میں سوانح آزاد کی جھلک کے سلسلے میں سید جالب دہلوی ''مکاتیب آزاد'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

لوگوں کو اُمید تھی کہ آب حیات کے چشمے سے مولانا کے ممدوح کوئی اور نالی کاٹ کر لائیں گے، اور دور آخر کے نامور شعرا کو اس میں سیراب کر کے زندگی جاوید بخشیں گے۔دربار اکبری کو بڑی شان و شوکت سے سجائیں گے اور اس کے مینا بازار کی زمانہء حال کے لوگوں کو سیر کرائیں گے۔۔خیابان فارس کی چمن بندی از سرنو فرما کر اُس میں نئے گل بوٹے کھلائیں گے۔نیز نگ خیال کے نئے تماشے دکھائیں گے۔ہندوستان کی گذشتہ باکمال خواتین کوکسی مرقع محل میں بسائیں گے، تاریخ ہند کے بہُت سے شان دار مناظر نئی نسل کے روبہ رو پیش کریں گے اور عروس زبان کو اصلاحات علمیہ کا زیور پہنائیں گے، جس کے ارادے وہ وقتاً فوقتاً ظاہر فرماتے رہتے تھے، مگر افسوس ہے کہ فلک بدنہاد کی کینہ توزی سے تمام امیدوں پر یک لخت پانی پھر گیا، اور مایوسی کا یہ مرتبہ بہم پہنچا کہ اب دفتر مخزن نے جو مولانا آزاد کے یہ تھوڑے سے خطوط کتابی شکل میں شائع کیے ہیں، اُن کو ہم آپ کا ایک قابل قدر تبرک سمجھتے ہیں، اور ملک و زبان کے حق میں ایک احسان عظیم سے تعبیر کرتے ہیں۔کیوں کہ اُن کے مکتوبات کے ذریعے سے رسالۂ مخزن نے نہ صرف مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دل آویز نمونہ شائقین اُردو کو دکھایا ہے، بلکہ بالواسطہ ان کی پر حوادث مگر قیمتی زندگی سے حالات کا وہ دل چسپ حصہ بہم پہنچایا ہے۔جس کا مہیا ہونا خود مولانا آزاد سے بھی نظر بہ حالات موجودہ سخت دشوار تھا۔[۲۸]

مولانا آزاد کے خطوط گو تعداد میں زیادہ نہیں ہیں ، اُس کی بڑی وجہ ان کا علمی کاموں میں مشغول رہنا اور تصنیف و تالیف سے فرصت نہ ملنا تھی ۔ لیکن ان کے یہ خطوط تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنی قدر و قیمت میں ہزاروں پر بھاری ہیں ۔ ان مکتوبات کی مدد سے ہمیں مولانا آزاد کی زندگی کے کئی گوشوں تک رسائی ہوتی ہے ۔ مولانا آزاد کے مکاتیب کو سامنے رکھ کر سوانح آزاد کا مرقع تیار کر سکتے ہیں ، مثلاً خاندانی کیفیت کیا تھی ، وسائل معاش کیا کیا تھے ، رات دن کی مشغولیت کا کیا حال تھا ۔ کن کن علاقوں اور شہروں میں گھومے پھرے ۔ کن کن مکانوں میں رہے ۔ اخلاق اور مزاج کیسا تھا ۔ سفر کہاں کہاں کا کیا ، دوست اور احباب کون تھے ۔ شاگردوں کے ساتھ برتاؤ کیسا تھا ۔ بحیثیت طالب علم اور بحیثیت اُستاد کیا مقام اور مرتبہ تھا ۔ کن کن اداروں سے وابستہ رہے کون سی بیماریوں میں مبتلا رہے کن کن جگہوں اور اداروں میں ملازمت کی ۔ کیسا لباس پہنتے تھے ، کس اخبار اور پریس میں کام کیا ۔ غموں اور خوشیوں کا اظہار ، کتابوں سے محبت اور اُن کا جمع کرنا ، سکوں کو جمع کرنے کا شوق ، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں کی جھلک مکتوباتِ آزاد میں ملتی ہے ۔ مثلاً ان کی محکمہ تعلیم میں ملازمت کے متعلق ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد محکمہ تعلیم میں ملازمت کے کس قدر خواہاں تھے ۔ ملازمت کے سلسلے میں ایک مکتوب میں میجر فُلر ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کو لکھتے ہیں:

> حضور کو یاد ہوگا کہ ماہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں حضور دورے سے مراجعت فرما کر تشریف لائے اور ڈاک بنگلہ لودھیانے میں رونق افروز ہوئے تو فدوی بھی شرف اندوز ملازمت ہوا تھا ۔ اس وقت فدوی پرنٹر و پبلشر مطبع مجمع البحرین میں تھا کہ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر نے بنا کیا ۔ فی الحال بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں اور محکمۂ محتشمہ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر بہادر میں سر رشتہ دار ہے ۔[۶۹]

ایک خط میں اپنی ملازمت کے متعلق لکھتے ہیں:

> بندہ آثم بہ گورنمنٹ کالج لاہور پروفیسر عربی و فارسی است مگر غیر از حب قوم و ہوا خواہی سرافراز ان قوم کہ ہم مؤید آئین فرمانفرمای قوم باشد شغلی و تمنائی دیگر ندارد ۔[۷۰]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے گورنمنٹ کالج کے بعد یونیورسٹی میں ملازمت کی تھی۔

اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی یونیورسٹی کے حوالے ہو جائیگا، یونیورسٹی کی یہ رائے ہے کہ علوم وفنون ریاضی وغیرہ سب کی تعلیم ترجموں کے ذریعے ہو جایا کرے گی، فقط انگریزی کے لئے ایک ماسٹر اڑھائی سو روپے کا کافی ہے ۔۔۔ کالج کے مولوی و پنڈت دونوں تخفیف ۔تب مولوی کا کیا حال؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی، اکسٹرا اسسٹنٹی؟ مشکل ہے، منصفی؟ تحصیل داری؟ شائد پنشن دے دے گی۔ اِس میں ابھی دو برس کی کمی ہے مگر ہوسکتی ہے خیر اگر ہو بھی تو پچاس روپے سے زیادہ نہیں آسان اور عام قاعدہ یہ ہے، مسلسل نوکری ۱۳ برس کی ہے اِتنے مہینے کی تنخواہ لو اور سلام ۔[۷۱]

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ علم کی چڑیل (پنجاب یونیورسٹی) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجا کھا چکی ہے۔۔۔ کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے''۔[۷۲]

مگر اس سال یونیورسٹی مجھ پر مہربان ہوئی، زبان اُردو میں طلباء داخلہ کا ممتحن مقرر کیا اور زبان دانی میں اُردو اور فارسی کا اور ایک حصہ عربی کا۔ ان کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے، مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ ہیں اور آج سے دس دن کی مہلت باقی ہے ۔خدا اس بلا سے جلد مخلصی دے۔[۷۳]

ایک اور خط میں نوکری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

نوکری کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔ یونیورسٹی لیت ولعل کر رہی ہے اور کہتی ہے کہ

ہم تجویز کر رہے ہیں۔ بہت خوب اور بھی اچھا! میری عقل ناقص میں اگست کی
چھٹیاں بھی اسی میں گزر جائیں گی۔[۷۴]

ایک خط میں اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

''میرا حال یہ ہے کہ ڈائریکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم کے بہ موجب لکھ
بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے۔ گویا اس تاریخ سے
میں ان کے ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت! یا نصیب''۔[۷۵]

مولانا محمد حسین آزاد اپنی رہائش کے متعلق کارندہ راجا صاحب۔ جن کا نام دھیان سنگھ راجا تھا اور وہ سید مبارک والا مکان کے مالک تھے، جس میں مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۷۹ء سے ماہوار ۹ روپے کرایہ پر رہتے تھے۔ ایک خط جو ۱۸۸۲ء کا لکھا ہوا ہے، میں فرماتے ہیں:

آپ کو معلوم ہو کہ میں ایک مدت معہود تک مکان سید مبارک والا میں رہا، لیکن
افسوس ہے اس کی حقیقت حال نہیں معلوم ہوئی، وہ میں لکھتا ہوں، یکم جنوری
۱۸۷۹ء سے آ کر رہا نو روپے ماہوار کرایہ ٹھہرا۔۔۔ ۲۷ مارچ ۱۸۸۲ء کو سخت
تقاضوں سے اور نہایت تکلیف کے ساتھ وہاں سے اُٹھایا گیا۔۔۔[۷۶]

اپنے بیٹے کی شادی کرنی تھی۔ اپنے خاندان کے بارے میں نواب حسین مرزا صاحب کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''بعد از ادائے تسلیم آں کہ اس ننگ خاندان قدیم و جدید کا حال جاننے والا آپ
سے زیادہ کوئی نہیں حقیقی نسب اور تحقیقی حسب میرا تو یہ ہے کہ روزِ ازل سے
اباعن جدِ اسد اللہ الغالب مظہر العجائب علی ولی اللہ کا غلام ہوں''۔[۷۷]

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۶۵ء میں وسطِ ایشیاء کے سفر پر گئے جس کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

جب ہم کابل سے بلخ کو روانہ ہوئے تو 'کتل دندان شکن' سے اُترتے ہوئے ہمارے قافلہ سالار کا گھوڑا گرا اور اترائی بھی میل بھر سے کم نہ تھی۔ ایسے مقاموں پر گر کر گھوڑے یا اونٹ کا سنبھلنا ممکن ہی نہیں) گھوڑا چور چور ہو گیا۔ سامنے ہی ایک گاؤں تھا لوگ وہاں کے سنتے ہی دوڑے اور تکہ بوٹی کر کے لے گئے۔ اور اپنی ہانڈیاں جا گرم کیں۔ [۷۸]

اپنے ہندوستان کے سفر کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

اس عرصے میں سرگرداں پھرتا رہا، دلی گیا، الور گیا، جیپور گیا۔ ابرو کو بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ دلی پہنچتے ہی اسے چیچک نکل آئی۔ وہ اپنے نانا کے ہاں رہا اور مجھ پہ اس فکر میں عجب عالم گزرتا رہا۔ انجام بخیر ہوا، اور میں اس سمیت چودہ کو داخل لاہور ہوا۔ [۷۹]

مولانا آزاد کو ایک جگہ بیٹھنا پسند نہیں تھا۔فرصت کے وقت گھر میں بیٹھنے کو ناشکری گردانتے تھے۔چنانچہ تعطیلات گرما میں کہیں نہ کہیں تفریح وطبع کے لئے نکل پڑتے تھے جولائی ۱۸۷۰ء میں اپنے ایک ایسے ہی سفر کے متعلق علاقہ نکودر میں سے گزرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چنانچہ گزر میرا علاقہ نکودر جالندھر میں ہوا''۔ [۸۰]

مولانا آزاد نے اخبار انجمن کے لئے یہ خط لکھا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے یا جو کچھ اُنھیں معلوم ہوا ہے اس کو اخبار میں درج کیا جائے چنانچہ لکھتے ہیں:

واضح ہو کہ یہ قصبہ قدیمی آبادی ہے۔ اکبر نامہ میں بھی ذکر اس کا موجود ہے۔مگر یہ نہیں کھلتا کہ کس نے آباد کیا اور کب آباد کیا۔یہاں یہ مشہور ہے کہ نکودر کوئی راجپوت تھا؛ اس کے نام سے یہ آبادی قائم ہوئی۔چناں چہ اس کی اولاد اب تک اس قصبے میں ہے اور غلام غوث ان میں سے معزز اور صاحب جائداد لمبر دار ہے۔یہاں کے مقبرے دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک مقبرہ محمد مومن کا ہے اور دوسرا

حاجی محمد جمال کا۔یہ دونوں شخص امرائے عہد جہانگیری سے ہیں۔محمد جمال وہی شخص ہے جس کے اہتمام سے قلعۂ لاہور کی بعض عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہاں یہ مشہور ہے کہ یہ جہانگیر کے رضاعی بھائی تھے؛ ان کی ماں کا دودھ جہانگیر نے پیا تھا۔

تاریخ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے، ایک دفعہ اکبر یہاں سے گزرا تو مقام خوش فضا دیکھ کر ابوالفضل کو بیس ہزار روپے کا سونا دیا اور حکم دیا کہ یہاں ایک پل اور عمارت بنائے کہ اُس میں آبشار یعنی پانی کی چادر بھی جاری ہو۔

پھر جب کہ آخر سن ۲ جلوس میں جہاں گیر کا یہاں سے گزر ہوا تو اس کو بھی یہ جگہ بہت پسند آئی۔ چناں چہ عمارت اکبری کا ذکر بیان کر کے اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ فی الحقیقت دل چسپ اور باطراوت مقام ہے۔ جاگیردار کو حکم دیا کہ اس پل کے ایک طرف عمارت اور باغ لگا دے تا کہ جو مسافر یہاں آ کر ٹھہریں اور لطف اٹھاویں۔

اب محمد مومن کے مقبرے میں مدرسۂ سرکاری ہے۔ یہ عمارت ۱۰۲۱ ھ میں بنی تھی۔مگر ایسا دلکش مکان ہے کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔[۸۱]

مولانا آزاد کے اس خط سے ایک تو ان کے سفر کے بارے میں پتہ چلتا ہے اور دوسرا ہمیں اس سے یہ آگاہی ہوتی ہے کہ مولانا آزاد سفر میں نہ صرف خود لطف اندوز ہوتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی محظوظ اور معلومات سے مالا مال کرتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے تعلقات ڈاکٹر لائٹنر سے دوستانہ تھے۔لیکن بعد میں یہ تعلقات بگڑ گئے اُس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا آزاد ''اخبار ہمائے پنجاب'' میں کام کرتے تھے۔ سیالکوٹ کے ایک نامہ نگار سید بہادر شاہ کی طرف سے ''اخبار ہمائے پنجاب'' میں ایک خط بابت (حال چوری ملازمین محکمہ ڈاک شائع ہوا۔ اس نامہ نگار نے لکھا تھا کہ سیالکوٹ کے ڈاک خانے میں کرنٹے ملازمین نے

ایک طوفان اُٹھا رکھا ہے۔ وہ خطوط ضائع کر دیتے ہیں، ٹکٹ اتار لیتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔اس خط کی اشاعت پر بڑا ہنگامہ ہوا ۔ پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب نے صدر انجمن سے باضابطہ طور پر شکایت کی اور آزاد کے خلاف کاروائی شروع ہوگئی۔ آزاد اس سلسلے میں ڈاکٹر لائٹنر کو فروری ۱۸۷۱ء میں لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

مضمون مندرجہ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۷۱ء بابت ڈاک خانہ جات کے باب میں حقیقت حال یہ ہے کہ وہ تحریر موجب خط سید بہادر شاہ منشی تحویل خانہ سیالکوٹ کے درج ہوئی تھی۔اس قسم کے خطوط اور مسودے کچھ میرے پاس بھی رہا کرتے تھے اور باقی سر رشتہ انجمن میں ہوتے تھے۔ میں نے اپنے مسودوں میں خوب دیکھ لیا، خط مذکور نہیں ہے انجمن کے کاغذوں کو آج میں نے دیکھا، معلوم ہوا کہ سات مہینے کا عرصہ ہوا اس لئے کاغذات ردی گئے اور جو باقی ہیں اُن میں نہیں۔اب صورت اس دریافت کی کچھ مشکل نہیں کاتب کا خط مسل کورٹ میں موجود ہے اور اسی کا خط اخبار عام میں بھی آیا تھا، معلوم نہیں وہاں اصل خط موجود ہے یا نہیں؟ یہ حال انجمن بذریعہ تحریر کے کاتب مذکور سے دریافت کرسکتی ہے۔[۸۲]

مولانا آزاد نے ڈاکٹر لائٹنر کی تالیف سنین الاسلام کی جلد اوّل میں معاونت کی تھی ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کو انجمن کے منشی کرم الٰہی صاحب نے مولانا کو ایک خط لکھا جس میں لکھا تھا:

آقائے ولی نعمت صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ یہ کاپیاں جس وقت چپراسی لے کر حاضر خدمت ہوتا ہے ان کو فوراً بواپسی حامل ہذا صحیح کر کے واپس دیویں تاکہ کاروائی میں ہرج نہ ہو اس واسطے مامور ہوکر تکلیف دیتا ہوں کہ آپ بموجب ارشاد ولی نعمت صاحب کے کاربند ہوں۔فقط مرقوم ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء بندہ کرم الٰہی۔[۸۳]

اس خط کے جواب میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

دو ورق اصل کے حضور کو دیے تھے اور آپ نے جیب میں رکھ لیے تھے۔ کاتب کس طرح کہتا ہے، کہ مسودہ نہیں۔ اِن دو ورقوں کو ضرور تلاش کر لیا جائے اس کے آگے سے جو کچھ اور مسودہ میرے پاس تھا وہ ارسال کرتا ہوں۔ مگر اُسے حضور نے ابھی سُنا نہیں ہے۔ [۸۴]

پھر ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

آج میرے پیٹ میں درد ہے اس لیے حاضر نہیں ہو سکتا، مگر تمام رات یہی فکر رہا کہ وہ دو ورق اصل کے جو آپ نے جیب میں رکھ لئے تھے وہ کاتب کو بھیجے یا نہیں ؟ یہ کاپیاں مطبع میں بارہ بجے آ گئی تھیں، اسی وقت میرے پاس آجاتیں تو مقابلہ بھی اطمینان سے ہو جاتیں اور ان دو ورقوں کا بھی حال معلوم ہو جاتا مگر نا وقت آئیں، مقابلہ بھی اضطراب میں ہوا اور دل کو فکر نے پریشان بھی کیا۔ جو اصل کے ورق میں نے کل بھیجے ہیں اگر چہ وہ آپ کو سنائے نہیں مگر میں نے اچھی طرح دیکھ لیے ہیں پرسوں کالج میں کاپی یا پروف سنا دوں گا۔ [۸۵]

اِن مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے ڈاکٹر لائٹر کے ساتھ تعلقات ابھی خوشگوار تھے اور سنینِ الاسلام میں آزاد نے اِن کی مدد کی لیکن بعد میں ڈاکٹر لائٹر کے تعلقات 'ہمائے پنجاب' اور سنین الاسلام کی وجہ سے مولانا آزاد کے ساتھ بگڑ گئے تھے۔ مولانا آزاد نے ہمائے پنجاب سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ لائٹر نے سنین اسلام کا مسودہ واپس لے لیا اور انتہائی مخالفانہ طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ مولانا اِس بات سے ناراض ہو گئے اور اپنے سابقہ تعلقات کی روشنی میں ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر لائٹر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے جس کام کو چھوڑا ہے، دشمنوں کے ہاتھ سے مجبور و ناچار ہو کر چھوڑا ہے کہ وہ عداوت کے سبب سے آپ کے کاموں کو بھی خراب

> کرتے ہیں ؛ اس معاملے میں بھی یہی حال ہے اگر آپ ان شیطنوں کو روک سکیں تو میں بھی خدمت کے لئے حاضر ہوں ؛ اور اگر آپ بھی مجبور ہیں تو مجھے معاف رکھیئے۔[۸۶]

'سنین الاسلام ، کا معاملہ اور اخبار ہمائے پنجاب کے مضمون کا قصہ اُلجھ چکا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر مولانا آزاد سے اِس قدر نالاں تھے کہ انھیں طلبہ کو مقررہ اوقات کے علاوہ پڑھانے کی اجازت بھی نہ دیتے تھے چنانچہ مولانا آزاد ۱۴ مئی ۱۸۷۱ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> حضور نے جو سوائے گھنٹہ مقرری کے خارج کے وقت میں طلباء کو تعلیم عربی کے لئے منع فرمایا تھا ، تعمیل اس کی ہوتی ہے۔ لیکن اِن کی استعداد کا حال حضور پر روشن ہے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ بعض طلبا مختلف ضرورتوں سے غیر حاضر بھی رہے ہیں اس لئے امید ہے کہ حضور حکم سابق میں ترمیم فرماویں اور مجھے اجازت دیں کہ جو لوگ خارج وقت میں کچھ پوچھیں، انھیں مدد تعلیم دوں ، فقط واجب تھا عرض کیا۔[۸۷]

۱۸ فروری ۱۸۷۱ء کو منشی محمد لطیف کو ''ہمائے پنجاب'' کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔اور لائٹنر نے آزاد کو لکھا کہ اخبار کا چارج منشی محمد لطیف کو دے دیا جائے۔ اِس کے بعد کافی عرصے تک اِس معاملے پر کاروائی نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸ جولائی ۱۸۷۱ء کو آزاد کو جواب طلبی کا حکم صادر ہوا۔ اِسی عرصہ میں کالج میں موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو چکی تھیں آزاد نے گرمیوں کی تعطیلات میں لاہور سے باہر جانے کی اجازت مانگی ، اور ایک درخواست پیش کی لیکن ڈاکٹر لائٹنر نے اِس درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے اِس پر ایک سخت نوٹ لکھا۔ مولانا آزاد اس جواب سے سخت دل برداشتہ ہوگئے۔ اِس سلسلے میں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> آج تیسرا دِن ہے اب تک انجمن سے جواب حاصل نہیں ہوا کہ سیکرٹری انجمن لاہور میں نہیں ۔ میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے۔آپ اگر روکیں تو کسی لیفٹیننٹ

گورنر کو روکیں ، کسی گورنر کو روکیں ؛ محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لیے کچھ فخر نہیں۔[۸۸]

محمد حسین آزاد سے اِسی عرصہ میں انجمن کے تمام کاغذات اور کتابیں بھی جو ان کے پاس تھیں واپس لے لی گئیں۔ آزاد کو اِس تمام کاروائی پر صدمہ اور افسوس ہوا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

جناب عالی !

آج میں نے بہمراہی لالہ دینا ناتھ صاحب پھر جا کر دیکھا مسودات اخبار کے جو انجمن میں باقی ہیں ، فقط دو کاغذ ہیں باقی سب ردی بن گئے ہیں۔ یہ کاغذات لالہ گوپی ناتھ کے سپرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ خط دفتر میں وہ رکھے جاتے ہیں جو کہ متعلق خرید یا قیمت اخبار کے ہوتے ہیں ، باقی کاغذات کی نگہداشت ذمے دفتر کے واجب نہیں سمجھی جاتی ہے۔ ماضی سے اب تک یہی دستور ہے۔ اب میری عرض یہ ہے کہ اگر سیالکوٹ کو خط لکھا گیا ہے تو مناسب ہے اور یقین ہے کہ وہاں سے جواب با صواب آئے گا۔ امیدوار ہوں کہ فدوی کے لاہور میں رہنے سے کچھ اِس کام میں فائدہ نہ حاصل ہوگا۔[۸۹]

''ہمائے پنجاب'' کی آزاد کے خلاف محکمانہ کاروائی ستمبر ۱۸۷۱ء میں ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر لائٹنر آزاد کے جواب سے کسی حد تک مطمئن ہو گئے لیکن سنین ا لاسلام کی وجہ سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئے اور ڈاکٹر لائٹنر کے دِل میں یہ گرہ ہمیشہ کے لئے بندھ گئی۔ سنین الاسلام حصہ اوّل کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر لائٹنر نے سنین الاسلام حصہ دوم کی تیاری شروع کر دی ، لیکن مولانا آزاد نے اِس کی تیاری میں سابقہ جانکاہی سے کام نہ لیا۔ ڈاکٹر لائٹنر کو بار بار یاد دہانی کرانی پڑتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لائٹنر آزاد سے ناراض ہو گئے اور آزاد سے سنین الاسلام کے سلسلے میں جمع کیا ہوا سارا مواد واپس لینے پر مصر ہو گئے۔ آزاد کو تیسری یاد دہانی کرائی گئی۔ آزاد اس یاد دہانی پہ

خاصے پریشان ہو گئے۔ حالات میں خاصی تلخی آ گئی۔آزاد کے مخالفین نے بھی موقعے سے فائدہ اُٹھایا اور سنین الاسلام میں خامیاں نکالنی شروع کر دیں۔ بعض مخالفین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سنین الاسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مولانا آزاد تلملا اُٹھے اور اس اعتراض کا جواب انگریزی میں لکھا اور ساتھ ہی اپنی دلی کیفیت کا اظہار ڈاکٹر لائٹنر کے نام لکھے گئے خط میں اِس طرح کیا:

بندہ پرور جو احکام حضور نے اب تک میرے حق میں جاری فرمائے ان کا صدق دل سے شکر گزار ہوں۔ قسمیہ کہتا ہوں کہ بندہ اب بھی وہی خدمت گزار ہے۔ اور دل سے عہد پر قائم ہے۔ آپ کو یاد ہو گا آخر کے دنوں میں میں نے عرض کی تھی کہ جو سختیاں اپنے جانی دُشمنوں پر آپ نے نہ کی ہوں گی وہ آپ کے ہاتھ سے میرے دُشمن مجھ پر کروا دیں گے اور آپ نہ سمجھیں گے۔ وہ اب خوشیاں کرتے ہیں اور ہنستے ہیں کہ دشمن کو دشمن کے ہاتھ سے ہی اس طرح مارتے ہیں۔ ہزاروں کتے کہ شیر کی کھالیں پہنے تھے، آپ نے اُنھیں مارا، مگر اب تک یہ آپ کو نہ معلوم ہوا کہ شیر فقط ایک ہی بات میں شکار ہو جاتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ حضور نے مجھے چھٹی میں روک لیا، مگر کس کو روکا؟ وہی آزاد بندہ احسان قیدی بے زنجیر۔ بجائے اِس طول کلام کے فقط اِتنا کہہ دیتے کہ جاؤ کالج کے کام کے سوا تمھیں اب کون روکتا ہے واللہ کہ آزاد ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکتا اور وہیں گر پڑتا، خیر جو کچھ کیا اچھا کیا، مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں کیوں کہ جو سنتا ہے افسوس کرتا ہے اگر دُشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں کیوں کہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں، میں اس خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا، وہ افسوس کرے گا۔ یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا اگر قتل بھی ہو جاؤں گا تو جو کچھ اب تک لکھ چکا ہوں، یہ خلق و عالم کے رُلانے کے لئے کافی ہے۔ اب شکوے کی جگہ رہی نہ شکایت کا موقع ؛ اب وہ وقت آ گیا کہ بہ موجب اپنے وعدے کے جاؤں گا اور سینہ چیر کے دکھاؤں گا

کہ کتنے زخم لگے ہیں مجھے یہ زخم بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں۔ میں اس تحریر سے آپ کا وقت ضائع نہ کرتا ، مگر کئی دِن سے سُنتا ہوں کہ 'سنین الاسلام' میں کسی نے بہُت غلطیاں نکالی ہیں اور دوسرے نے تصدیق کیں۔ میں نے بہ موجب اپنے عہد کے اس کی بھی تفصیل نہ چاہی ، مگر آج ایک نئی بات سُنی کہ 'سنین الاسلام' کی ترکیب ہی غلط ہے مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی چنانچہ اِس ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر سی عرض داشت انگریزی میں لکھتا ہوں۔[۹۰]

۲اپریل ۱۸۷۶ء میں لالہ دنی چند کو خط میں لکھتے ہیں:

میرا حال یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں اِن سے کالج ہی میں ملا؛ استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا ، دوسرے دن گھر پر ہی جا کر مل آیا۔ اس دِن سے پھر گھر پر نہیں گیا ؛ اور طریقہ یہی ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا۔ابھی تک تو وہ بھی سیدھے سیدھے چلے جاتے ہیں۔[۹۱]

مولانا آزاد ڈاکٹر لائٹنر سے اپنے تعلقات بگڑنے کا ذکر اپنے شاگرد لالہ دنی چند سے بھی کرتے ہیں۔یکم جولائی ۱۸۷۷ء کے اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

مجھ سے ڈاکٹر صاحب سے اب کی دفعہ بڑی سخت طور پر جنگ ہوئی ؛نہیں جانتا کہ اب پہاڑ سے اُتر کر کیا رنگ ہو یا تو بھارت کا یدھ ہوا یا گول مول ہو گئی۔[۹۲]

مولانا آزاد کے یہاں کل سولہ بچے ہوئے تھے لیکن آغا محمد ابراہیم زندہ سلامت رہے۔ باقی سب مر گئے اِس لیے مولانا اِن سے بہُت پیار کرتے تھے۔۱۳ دسمبر ۱۸۸۶ء میں نواب حسین مرزا صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''میری طرف سے اِتنا عرض کیجیے گا کہ ۱۰ میں سے ایک ہے اور خانہ زاد موروثی ہے''۔[۹۳]

مولانا محمد حسین آزاد کی والدہ وفات پاگئیں تو پھوپھی نے آپ کو پالا۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے وقت وہ بھی مولانا کے ساتھ تھیں۔ جب وہ دہلی کی بربادی پر اپنے گھر سے نکلیں تو مولانا آزاد کی سالگرہ کا ڈورا اپنے ساتھ لے کر نکلی تھیں جب تک زندہ رہیں ہر سالگرہ کے موقع پر سات پھلوں، سات مٹھائیوں پر نذر دلواتی اور شام کے وقت چراغ جلا کر دریا میں بہاتی تھیں۔ ان کے انتقال پر اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے نام ۲۷ فروری ۱۸۷۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ہمیں اِن دنوں صدمہ عظیم ہوا وہ یہ کہ میری پھوپھی صاحبہ جنھوں نے مجھے پالا تھا اور جو ہمیشہ گھر کی مالک تھیں، اُن کا انتقال ہوگیا۔ وہ نہایت نیک نہاد اور خوش اوقات تھیں۔ ان کے سبب سے دل بڑا قوی رہتا تھا۔ اچھا جو اللہ کی مرضی، وہی مالک ہے گھر میں اندھیر نظر آتا ہے اور وحشت ہوتی ہے۔[۹۴]

مولانا آزاد کو اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت تھی لیکن آغا محمد ابراہیم کے سوا اِن کی اولاد میں سے کوئی بھی زندہ سلامت نہ رہے۔ مولانا آزاد اپنے بچوں کی وفات پر بہُت دکھی ہو جاتے تھے۔ مولانا آزاد ۹ نومبر ۱۸۷۵ء کو اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو خط میں لکھتے ہیں:

> میرے پیارے دو خط تمھارے برابر پہنچے۔ خدا تمھیں خوش رکھے اور آیندہ تمھاری دعاؤں میں اثر دے! مگر ملا باقر عید کے دوسرے دن صبح کو سات بجے مر گئے خیر خداوند عالم آیندہ کو خیر کرے۔[۹۵]

۱۸۷۶ء میں ایک اور خط میں لالہ دنی چند کو اپنے بیٹے خلیفہ کی موت کے متعلق لکھتے ہیں:

> صاحب! کیا کہوں، پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجا کر لو تو جب میرے خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو۔ خلیفہ جی جب پونے تین مہینے کے ہوئے تو اِنھیں بھی ملا صاحب کے پہلو میں جا کر سلا آیا۔[۹۶]

مولانا محمد حسین آزاد کے مکاتیب میں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں ، جن سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد کو اپنے بچوں کے مرنے کا کس قدر افسوس تھا ، اوراپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم کے لیے فکر مند رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اُن کا گھر آباد ہو جائے۔ مولانا اپنی بیگم کا بھی خیال رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کے مکاتیب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُنھیں اپنے بیٹے ، بیوی اور گھر کا کس قدر خیال تھا۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۸۶ءکو نواب حسین مرزا کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

> اب عرض مکرر ہے کہ اِس مبارک کام کے سر انجام میں دیر نہ ہو۔ یہاں گھر سنسان ، کاروبار ابتر ، چیزیں برباد ہیں ، کوئی سنبھالنے والانہیں ۔ ایک برخوردار ابراہیم کی والدہ ، اس دل شکستہ کے حواس بجانہیں رہے خدا جلد وہ دِن دکھائے کہ عزیزہ نورچشم ذکیہ بیگم آئیں ، اپنے گھر کوسنبھالیں ، وہ جانیں اور ان کا گھر۔[۹۷]

حاجی بنے صاحب کے نام ۱۴ دسمبر ۱۸۸۶ ء میں لکھے گئے خط میں بھی اِسی قسم کا اِظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> جناب شیخ صاحب کیا کہوں ، میرے گھر کا حال قابل عبرت ہے۔ برخوردار کی والدہ تنہا ہے اور بہ سبب حوادث زمانہ کے میرے اور اس کے حواس درست نہیں رہے۔ تمام کاروبار ابتر ہیں اللہ نے سب کچھ دیا ہے اور سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ خدا جلد وہ دِن لائے کہ عزیزہ نورچشمی آ کر اپنے گھر کوسنبھال لیں اور ہم ان کے بار خدمت سے سبکدوش ہو کر گوشۂ عزلت میں بیٹھے دیکھا کریں ، البتہ دو وقت کے کھانے اور کچھ کپڑے کی تکلیف دیں گے ، زیادہ کچھ نہ مانگیں گے۔[۹۸]

مولانا محمد حسین آزاد علمی کاموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیفات میں مصروف رہے اپنے متعدد مکتوبات میں مولانا آزاد نے جا بجا اپنی مصروفیت کا ذکر کیا ہے اور عدیم الفرصتی کا رونا رویا ہے۔ مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے آج فرصت مرنے کی بھی میسر نہیں آتی ،تمھاری کس کس بات کا جواب دوں''۔[۹۹]

''زندہ ہوں کہ اتنی مدت کے بعد تمھارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ کیا کروں مشاعرے کے سبب سے میں بہت عدیم الفرصت اور پریشان دماغ ہو گیا ہوں''۔[۱۰۰]

اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کو ۲۶ ستمبر ۱۸۸۲ء میں ایک خط میں اپنی مصروفیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''رات کو دس بجے میں گھر پہنچا ۔اِس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے، دل دربار میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں''۔[۱۰۱]

اپنی تصنیفات کے متعلق اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

''آب حیات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے۔ فقط قدر افزائی ہے''۔[۱۰۲]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

کیا کہوں ! دس دِن کی چھٹی ہوئی تھی ، باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا ، چاہا کہ حاضر خدمت ہوں ، پھر کہا کہ چار سطریں ہی صاف ہوں گی ، اکٹھی ہی باتیں کرلیں گے۔۔۔ خدا اس دربار سے فارغ کر دے تو آپ سے سُرخ رو ہوں۔۔۔ دربارِ اکبری کاتب سے لکھواتا ہوں ، آپ بھی لکھ رہا ہوں خدا کرے کچھ ہو جائے۔[۱۰۳]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

اب آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ دربار مذکور کو اگر چہ طبع نیرنگ خیال ، اور آب حیات ، کے سبب سے آج کل ملتوی کر دیا ہے۔مگر تمام مسودے پہلو میں

دھرے ہیں ۔ یہ چھپائی چھ مہینے کا کام تھا جسے میں نے ڈیڑھ ماہ میں کیا انشاء اللہ
۲۵ دِن ، حد ایک ماہ کا کام اور ہے اس سے فارغ ہوں تو پھر اسے سنبھالتا
ہوں ۔[۱۰۴]

اس خط میں اپنی مصروفیت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ لاہور و امرتسر کے دولت پرست جمع
ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں
ہے ؟ اِس سے بھی تو پوچھو ، وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفیٰ
دے دیا ہے وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل
وہ دربارِ اکبری لکھ رہا ہے ۔[۱۰۵]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

عجب ہجوم محنت میں مبتلا ہوں۔ الحمدللہ کہ دس گیارہ دن کا کام رہ گیا ہے اور یہ
سخت تر وقت ہے سوا مہینے سے میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں۔ میری حالت
ایسی ہوگئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے تم کچھ بیمار تھے۔[۱۰۶]

اِسی خط میں لکھتے ہیں:

'' آبِ حیات نے مجھے ہلاک کر دیا مجھ سے بے وقوفی ہوئی ہے دس مہینے کا کام
تھا جو ڈیڑھ ماہ میں کیا ہے'' ۔[۱۰۷]

ایک خط میں لکھتے ہیں:

میرا حال یہ ہے کہ تقریباً ۸ دن ہوئے ہوں گے آبِ حیات اور نیرنگِ خیال
سے چھٹکارا ہوا۔ مگر اس سال یونیورسٹی مجھ پر مہربان ہوئی زبان اُردو میں طلباء

داخلہ کا ممتحن مقرر کیا اور زبان دانی میں اردو اور فارسی کا اور ایک حصہ عربی کا۔ اِن کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے مگر کاغذات جونمبر لگانے کو آئے ہیں، وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ ہیں اور آج سے دس دن کی مہلت باقی ہے خدا اِس بلا سے جلد مخلصی دے۔۔۔اب بات فقط اتنی ہے کہ ایک منشی بھی میں نے رکھ لیا ہے وہ میرے ساتھ کام کر رہا ہے انشاء اللہ دس دِن میں اِس کام کوختم کروں گا۔ پھر دربارِ اکبری ہے اور میں ہوں ۔[۱۰۸]

اسی خط میں لکھتے ہیں:

''رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں''۔[۱۰۹]

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دربارِ اکبری کو لپٹ رہا ہوں ؛مگر دو ہی دِن جم کر بیٹھا تھا۔ کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا''۔[۱۱۰]

۱۶فروری ۱۸۸۴ء میں بنگلہ ایوب شاہ لاہور سے میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

دل بہت چاہا کہ حاضر خدمت ہوں مگر کالج میں سہ ماہی کا امتحان ہو رہا ہے اٹھارہ پیر کے دن عربی و فارسی کا امتحان ہے۔ مجھے سات جماعتوں کے لیے سوالات بنانے ہیں ؛ کچھ بنا لیے ہیں ، کچھ کل بناؤں گا۔ تین چار دن کے بعد چھٹیاں آنے والی ہیں ، ان شاء اللہ ان میں ایک دِن حاضر ہوں گا۔[۱۱۱]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

اتوار، پیر ،منگل چھٹی ہے ، خیال آیا کہ تین دِن جم کر بیٹھوں گا تو مآثر الامرا، کا کام ختم ہو جائے گا ؛ جاؤں گا تو ایک دن صرف ہو گا اور حاصل فقط باتیں ، اس

لیے کتاب بھیج دینی چاہیئے۔ ۔۔وقت تنگ ہے، ان شاء اللہ اب پھر۔ [۱۱۲]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

زبان فارسی کی تاریخ میں پروفیسر آزاد ایک شخص ہیں انھوں نے تین چار لیکچر خوب دیے ہیں اور زبان مذکور کے اصول اور بہت حالات اور بھی لکھے ہیں ؛ تین چار سو صفحے کی کتاب ہوگی مگر افسوس ہے کہ وہ ابھی مسودے ہیں نظر ثانی کر رہے ہیں عجب نہیں کہ ہو جائے تو جلد چھپوا دیں۔ ہاں قواعد فارسی میں ایک کتاب ڈائریکٹر صاحب کی فرمائش سے میں نے لکھی تھی ، اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے اور کتب خانہ آزاد سے فاضل ہے۔وہ انشاء اللہ روانہ کرتا ہوں۔ [۱۱۳]

ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میرا حال یہ ہے کہ آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا ہوں اور ضعف نے نکما کر دیا'' ۔ [۱۱۴]

ایک خط میں لکھتے ہیں :

''مدت گزر گئی کہ خدمت سے مقصر ہوں مگر عالم مجبوری ہے کہ آب حیات میں غوطے کھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ ایک مہینے کا کام اور ہے''۔ [۱۱۵]

''دل بہت چاہتا ہے کہ وہیں آ کر ملوں ،مگر فرصت کہاں اور موقع کجا!'' [۱۱۶]

اِسی خط میں لکھتے ہیں:

فرصت کا حال یہ ہے کہ ۲۱ جولائی کو یہاں امتحان ملازمت تھا، پانچ سو بہتر آدمی اُس میں بیٹھے تھے ، مجھے باوجود اِنکار کے فارسی کا ممتحن کیا۔ تین پرچے جس کے

سولہ سترہ کاغذ دیکھنے پڑے ہیں ۔ ایک پلنگ بھرا ہوا ہے دیکھتا ہوں اورلہو خشک ہوتا ہے کہ الٰہی یہ بوجھ کیوں کر اُٹھے گا ! ۱۵ اگست کو رزلٹ دینا ہے ؛ فرمایئے کہ اس چھٹی کا مزہ کیا ہوا ؟ خدا گواہ ہے کہ بار بار انکار کیا ۔ نہ قبول ہوا ''طفل بہ مکتب نمی رود ولے بر ندش'' اِنصاف کیجیے کہ اب تصنیف کے لیے طبیعت میں ذوق شوق پیدا ہو تو کہاں سے ہو؟ برابر خطوط چلے آتے ہیں۔کہ فرمایئے دربار اکبری کا کیا حال ہے؟ قند پارسی (گفتگو ے فارسی) کا کیا حال ہے ؟ لیکچروں کا کیا حال ہے ؟ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے ۔ [۱۱۷]

ایک خط میں لکھتے ہیں :

تسلیم ۔ احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے میرا یہ حمق حد سے بہُت گزر گیا ہے کہ تعریف سُن کر غُصہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔کیا کہوں ،فرصت تو ہےنہیں اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں ۔ [۱۱۸]

اسی خط میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

میں نے سخن دان فارس کونظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے چاہا کہ اب دربارِ اکبری کو سنبھالوں ،مگر مروت اورحمیت نے اجازت نہ دی۔ کیونکہ اُستاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہُت سی غزلیں ،قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں، اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دُنیا میں کوئی نہیں ؛ اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے بے موت مرجائے گا ، اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کیا ہو گا ان کے حال پر افسوس نہیں ، یہ میری غیرت اورحمیت پر افسوس ہے چنانچہ اس لیے اب اسے سنبھالا ہے ، اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر

کے موقع پر کوئی تقریب ، کوئی معاملہ یا معرکہ خاص پیش آیا تھا وہ بھی نقل کروں ، کیوں کہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے۔ آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے ؛ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہو گا خدا انجام کو پہنچا دے۔[۱۱۹]

اس خط سے مولانا آزاد کے اپنے استاد ابراہیم ذوق کے ساتھ محبت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور اِس سے یہ بھی آ گاہی حاصل ہوتی ہے کہ اُستاد ذوق کے مولانا آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے ساتھ بچپن سے تعلقات تھے۔ ذوق مولوی محمد باقر کے ہم سبق اور دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

نوح رضوی مچھلی شہری کے نام فروری ۱۸۸۲ء میں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

حقیقتہً اب میں اپنا حال کیا عرض کروں ، ڈیڑھ مہینے کے بعد آج انشاء اللہ نہانے کا ارادہ کیا ہے ، اگر خدا پورا کرے۔ کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں چار سطریں لکھوں گا ، نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دربار اکبری لکھ رہا ہوں ؛ اس میں اکبر کے امرائے دربار کا حال آپ اسی طرح پڑھیں گے جس طرح 'آبِ حیات' میں شعرائے اُردو کا ۔[۱۲۰]

مولانا محمد حسین آزاد کو سکے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اُنہوں نے سکے چوری ہونے کے بعد یہ شوق ترک کر دیا تھا لیکن پھر بھی جہاں کہیں سے کوئی نادر سکہ بغیر مشقت وتفحص حاصل ہو جاتا تو وہ اسے خریدے بغیر نہ رہتے تھے۔ اب بھی مولانا آزاد مرحوم کے ذخیرے میں پانچ سو سے زیادہ سکے موجود ہیں جن میں بہُت سے گریک سکے ہیں ۴ دسمبر ۱۸۸۴ء میں اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

سبحان اللہ ! سکوں کا شوق آپ کو کب ہوا ، جب کہ سکوں کی کان سے آپ جدا ہوتے ہیں۔ جہلم سے لے کر پشاور تک سکوں کا گورستان ہے ، مجھے آپ سے زیادہ شوق تھا ،

مگر پانچ برس ہوئے ، میرے دو تین سو سکے دفعتاً گم ہو گئے ؛ ایسا صدمہ ہوا کہ اب تک جب خیال آتا ہے ، دل تڑپ جاتا ہے۔ بے زار ہو گیا اور خیال کا بھلانا مصلحت دیکھا دوکان دوکان پھر کر اور گدائی کر کے برسوں میں جمع کیے تھے ، ہزاروں میں سے انتخاب کر کے رکھے تھے ، اور تمام گریک تھے۔ ہائے افسوس رنج ہوتا ہے ،نہیں لکھا جاتا آپ کے لیے جس قدر ممکن ہو گی ،کوشش کروں گا۔ [۱۲۱]

مولانا محمد حسین آزاد کو کتابوں سے محبت تھی اور کتابیں جمع کرنا بھی ان کا شوق تھا۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے کتب خانے بھی تعمیر کروائے۔ اور نادر اور کمیاب کتابیں بھی جمع کیں۔ ۱۸۷۰ء میں سید محمد کامل صاحب کو کوہ مری میں کتاب الف لیلہ کے متعلق ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

جناب من !

غالباً یہ کتاب تمام وکمال آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی ، چار ضخیم جلدوں میں ہے کئی برس سے یہ کتاب دلی میں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہے ، چہ جائے لاہور۔۔۔ ڈائریکٹر کے دفتر میں بڑی ضرورت تھی ، اتفاقاً مجھے خبر لگی کہ دلی میں ہے۔میں نے فوراً منگائی۔ اتفاق حسنہ یہ ہوا کہ پندرہ روپے کو ہاتھ آ گئی۔وہاں کسی کو خبر نہ ہوئی ورنہ ممکن نہ تھا کہ مجھ تک پہنچتی۔ اب یہاں ایک صاحب انگریز عہدے دار اعلیٰ نے اپنی کتابیں بیچی تھیں تو ان میں میرے ایک دوست نے چوبیں روپے کو چاروں جلدیں خریدیں۔ جب یہاں آپ تشریف لائیں گے ان شاء اللہ حاضر کروں گا۔۔۔ جس وقت کوئی سارا نسخہ ملا ، وہ بھی حاضر خدمت کروں گا۔ اور اِس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب زبان عرب کی جان ہے ؛ اس کا رکھنا شائق زبان کو فرض،عین ہے۔ [۱۲۲]

اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

مگر میرا ایک ضروری کام ہے وہ کر دو کہ مولوی علی احمد مدرس فارسی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ وہ کہیں سے لے کر بھیج دو۔ [۱۲۳]

۱۶ جنوری ۱۸۷۶ء کو اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے نام خط میں لکھتے ہیں:

اور کتابوں کے باب میں خدا جانے تم نے کیا بندوبست کیا؟ دیکھوں تو کتنے کتب خانے میرے لیے لاتے ہو۔ اجی ہاں صاحب! وہ قاطع برہان اور قاطع انصار اور ساطع البرہان اور فلاں فلاں کے ذیل میں ایک مؤید البرہان ہگلی کے پروفیسر فارسی نے لکھی تھی اور ایک موقع پر وہ دوکان پر پڑی رہی کسی نے نہ پوچھا، اب میں دوکان دوکان پوچھتا ہوں تو کوئی جواب نہیں دیتا، اگر لودیانے میں کسی کے پاس ملے یا میر صاحب قبلہ کے پاس ہو تو ضرور لیتے آیئے یا بندوبست کرتے آیئے اور شرح سہ نثر تصنیف صہبائی پہلے چھاپے کی، شرح پنج رقعہ، شرح شبنم شاداب، شرح ظہیر، اور ایک جواہر الحروف چھاپہ دہلی کی محشی بھی تھی، وہ اگر ملے تو ضرور خیال رکھیے گا۔[۱۲۴]

اگست ۱۸۷۷ء میں لالہ دنی چند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

معلوم نہیں تم کبھی چھاؤنی انبالے میں بھی جاتے ہو یا نہیں اور جاتے ہو تو کباڑیوں کی بھی سیر کرتے ہو یا نہیں؟ وہاں سے بعض دفعہ عجیب کتابیں کار آمد کوڑیوں کے مول ہاتھ آجاتی ہیں۔ ابرو کو ہم نے مدرسے میں داخل کر دیا، پانچویں جماعت میں لیا ہے چند کتابیں لکھتا ہوں اگر ملیں تو ضرور لے لینا۔ شکسپیر کی اُردو ڈکشنری۔ اُردو فارسی کے لفظ لیتا ہے اور انگریزی میں معنی دیتا ہے۔رچرڈسن کی عربی فارسی کی ڈکشنری۔ یہ بھی عربی فارسی کے لفظ لیتا ہے اور انگریزی میں معنی دیتا ہے ویب سٹر کی ڈکشنری۔ انگریزی الفاظ اور انگریزی ہی معانی کباڑیوں کے ہاں اگر یہ کتابیں ہوں اور سستی ہاتھ آجائیں تو ضرور لے لینا۔ میں نے ایک دفعہ تین روپے کو شکسپیر لی، تین روپے آٹھ آنے کو رچرڈسن لی، دونوں انگریز شاگردوں نے چھین لیں۔اس وقت مجھے ضرورت نہ تھی، اب میاں ابرو کے لئے درکار ہیں تو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔[۱۲۵]

حکیم محمد دین صاحب کے نام ۱۸ فروری ۱۸۷۹ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ' الف لیلہ' کے باب میں آپ سے کچھ التماس کیا تھا؛ یقین ہے کہ آپ نے میاں غلام رسول صاحب سے فرمایا ہوگا۔ [۱۲۶]

حکیم محمد دین صاحب کے نام ۹ اپریل ۱۸۷۹ء کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

اگر میں اس معاملے میں خاموش رہوں گا تو ایسے لوگ ایک ایک کر کے میری ساری کتابیں مار رکھیں گے۔ [۱۲۷]

کتابوں کے گم ہو جانے پر وہ کس قدر افسردہ ہو جاتے تھے۔ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

مکانوں کی تکلیف اور اسباب کی برداشت میں جو تکلیفیں ہوئیں میں ضرور بھول جاتا ،مگر کئی لا جواب اور نایاب کتابیں گم ہوگئی ہیں ان کا افسوس نہیں بھولتا۔ [۱۲۸]

میجر سید حسن بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

بمبئی میں ایک کتاب کسی نے چھاپی ہے۔' دیباے رومی' اس میں ترکی اور عربی کی گفتگو لکھی ہے۔ اور اس قدر مبسوط ہے کہ اگر آپ اسے یاد کرلیں گے تو کافی و وافی ہوگی۔ وہ بھی منگوا لیجیے اگر نہ ملے تو مجھے لکھیے کتب خانہ آزاد میں ہے۔فوراً ارسال خدمت کروں گا۔ [۱۲۹]

مولانا محمد حسین آزاد بواسیر کی بیماری میں مبتلا تھے اپنی بیماری کے متعلق اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو ۲ اپریل ۱۸۷۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

مجھے ان دنوں میں بواسیر کا خون بہُت آتا ہے۔کوئی نسخہ ہوتو دیجئے۔ سید نے ایک چھلا یہاں دیا تھا۔ وہ تو مفید ہوا تھا مگر جاتے ہوئے وہ لیتا گیا اور کہتا تھا کہ گھر سے جا کر بھیجوں گا۔ وہ بھیجا تو بے اثر ثابت ہوا۔معلوم ہوا کہ بے تکمیل تعمیل اثر اُڑ جاتا ہے۔ عجیب کارخانے ہیں کوتاہ اندیش بزرگواروں کے! [۱۳۰]

پھر ایک اور خط میں اپنی بیماری کے متعلق ۱۷مئی ۱۸۷۶ ء کو اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے بواسیر سے خون اکثر آتا ہے ؛ چھلا اگر ہو سکے تو مجھے بنوا دو اورضرور بنوا دو''۔[۱۳۱]

۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو ایک اور خط میں لالہ دنی چند کو لکھتے ہیں:

''میرے گھر میں گلے کے درد سے بڑی تکلیف ہے میرے بھی گلے میں درد ہے اورمعلوم ہوتا ہے کہ گرمی اور خشکی سے ہے دودھ ، ملائی ،مکھن فائدہ کرتا ہے واہ واہ بیماری بھی کیا مزے کی ہوئی ہے''۔[۱۳۲]

مولانا محمد حسین آزاد کے خطوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قسم کا لباس پہنتے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں دوسری جگہوں سے منگواتے تھے۔ اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

۱۔ دو چوتہیاں جگراؤں سے لے کر بھیجئے قیمت فی چوتہی پانچ پانچ روپے تک۔

۲۔ چادر جوڑا با حاشیہ

۳۔ ایک جبہ پشمینہ کشمیری کالا حاشیہ دار[۱۳۳]

مولانا آزاد سردی کے موسم میں کشمیری پشمینے کا عمامہ زیب سر فرمایا کرتے تھے۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو اپنے شاگرد کو خط لکھتے ہیں:

''اجی ہاں صاحب ! وہ چادر جوڑا نہ بھولیے گا ، جب موقع ہاتھ آجائے ، ایک جوڑا اور ایک عمامہ لے لیجیے گا''۔[۱۳۴]

ایک اور خط میں لالہ دنی چند کو لکھتے ہیں:

بعد از دعا معلوم باد، عمامے کے لئے بے شک سفید چادر نصف لے لو طولانی یعنی عرض میں پھڑوا کر ۔ مگر ابھی نہ رنگواؤ ، ایک دو برس سفید باندھنے دو ، پھر

اِن شاء اللہ رنگوا کر کنارہ لگا لیں گے۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ رام پور بسیر کی چادریں وہاں آتی ہیں ، وہ اس کام کو بہت خوب ہوتی ہیں ،خیر وہ سب آپ کی صلاح پر محول ہے ، میری طرف سے اتنا ہے کہ نہ رنگواؤ نہ کنارہ لگواؤ۔ چادر جوڑا سات گز ۳۵روپے تک یا ایک دو زیادہ لے لو۔ خفتان وغیرہ کے لئے دو تین گز کا ٹکڑا چادر پشمینے کا عنایت کیجیے۔[۱۳۵]

مولانا محمد حسین آزاد کا اپنے شاگردوں کے ساتھ رویہ بہُت مشفقانہ ہوتا تھا۔ وہ اِن کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے ، اُن کی مدد کرتے ، اُن کی خوشی سے خوش ہوتے ، اور اُن کے دکھ سے افسردہ ہو جاتے تھے۔ اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو نائب تحصیل داری کا امتحان پاس کرنے پر لکھتے ہیں:

عزیز من ! لو، صاحب ، مبارک ہو ! نائب تحصیلداری کیجیے اور جس طرح چاہیے ہم رعیتی لوگوں کو دبائیے الحمدللہ ! الحمد للہ ! اگرچہ یہ میں جانتا تھا کہ ''کوہ نور'' نکلنے والا ہے ، تمھیں خبر ہو ہی جائے گی مگر خوشی کے مارے مجھ سے رہا نہ گیا۔ خیر اللہ مبارک کرے ۔۔۔میں بھی لودیانہ اسٹیشن پر ، کھنے اسٹیشن پر ، جا بہ جا کہتا چلا جاؤں گا کہ ۔۔ وہ پاس ہو گئے ، وہ پاس ہو گئے ،اَب خدا تمھیں تحصیل دار اور تحصیل دار سے ڈپٹی کر کے مجھے دکھائے۔[۱۳۶]

اپنے اِسی شاگرد کو مولانا محمد حسین آزاد وکیل بنوانا چاہتے تھے۔ اِس سلسلے میں آزاد نے بہت کوشش کی۔مکتوبات آزاد میں لالہ دنی چند کے نام جو خطوط ہیں وہ آزاد کی کوششوں اور ہمدردی کا آئینہ ہیں کہ اُنھوں نے اپنے شاگرد کو وکالت کا امتحان دلوانے کے لیے کوئی دقیقہ اُٹھانہ رکھا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پندرہ کو آپ کی عرضی برائے سفارش منصفی صاحب رجسٹرار کو دی تھی ، ابھی جواب نہیں ملا۔نواب سے بھی وعدہ سفارش کا لیا ہے''۔[۱۳۷]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

میں تم سے بہُت شرمندہ ہوں کہ اب تک کچھ نہیں کر سکا۔ اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میں نے ان سے دو دفعہ کہا مگر موقع درست نہیں بیٹھا۔[۱۳۸]

اپنے شاگرد گرامی جالندھری کے بارے میں میجر سید حسن بلگرامی کے نام یکم ستمبر ۱۸۸۴ء کو ایک خط لکھتے ہیں:

گرامی کو میں خوب جانتا ہوں۔ یونیورسٹی پنجاب میں بھی پڑھتا رہا ہے۔ وہاں سے نکل کر بھی کئی سال تک مجھ سے مِلتا رہا۔ بارہ برس کا مسلسل مشاق ہے اور جس رنگ میں وہ لکھتا ہے ، اس میں آج اوّل درجے کا شاعر ہے۔ اس کی طبیعت خیال بند ہے ۔ جلال اسیر ، قاسم مشہدی ، ظہوری وغیرہ ہند میں اسی طرز میں کہتے تھے۔[۱۳۹]

ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا آزاد کی شدید مخالفت شروع کر دی تھی ۔یونیورسٹی کے معاملات میں بھی انھیں محنتوں کے صلے میں دکھ دیے جا رہے تھے اس رویے سے مولانا پریشان اور بیزار رہتے تھے ۔اپنی بیزاری اور پریشانی کا ذکر اپنے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

لالہ دنی چند ! میں بیزار ہوگیا ، اس لیے کہ مایوس ہو گیا۔ اور میرا قاعدہ ہے کہ جب میں مایوس ہو جاتا ہوں تو بیزار ہو جاتا ہُوں۔ پھر ادھر سے بالکل قطع کر دیتا ہُوں۔ یہاں تک کہ اس رنج کے مارے تمھیں بھی خط نہ لکھا کہ کیا لکھوں۔ خاک لکھوں ، جو کچھ غم و غصہ اِس معاملے میں میرے دل پر ہے میں ہی جانتا ہُوں کہ کچھ ہو نہیں سکتا ، اچھا ، مگر کیا کروں کہ کچھ ہو نہیں سکتا۔[۱۴۰]

مولانا محمد حسین آزاد محنتی تھے ، جو کام بھی کرتے تھے دل لگا کر کرتے تھے۔ اپنے ایک خط

میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

اگر چہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے، مگر میں مصروف کار ہوں مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہے کہ کتاب اُٹھائی، لکھ دیا کہ فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک، مگر اسے دل پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے ایسا انتخاب ہو کہ طلباء کے لیے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اُس کا ہر شخص کے لئے باعث شگفتگی ہو۔ البتہ اِس میں محنت بہُت ہے۔[۱۴۱]

مولانا محمد حسین آزاد قناعت پسند طبیعت کے مالک تھے، لہٰذا لکھتے ہیں:

''تھوڑے پر قناعت کروں گا اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا''۔[۱۴۲]

''میں کسی کی کتاب لکھوں ؟ طمع کا منہ کالا ہے'' اَچھا مجھے پنشن ہی دے دیں گے تو قناعت کروں گا''۔[۱۴۳]

قناعت، پسندی اور خود دار طبیعت کا اِس خط سے بھی پتہ چلتا ہے:

جن جن نسخوں کے لیے آپ نے ارقام فرمایا ہے، بے شک حصول مقاصد اور مطلب برآری کا رستہ یہی ہے مگر کیا کروں کہ طبعیت ایسی واقع نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ یک رُخ بازی کھیلا ہوں، اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا، جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے۔ کبھی تو ہمارا پانسہ بھی سیدھا پڑے گا۔[۱۴۴]

آزاد منتقم مزاج نہیں تھے۔ بلکہ اِن میں ہمدردی اور معاف کر دینے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ آزاد اپنا نقصان برداشت کر لیتے تھے لیکن دوسرے کا نقصان ہوتا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ غلام نبی نامی شخص نے مولانا آزاد سے ایک کتاب 'الف لیلہ' عاریتاً لی لیکن واپس کرنے کی بجائے خاموشی سے یہ کتاب الٰہی بخش کتب فروش کو دے کر اس کے بدلے میں قرآن مجید لے لیا۔ آزاد

نے جب غلام نبی سے کتاب واپس کرنے کے لیے خود بھی کہا اور حکیم محمد دین کو بھی کہا کہ غلام نبی سے کتاب دینے کا وعدہ لے لیجیے۔ غلام نبی نے کہہ دیا کہ کتاب گم ہوگئی ہے۔ لیکن آزاد نے بار بار تقاضا کیا ، اور کہا کہ کتاب بمبئی سے مل سکتی ہے وہاں کے کتب فروشوں سے منگوا کر دو۔ غلام نبی نے سوچا تھا کہ معاملہ کسی طرح رفع ہو جائے گا لیکن مولانا آزاد کے تقاضوں پہ تقاضوں سے وہ گھبرا گئے لہٰذا غلام نبی نے کتاب منگوانے کا بندوبست کر دیا جب مولانا آزاد کو ساری حقیقت حال کا پتہ چلا تو اِس سلسلے میں حکیم محمد دین صاحب کو یہ خط لکھتے ہیں :

> آپ کو ضرور کبھی نہ کبھی خیال آتا ہو گا کہ منشی غلام نبی (کذا) کا اور کتاب الف لیلہ کے معالمے کا کیا انجام ہوا۔ اِس کا حال یہ ہے کہ الٰہی بخش کتب فروش اِس شہر میں معقول شخص ہے اِس نے اوّل مجھے خبر دی کہ کتاب مذکور منشی صاحب نے درحقیقت اسی کو دی تھی اور مبادلے میں ایک قرآن شریف لیا تھا۔ چنانچہ کتب فروش مذکور نے چار روپے آٹھ آنے کو وہ کتاب بیچ ڈالی ۔ اب تین دن کا ذکر ہے اِس نے مجھ سے کہا کہ آج منشی مذکور نے انیس روپے مجھے دیئے ہیں اور کہا ہے کہ بمبئی سے کتاب منگا دو جس پیرائے میں اُس نے یہ ذکر کیا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ اِس وقت یہ انیس روپے کا داغ نہایت تکلیف دینے والا ہے ، خصوصاً آج کے زمانے میں ، وہ بھی ۲۵ ، ۳۰ روپے کے نوکر کو۔ اِس تقریر نے میرے دل پر بھی پُردرد اثر پیدا کیا اور میں نے کہہ دیا کہ یہ روپے تم اِنھیں واپس کر دو اور کہہ دو کہ بس کتاب مجھے پہنچ گئی۔ چنانچہ بہ سلسلۂ تحریرات سابقہ آپ سے گزارش ہے کہ آپ نے جس قدر توجہ فرمائی اُس کا دل سے شکرگزار ہوں اور انشاء اللہ کبھی اِس عنایت کو نہ بھولوں گا اور وہ کلفت و پریشانی جو میری اثنائے تحریرات میں ایک بندہ خدا کو لاحق ہوئی اس کا اِس سے بھی عذر کرتا ہوں۔ پروردگار ہم لوگوں کو نیک نیت اور نیک خیال عطا کرے اور اُس کا ثمرہ بھی دے ! میں منشی صاحب کے دعوے سے دست بردار ہوا ، اب فقط خدا سے دعویٰ ہے جس

کا خزانہ بے شمار ہے اور کتب خانہ بے تعداد ہے اور یقین واثق ہے کہ وہ دے گا
، اور ضرور دے گا اور بہت زیادہ دے گا ۔[۱۴۵]

اِس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کس قدر دوسروں کی مجبوریوں کا خیال رکھنے والے تھے ۔آزاد کی شخصیت میں فروتنی اور انکساری تھی۔ وہ ہر ایک سے جُھک کر ملتے ہر ایک کی مدد کے لئے تیار رہتے اپنے مخالف کو کبھی کوئی جواب نہیں دیا ۔ انتقام کے بجائے عفو و درگزر سے کام لیتے۔ آزاد نے سید مبارک والا مکان کرایہ پر لیا۔ کرایہ ادا کرنے کے باوجود اُن سے مکان خالی کرا لیا گیا بلکہ مالک مکان دھیان سنگھ راجا نے اُلٹی نالش کر دی آزاد اُسے خط میں لکھتے ہیں:

اب خیال فرمایئے اس نالش کی تردید کیا مشکل تھی ؟ مگر صرف اِس لحاظ سے کہ راجا صاحب کے مقابل میں برسر اجلاس کھڑے ہو کر مجھے تردید کرنی مناسب نہیں ، میں نے زرمدعا آپ کے پاس بھیجا۔[۱۴۶]

سادگی اور انکساری کی یہ حالت تھی کہ کسی حال میں بھی دوسرے کا پندار مجروح نہ ہونے دیتے تھے۔ سید مصطفٰی خلف سید ابن علی صاحب کے متعلق ایک خط اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

ایک دِن ایک صاحب زادے جن کا قیافہ شرافت اصل پر گواہ تھا تشریف لائے کہ بلگرام کا رہنے والا ہوں ، سید ہوں ، یہاں پڑھنے آیا ہوں ، سید مصطفٰی نام ہے ۔ سبحان اللہ :

؎ تاثیر ہے کیا خاک میں اِس نجد کی ، کہہ دے
تو مجھ سے تو بارے
ہر پھر کے جو آ نکلے ہے یاں ناقۂ لیلٰی
اے جذبِ محبت

بہر حال مجھے خیال ہوا کہ لڑکے ہیں ، نا تجربہ کار ہیں ، مبادا کہ گھر سے کسی بات پر ناراض ہو کر نکل کھڑے ہوئے ہوں ، انھیں روک لیا ، اور اسی دن آپ کے بھائی صاحب کو لکھا ، وہاں سے جواب چہ معنی دارد ، خیر وہ حقیقت میں جیسے شریف ہیں ویسے ہی سید ہیں ۔ چنانچہ تیسرے دِن جماعت اوّل گورنمنٹ سکول میں داخل کروا دیا ۔ [۱۴۷]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

وہ سیّد مصطفیٰ خلف سید ابن علی صاحب بلگرامی یہاں بیمار ہو گئے ۔ اُن کی بیماری نے طول کھینچا۔ بخار ایسا لپٹا کہ نہایت ضعیف کر دیا آدمی کجا اور خدمت کجا ؟ بیمار دار ، تیمار داری کجا ؟ میرا لڑکا ایک دِن خبر لایا کہ میں گیا تھا ، مجھے چند باتوں کے بعد اُنھوں نے پہچانا یہ سُن کر میرا دل نہ رہ سکا ، انھیں مکان پر لے آیا ۔ اب آپ کے جد کے تصدق سے اللہ نے مجھ روسیاہ کی دعائیں قبول کیں اور انھیں شفا دے دی۔ چنانچہ ۲۹ نومبر کو بہ خیر و عافیت روانہ حیدر آباد ہوئے ۔ [۱۴۸]

اپنے شاگردوں کے کمالات کا اعتراف کھل کر کرتے تھے اور اپنے متعلق انکسار سے کام لیتے تھے انشا پردازی کے سلسلے میں ایک خط میں اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو لکھتے ہیں:

انشا کا حقیقت میں تم کو وہم ہے ؛ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر باپ چاہے کہ بیٹے کو سکھاؤں اور اس میں مادہ نہ ہو تو کبھی نہیں بتا سکتا اور اگر اس میں مادہ قابل موجود ہے تو کتابیں بھی استاد کافی ہیں۔ میرے اُوپر جو تمھیں خیال ہے یہ فقط بھرم ہی بھرم ہے ۔میں نے اِس کام کی کبھی اصلاح نہیں لی ، نہ عربی میں نہ فارسی میں ، نہ اُردو میں ۔ ہاں اچھے اچھے صاحب کمالوں کے کلام دیکھتا رہا ، ان کے دیکھتے دیکھتے ایک رنگ ایسا بے رنگ پیدا ہو گیا کہ سب سے الگ ہے۔ اب چاہے کوئی اسے بے رنگ کہے چاہے خوش رنگ ۔بس یہی طریقہ استادی شاگردی کا ہے۔ اگر چند روز پہلے تم یہاں آؤ پھر اپنے سامنے چند کاغذ میں تم سے

لکھواؤں اور اُنھیں تمھارے سامنے خود بتاؤں ، شاید اس کا اثر بہ نسبت اِس کے جلدتر ہو۔ [۱۴۹]

ایک اور خط میں اپنے متعلق سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

" زبان فارسی کی تاریخ میں پروفیسر آزاد ایک شخص ہیں انھوں نے تین چار لیکچر خوب دیے ہیں اور زبان مذکور کے اُصول اور بہُت حالات اور بھی لکھے ہیں"۔ [۱۵۰]

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۸۵ء میں ایران گئے تھے۔ مولانا آزاد سفر ایران کے دوران اپنے ایک شاگرد کو ایران کی رنگا رنگ اشیاء اور کپڑے کے متعلق لکھتے ہیں:

عزیز من !

بعد از دعا ہائے فراواں کے معلوم ہو کہ یہاں کے عجائبات کا کیا حال شمار ہو سکتا ہے۔ ادائی ادنیٰ شے آنکھوں میں رکھ لینے کے قابل ہے اور چیزوں کے علاوہ ایران کی قلم کار چھینٹیں ایسی عمدہ اور خوش رنگ اور خوش وضع ہیں کہ قدرتی پھول شاداب نظر آتے ہیں۔۔۔کم سے کم چھ گز ، پھر سات آٹھ ، دس ، بارہ ، سولہ گز تک اور رنگ پختہ ۔ جوں جوں دھوئی جائیں، پھول کھلتے جائیں۔ سب کے نمونے بیس بیس گز بھیجوں ۔مگر میں ہوتا تو دوستوں میں فوراً بک جاتیں۔ [۱۵۱]

اِسی خط میں ایرانی صنعتوں اور کاریگری کے متعلق اپنے شاگرد کو لکھتے ہیں:

جاڑے کے کپڑے بھی ایسے ایسے ہیں کہ برسوں تک رفاقت کریں چائے دان، چھوٹے چھوٹے ساوار ، بہت خوشنما ، جن میں چار چار پیالیاں چائے کی آ جائیں ، سامنے میز پر دھرلو ؛ آپ ہی بناتے جاؤ ، کمرے کی رونق ہو یہ سب برنجی اور مسی ہوتے ہیں ،لیکن نہایت لطیف اور نفیس۔چاقو اور قینچیاں عمدہ اور بران ، قابلِ تعریف اور دیرپا ، پانچ چھ سے لیکر ایک روپے سات یا آٹھ آنے تک۔ جو

شمشیر ایرانی میں خوبیاں تھیں وہ ساری اب ان میں ختم کر دیتے ہیں۔ چونکہ میرے پاس روپیہ کتابوں کے لیے ہے اس لیے اس میں نہیں لگا سکتا۔[۱۵۲]

محکمہ اطلاعات عامہ کی طرف سے مولانا عربی اخبارات کے ترجمے کرتے تھے محکمہ اطلاعات کے نام لکھتے ہیں:

کل کی ڈاک میں احیا نمبر ۱۳ مجریہ ۱۰ جولائی پہنچا۔ اوّل ایک چار کالم کا طولانی آرٹیکل لکھتا ہے اور تمہید میں بڑی خوشی اور سحر (سرور؟) کے ساتھ انگریزی کاروائی پر تمسخر کرتا ہے۔[۱۵۳]

اس سے یہ پتہ چلتا ہے۔کہ آزاد محکمہ اطلاعات میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کو ۱۸۸۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

عربی اخبار جو پیرس سے نکلا ہے اس کے پہلے اور دوسرے نمبر کا خلاصہ بھیج چکا ہوں وہ ترجمہ انگریزی میں میرے بیٹے نے کیا تھا جو کہ کل رڑکی کو روانہ ہوا۔ وہ انجنیئر نگ کلاس میں وہاں پڑھتا ہے۔ اب امید نہیں کہ ہر وقت مجھے کوئی معتبر اور زاہد راہ آدمی مل سکے جو میرے خلاصے کا انگریزی میں ترجمہ کر سکے۔ اس واسطے اخبار مذکور کا اردو میں خلاصہ کر کے بھیج دیا کروں گا۔حضور کے عالی دفتر میں ترجمہ ہو کر آپ کے ملاحظے سے گزرے گا۔[۱۵۴]

اس خط سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد محکمہ اطلاعات عامہ کی طرف سے عربی اخبار کے ترجمے کرنے پر مامور تھے اور دوسرا یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی انگریزی اتنی اچھی نہ تھی۔محکمہ اطلاعات کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

جناب عالی! اخبار عروۃ الوثقیٰ بہ زبان عربی جو پیرس میں جاری ہوتا تھا، اس کے ۱۸ نمبر اکتوبر ۱۸۸۴ء تک مسلسل اخبار عام میں آئے اور ترجمہ اس کا حضور

میں برابر عرض کیا گیا۔ [۱۵۵]

مولانا اپنے لکھنے کے انداز کے متعلق میجر سید حسن بلگرامی کے نام ۲۴ اگست ۱۸۸۳ء کو لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

''کاغذ کو پھیلے رہتے ہیں۔ آپ بیچ میں کبھی بیٹھا کبھی لیٹا رہتا ہوں اور کاٹ پھانس، کتر بیونت کئے جاتا ہوں''۔ [۱۵۶]

اِس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد بار بار لکھتے تھے اور کاٹتے تھے۔ اِس طرح ان کی تحریر میں آمد کی بجائے آورد تھا۔ اس کی تصدیق ۲۷ دسمبر ۱۹۳۷ء میں جو خط محمد خلیل الرحمٰن نے ڈاکٹر محمد صادق کو لکھا تھا اُس سے بھی ہوتی ہے۔ محمد خلیل الرحمٰن اپنے خط میں مولانا کے متعلق لکھتے ہیں:

طبیعت میں قنوط لیے ہوئے شگفتگی تھی۔ جو شخص کہ دیر آشنا ہو، اُسے میں ملنسار نہیں کہوں گا، لیکن جس سے مِلتے تھے خوب مِلتے تھے۔ بالطبع خاموش نہ تھے فکر شعر و نثر کے وقت بالکل خاموش رہتے تھے۔ بلکہ خشک ہو جاتے تھے۔ ایسی حالت میں بہُت ٹہلا کرتے تھے۔ طبیعت میں آمد بہُت کم تھی اور آورد بہُت ہی زیادہ۔ اِس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ مجھے ایک رقعہ لکھا، جس کے الفاظ اب تک مجھے یاد ہیں، وہ یہ تھا:

''عزیزِ من چوں از چیف کورٹ بہ خانہ روند بر کتب خانہ آزاد بگذرند، والسلام آزاد''۔

سخت گرمی جون کا مہینہ۔ دیوان ذوق کی ترتیب میں دن رات کی بلا مبالغہ مصروفیت۔ کتب خانے گیا تو ہر طرف سے دروازے بند۔ دستک دے کر ایک دروازہ کھلوایا۔ دیکھا کہ رقعہ متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ ٹھیک یاد نہیں رہا کہ کتنے) مختلف اُلٹ پھیر کے ساتھ مسودے میز پر پڑے ہوئے ہیں: [۱۵۷]

مولانا محمد حسین آزاد کی ایک بیٹی امتہ السکینہ تھی، مولانا آزاد کو اپنی بیٹی سے بہُت

پیارتھا۔ اپنے دوست کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> الحمد للہ آپ کے جد کے تصدق سے نور چشم پر خدا نے فضل کیا کہ اڑھائی مہینے ہوئے اُسے پٹیالے روانہ کر دیا۔ مگر جس دِن آپ کا مرحمت نامہ پہنچا دوسرے دِن اس کا خط آیا کہ لڑکا اس کا بہُت علیل ہو گیا۔ میں بہُت پریشان ہوا اور یہاں سے ارسال ادویات کی، فکر میں مصروف رہا۔ کچھ دِل بھی ٹھکانے نہ رہا۔ شکر خدا کا کہ کل وہاں سے خط آیا، جس سے گو نہ اطمینان حاصل ہوا۔[۱۵۸]

غدر کے بعد مولانا آزاد جیند اور لودھیانے گئے اور جیند میں عہدہ محافظ دفتر فوجداری پر بھی فائز رہے۔ اپنے ایک فارسی خط میں معصوم علی کو لکھتے ہیں:

> تفصیل این اجمال آن کہ سابق ازیں حقیقت تقرری خود بر عہدۂ محافظ دفتری فوجداری سرکار جیند عرض خدمت کردہ بودم و ہمان جا بسر می نمودم کہ بعد چندی مولوی رجب علی خاں صاحب بہادر بہ بندہ نبشتند کہ این جانب را چاپ نمودن بعضی از کتب ضروریہ مرکوز خاطر ست؛ می خواہم تا طرح مطبع از آن خود اندازی ۔[۱۵۹]

آزاد کے مکتوبات میں سوانح آزاد کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مولانا آزاد کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی زندگی، ۱۸۵۷ء سے بعد کی زندگی، دوست احباب کے متعلق، دوستوں سے تعلقات کا بننا اور بگڑنا، خانگی زندگی کے متعلق، ملازمت کی مصروفیات، تصنیفات کی مصروفیات، تصنیفات سے پیار اور لگاؤ، غرض زندگی کے بہت سے ایسے مخفی پہلو ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جس طرح غالب کے مکتوبات سے غالب کی مکمل سوانح حیات لکھی جا سکتی ہے اُسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات سے ہم اُن کے بہت سے مخفی حالات سے شناسا ہوتے ہیں جن کے بغیر سوانح آزاد مکمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ غالب کے مکتوبات کی طرح ہم صرف محمد حسین آزاد کے مکتوبات ہی سے ان کی سوانح عمری لکھ لیں، ایسا ہرگز نہیں، ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ مولانا آزاد کے مکتوبات میں اُن کے سوانح کی جھلک ملتی ہے اور اگر ان کے مکتوبات نہ ملتے تو ہم مولانا آزاد کی مکمل سوانح نہ لکھ سکتے۔

مکتوبات آزاد اور آزاد کی دیگر تصانیف کا باہمی ارتباط

مولانا محمد حسین آزاد نے تقریباً تین سو مقالے اور ایک سو دس سے زیادہ درسی اور ادبی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ۸۹ ، ادبی ، سیاسی اور ذاتی حالات کے مسودے عالم وارفتگی کی یاد گار ہیں۔ آزاد کی درسی کتابوں کو بھی بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ، اس سلسلے میں ''قصص ہند'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔آزاد کی مشہور نثری کتابیں آب حیات ، نیرنگ خیال ،سخنِ دان فارس ، نگارستان فارس ، دربارِ اکبری قصص ہند ، سیر ایران ، فلسفہ الٰہیات اور حکایات آزاد ہیں۔

آزاد کی اِن مشہور تصانیف کا پہلے مختصر تعارف دیا جا رہا ہے۔ تا کہ مکتوبات آزاد اور آزاد کی دیگر تصانیف کا باہمی ارتباط سمجھنے میں آسانی رہے۔

آب حیات

آب حیات پہلی بار وکٹوریہ پریس لاہور میں سید رجب علی شاہ کے اہتمام سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب پانچ ادوار پر مشتمل ہے۔آب حیات کو بنیادی طور پر کلاسیکی شاعروں کا جدید تذکرہ کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کے تذکروں میں تنقید ، حالات اور شاعری کے تجزیہ کا ، اِس جیسا متوازن انداز نہیں تھا۔ آب حیات میں افسانوی ، ادبی اور تاثراتی نثر ہے۔ انشاپردازی میں ''آب حیات'' اُردو ادب میں لازوال حیثیت رکھتی ہے۔یہ آزاد کی ادبی کاوشوں کا ثمر ہے۔ آب حیات ویسے تو ۱۸۸۰ء میں منظر عام پر آئی لیکن اِس کے پیچھے آزاد کی بیس برس کی محنت کارفرما ہے کیونکہ اِس کتاب کی داغ بیل محمد حسین آزاد نے بہُت پہلے رکھی تھی۔

اس کتاب کے شروع میں مولانا آزاد نے اُردو زبان کی تاریخ کا ایک باقاعدہ نظریہ پیش کیا ہے۔ مثلاً :

> زبان اُردو کی تاریخ کیا ہے۔ ہندوستان کی اصل زبان کیا تھی ، برج بھاشا پر جب فارسی نے دخل پایا تو اِس کے کیا اثرات ہوئے اور آیندہ کیا ہوں گے۔

زبان مذکور کیوں کر عہد بہ عہد رنگ بدلتی گئی۔ کب دربار گورنمنٹ میں رسائی
حاصل ہوئی اور کب لیاقت تصنیف کا شرف حاصل ہوا۔تاریخ نظم کیا ہے۔[۱۶۰]

آب حیات کو اپنی شائستگی اور لطافت کے باعث نثر میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ واقعات نگاری کے ساتھ ساتھ شخصیت کی تصویر کشی میں آزاد کی تخلیقی اور فنکارانہ تحریر قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ اور قاری اپنے آپ کو اسی میں گم کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری ہر دور کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کر رہا ہے۔

شعراء کے ادبی معرکے، معاصرانہ چشمکیں اور چھیڑ چھاڑ اس تذکرے کا حسن ہے۔شعراء کے عادات و اطوار، اُن کا طرزِ بود و باش اور نجی زندگی کی نشست و برخاست اِس کتاب کا خصوصی جوہر ہے جسے آزاد نے داستانی اُسلوب کے پیرائے میں نہایت دلکش بنا دیا ہے۔

قصص ہند

قصصِ ہند (حصہ دوم) آزاد کی تعلیمی تصنیف ہے۔۱۸۶۸ء میں ناظم تعلیمات پنجاب کی طرف سے یہ اعلان ہوا تھا کہ ۲۱ مارچ ۱۸۶۹ء میں اُردو تصانیف کا مقابلہ ہو گا۔ تصانیف چار موضوعات پر ہونی تھیں جن کا مقابلہ تھا۔ (۱) عام اُصول صرف ونحو (۲) اقلیدس کے ایک حصے کا ترجمہ (۳) فارسی صرف ونحو (۴) تاریخ ہند سے ماخوذ کہانیاں جن میں اہم واقعات اور وہ اشخاص جنھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہوں اُن کے حالات تفصیل سے بیان کرنا تھے۔ اِس سلسلے میں مولانا آزاد نے دو کتابیں لکھیں (۱)فارسی قواعد (۲) قصصِ ہند۔ فارسی قواعد پر آزاد کو دو سو روپے انعام ملا۔

قصص ہند' مسلمان بادشاہوں کے حالات پر مشتمل ہے ۔ اِس میں اُنہوں نے محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاؤالدین خلجی، بابر، ہمایوں، اکبر، نور جہاں، شاہجہاں، اورنگ زیب، سیواجی، محمد شاہ، نادرشاہ اور گورونانک دیو جی کے متعلق دلچسپ، مستند اور اہم تاریخی معلومات فراہم

کی ہیں۔ یہ تاریخی مضامین مسلمانوں کے عہد حکومت سے متعلق ہیں۔

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی:

قصصِ ہند ہماری قدیم تہذیب کا وہ حسن ہے جسے آزاد پوری طرح کاغذ پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر چہ اس کی غرض و غایت تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ آزاد ایک ایسا مرقع مرتب کر گئے جو اُردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ قصصِ ہند آزاد کی ابتدائی تصنیف ہونے کے باوجود ان کا ایسا شہ پارہ ہے جس کا حُسن اور لطافت لازوال ہے۔ آزاد طرح نو کے نقیب اور تہذیب کہن کے عکاس تھے۔ قصصِ ہند میں ان کی تخیل اور احساسات کو زبان مل گئی ہے۔"[۱۶۱]

نعیم احسن قصصِ ہند کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں:

مصنف کی معجز بیانی اس عہد کی رنگا رنگ تصویر کا ہر زاویہ نہ صرف آشکار کرتی ہے۔ بلکہ اسے ایک نیا ڈھنگ اور دلکش انداز بھی عطا کرتی ہے۔ محمود غزنوی کا تذکرہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاری خود غزنوی دربار میں کھڑا ہر منظر، ہر حکم، ہر حملے اور ہر کاروائی کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ نور جہاں بیگم کے بارے میں لکھا گیا مضمون موصوفہ کا لفظی پیکر کہلانے کا حقدار ہے۔

اسی طرح اکبر، بابر، اورنگ زیب اور دیگر مسلم بادشاہوں کے تذکرے بھی قاری کو اس عہد میں لے جاتے ہیں جب ہندوستان پر مسلمان حکمران تھے۔۔۔ مختصر الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تحریر نہیں لکھتے بلکہ الفاظ کے رنگوں سے ایسی تصویر بناتے ہیں جو اُن کی فکری طاقت سے تحریک پا کر قاری کو نہ صرف چلتی پھرتی نظر آتی ہے بلکہ پڑھنے والے کو تصوراتی طور پر اسی عہد میں لے جاتی ہے۔ جس میں وہ واقعی زندہ اور رقصاں تھی مولانا کی یہی نثری خوبی اور جادو بیانی

> ''قصصِ ہند'' میں بھی آپ کی منتظر ہے۔ مصنف کا اُسلوب وہ سحر ہے جو قاری کو
> زمانی حدود سے تصوراتی طور پر بے نیاز کر دیتا ہے۔[۱۶۲]

قصص ہند کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۴۷ء تک اس کتاب کے پچاس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ تشبیہیں ، استعارے، تلازمے، الفاظ کی طلسم بندی، ڈرامائی کیفیت، مجرد خیالات کو مجسم بنا کر پیش کرنا، پُر اثر بیان غرض اُسلوب آزاد کی وہ تمام خصوصیات جو آزاد کے اُسلوب کا خاصہ ہیں قصصِ ہند میں پائی جاتی ہیں۔

نیرنگِ خیال

نیرنگِ خیال کا پہلا حصہ ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اور اِس کا دوسرا حصہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ نیرنگِ خیال کی اشاعت سے اُردو انشا پردازی میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا آغاز ہوا۔ نیرنگِ خیال کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ آزاد اگر نیرنگِ خیال کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اُن کا شمار اُردو کے غیر فانی انشا پردازوں میں ہوتا۔ نیرنگِ خیال کے مضامین کو سر سید نے اُردو کا پہلا انشائیہ کہا ہے۔ نیرنگ خیال اپنے دلکش اُسلوب اور اشاریت کی وجہ سے اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ شاعرانہ انشاپردازی کی مرصع کاری نے اِس تصنیف کو لازوال بنا دیا ہے۔

اس کے مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے اور کتابی صورت میں آنے سے پہلے اِس کے مضامین انجمن مفید عام قصور کے رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ چنانچہ نیرنگِ خیال کا پہلا مضمون اُردو انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات ''زبان اُردو'' کے عنوان سے مئی ۱۸۷۵ء کے رسالے میں شائع ہوا۔ جولائی ۱۸۷۶ء جون ۱۸۷۷ء کے رسالے بالترتیب 'شہرت عام اور بقائے دوام' کا دربار اور اِنسان کِسی حال میں خوش نہیں رہتا، کے عنوان سے یہ مضمون شائع ہوئے۔ لہٰذا اِس کی تالیف کا آغاز ۱۸۷۵ء سے ہوا اور ۱۸۸۰ء میں یہ کتابی صورت میں (یعنی اس کا پہلا حصہ) پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔[۱۶۳]

نیرنگِ خیال کا پہلا حصہ ایک دیباچے، ایک ابتدائیہ اور آٹھ مضامین پر **مشتمل** ہے۔ اور اس کا دوسرا حصہ پانچ مضامین پر **مشتمل** ہے۔ نیرنگِ خیال کے تمام مضامین ترجمہ ہیں اور تمثیلی ہیں، آزاد نیرنگِ خیال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔ اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔[۱۲۴]

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار آزاد کی مصوری کا شاہکار ہے۔ آزاد نے جو الفاظ کے آب و رنگ سے تصویریں بنائی ہیں وہ اتنی دلکش ہیں کہ اُردو نثر میں اِن کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

سخن دان فارس

سخن دان فارس کے دو حصے ہیں۔ سخن دان فارس کا اوّل حصہ ۱۸۷۶ء میں رفاہ عامہ پریس لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ حصہ دوم ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ سخن دان فارس اُن لیکچروں کا مجموعہ ہے جو آزاد نے اُردو، فارسی اور سنسکرت کے حوالے سے زبان کی ترقی اور بناوٹ کے بارے میں ٹریننگ کالج لاہور میں دیے۔

اس کا پہلا حصہ دو لیکچروں پر **مشتمل** ہے۔ یہ دونوں لیکچر ۱۸۷۲ء میں دیے گئے تھے۔ دوسرا حصہ گیارہ لیکچروں پر **مشتمل** ہے جو آزاد نے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۴ء تک دیئے تھے۔

یہ پہلے تو مسودے کی حالت میں پڑے رہے لیکن ۱۸۸۵ء میں آزاد نے ایران سے واپسی کے بعد ان پر نظر ثانی شروع کی اور یہ کام ۱۸۸۷ء میں مکمل ہوا۔ لیکن آزاد کی بیماری کی وجہ سے اِن کی اشاعت نہ ہوسکی۔ بعد میں ان کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے ۱۹۰۷ء میں مفید عام پریس سے شائع کروایا۔

سخن دان فارس علمی اور ادبی لیکچروں کا مجموعہ ہے اِس وجہ سے اِسے اُردو ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ اُردو میں لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ آزاد کی زبان دانی اور اس کے تجزیے کا بہترین نتیجہ اِس میں پیش کیا گیا ہے۔

لسانیات کا جو تقابلی جائزہ سخن دان فارس میں ہے وہ ادب کا سرمایہ حیات ہے۔ ہند ایرانی تقابلی لسانیات پر بحث کرنے سے پہلے آزاد نے لغات اور زبانوں کی فلسفیانہ تحقیقات کے اُصول بیان کیے ہیں۔ اور اس علم کے بارے میں قدیم یونانی نظریے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولانا آزاد نے سخن دان فارس میں ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن کا تعلق ایسے تمام صوتی رُجحانات سے ہے جو زبان اُردو میں داخل ہوئے۔

نگارستانِ فارس

نگارستانِ فارس آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۲ء میں شائع کی۔ نگارستانِ فارس فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ نگارستان فارس آزاد کے فارسی ذوق اور مطالعے کا وہ مرقع ہے جو ایک مدت تک مسودّے کی حالت میں غفلت کا شکار رہا۔ نگارستان فارس کا تنقیدی انداز اس کا امتیازی پہلو ہے لیکن اب اس کی حیثیت محض تاریخی ہے۔ نگارستان فارس اگر اپنے زمانہ تصنیف کے فوراً بعد شائع ہو جاتی تو اُردو ادب میں شاید اِس کی اہمیت اب کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی کیونکہ یہ اپنی تصنیف کے بعد کافی عرصہ گمنامی کے کوچے میں پڑی رہی اور جب شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو اس سے پہلے بہُت سی کتابیں اِس موضوع پر چھپ کر منظر عام پر آچکی تھیں مثلاً شبلی نعمانی کی ’’ شعرالعجم ‘‘ اِس موضوع پر چھپ کرتہلکہ مچا چکی تھی۔ اِس لیے اِس کی اہمیت کم ہوگئی۔آزاد نے نگارستان فارس میں پینتیس شعرا کے حالات زندگی لکھے ہیں اور اُن کا نمونہ کلام پیش کیا ہے۔

دربارِ اکبری

دربارِ اکبری ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی ۔ مئی ۱۸۷۶ء کے شمارے میں خان خاناں اور اگست ۱۸۷۶ء کے شمارے میں بیربر کے متعلق انجمن مفید عام قصور کے رسالے میں مضامین شائع ہوئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دربارِ اکبری ایک طویل مدت میں تصنیف ہوئی۔ دربارِ اکبری کے ساتھ ساتھ آزاد اپنی دوسری تالیف ' دیوان ذوق' کو ترتیب دینے میں بھی مصروف تھے۔ آزاد نے ۸۳-۱۸۸۲ء کا زیادہ حصہ دربارِ اکبری کی ترتیب میں صرف کیا۔ دربارِ اکبری اس وقت شائع ہوئی جب آزاد ہوش وخرد سے آزاد، عالم وارفتگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مولانا ممتاز علی نے آزاد کی وارفتگی سے فائدہ اٹھا کر اُسے اپنے نام سے شائع کروا لیا لیکن بعد میں ثابت ہوگیا کہ اس کتاب کا قلمی مسودہ آزاد کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے جسے عدالت میں آغا ابراہیم باقر نے پیش کیا اور اِس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مولانا آزاد کے نام سے شائع ہوا۔[۱۲۵] محمد ابراہیم دربار اکبری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ایک اور واقعہ میری نظر سے گزرا جو قابلِ ذکر ہے۔ یعنی بعض بعض حاشیے جو اصلی مسودات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میں موجود ہیں اُن کو میر صاحب نے کتاب مطبوعہ میں بجنسہ نقل کر کے اُن کے نیچے اپنا نام یعنی ممتاز علی لکھدیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر صاحب کے اپنے نتائج طبع ہیں۔
>
> ان حالات کا انکشاف پبلک کی اطلاع کے لئے اشد ضروری تھا تاکہ اُن کو کتاب ہذا کی وقعت میں کوئی مشبہ پیدا نہ ہو۔ ورنہ منتخب مُبصرانِ زبان اور چیدہ سخندان تو حضرت قبلہ مرحوم کی زبان وکلام اور اُن کے لطف بیان کو خود پہچان سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا شبلی سے مجھے ایک دفعہ پٹیالہ میں جناب آنریبل خلیفہ صاحب مرحوم کے مکان پر نیاز حاصل ہوا تو اُنہوں نے تعجب سے دریافت فرمایا کہ جومضمون میر ممتاز علی نے مُقدمہ دربار اکبری میں لکھا ہے کہ تتمہ ان کی تحریر ہے دُرست

ہے؟ میں نے تمام حالات عرض کر دیئے ۔اُنہوں نے فرمایا کہ تتمہّ کی عبارت پڑھ کر مجھے پہلے ہی خیال ہوا تھا کہ یہ زبان مولوی صاحب کے سوا دوسرے شخص کی نہیں ہوسکتی اُمید ہے کہ جو لوگ زبان کے نبض شناس ہیں اُنہوں نے میر صاحب کے ان بیانات کی حقیقت اور دقعت کو پہلے ہی سمجھ لیا ہو گا لیکن جن صاحبان کو کوئی مغالطہ یا شکوک پیدا ہوئے ہوں اُن کو اب اِس امر کا عین الیقین ہو جانا چاہئے کہ دَربارِ اکبری میں کوئی تاہلِ تذکرہ تحریف یا تصرّف نہیں کیا گیا۔ بلکہ بحثیت مجموعی یہ حضرت قبلہ مرحوم کی اصلی تصنیف اَور اُن کے دستخطی مسوّدات کے مُطابق ہے۔[۱۶۶]

دربارِ اکبری آزاد کی تصانیف میں سب سے ضخیم کتاب ہے۔ اِس کتاب میں اکبر کے دربار کے حالات اور اُس کے زمانے کی ثقافتی تصویر ہے۔آزاد اپنی تصنیف ’ دربارِ اکبری‘ کو سرسالار جنگ اوّل کے نام پر معنون اُن کی زندگی میں کرنا چاہتے تھے لیکن ۱۸۸۳ء میں سرسالار جنگ وفات پا گئے اور مولانا آزاد کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ دربارِ اکبری ، آزاد کا شاہکار اور ایک لازوال مرقع ہے۔

بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ اِس میں غنائیت بھی نمایاں ہے تاریخی حقائق میں شعریت کے ساتھ ساتھ اِس میں بزم کے ساتھ رزم اور ڈرامائی انداز مِلتا ہے دربارِ اکبری آزاد کی زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ہے اور اس کی وجہ آزاد کا اُسلوب ہے۔ اِس اعتبار سے ہم آزاد کی اِس تصنیف کو تاریخی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔مگر اِس میں ناولیت نمایاں نہیں ہے۔آزاد نے واقعات کو بڑے خوبصورت اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

سیر ایران

سیر ایران آزاد کے ایران کے سفر کی روداد ہے۔ یہ ایک لیکچر اور ایک نا مکمل روزنامچے پر مشتمل ہے۔اس کے شروع میں وہ لیکچر ہے جو آزاد نے ایران سے واپس آکر ۲۶ جولائی ۱۸۸۶ء کو

انجمن ہال لاہور میں دیا تھا۔ یہ لیکچر آزاد کے اُسلوب بیان کا شاہکار ہے۔ اِس لیکچر سے آزاد کی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ آزاد نے جو کچھ ایران میں دیکھا اُن مشاہدات اور تجربات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

قواعد فارسی

۱۸۷۹۔۱۸۸۰ء میں لکھی گئی آزاد کی اِن نثری تصانیف کے مختصر سے تعارف کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔یوں تو آزاد کی جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے بہُت سی تصانیف ہیں ۔لیکن مکتوبات آزاد اور آزاد کی دیگر تصانیف کے باہمی ارتباط میں آزاد کی اِن مشہور نثری تصانیف کو ہی زیرِ بحث لائیں گے ۔جن کا ذکر آزاد نے اپنے مکتوبات میں جا بجا کیا ہے اِن میں زیادہ تر آب حیات ، دربارِ اکبری ،سخن دان فارس ، نیرنگ خیال ،قواعد فارسی ہیں ۔مولانا آزاد نے اپنے استاد ذوق مرحوم کے دیوان کی تدوین میں بھی بہت سعی اور کاوش کی۔ لہٰذا دیوان ذوق کا ذکر بھی مکتوبات میں آزاد نے کیا ہے۔

نوح رضوی مچھلی شہری کے نام فروری ۱۸۸۲ء میں لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

> حقیقتہً اب میں اپنا حال کیا عرض کروں ؛ ڈیڑھ مہینے کے بعد آج انشاء اللہ نہانے کا ارادہ کیا ہے ، اگر خدا پورا کرے کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں چار سطریں لکھوں گا ، نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دربارِ اکبری لکھ رہا ہوں۔ اس میں اکبر کے امراء دربار کا حال آپ اسی طرح پڑھیں گے جس طرح ’آب حیات‘ میں شعرائے اُردو کا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ ہر ایک امیر کے حال کے بعد اس کی تصویر بھی ہو چند تصویریں بہم پہنچائی ہیں مگر بعض اب تک نہیں ملیں ، اگر آپ کے ذریعے سے ممکن ہوتو ضرور مطلع کیجیے۔[۱٦۷]

مکتوبات آزاد سے یہ شہادت ملتی ہے کہ آزاد نے ’دربار اکبری‘ کی تصنیف میں بہت زیادہ محنت کی۔ اس سے ان کی صحت پر بھی شدید اثر پڑا تھا۔لہٰذا اپنے مکتوب میں جابجا اپنی عدیم الفرصتی

کا اظہار کرتے ہیں۔

میجر سید حسن بلگرامی کے نام ۲۶ دسمبر ۱۸۸۲ء کو ایک خط میں دربارِ اکبری میں لکھنے میں مصروف رہنے کے متعلق لکھتے ہیں:

رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے دل دربار میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔'' اب کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے مجھے کہاں ؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مآثر الامرا اور سوانح اکبری کسی زمانے میں دیکھی تھیں یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں ؛ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگایا تھا ؛ چھ دن میں بھاگا بھاگا گیا اور دوڑا دوڑا آیا ؛ جو کچھ ہاتھ لگا اُسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ مآثر الامرا بھی مل گئی ؛ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کرکے جمع کیا ہے مآثر الامراء سے بہُت زیادہ نکلا ؛ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے ، ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مِل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو ''دربارِ اکبری'' کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو مآثر ہاتھ نہیں آئی۔ [۱۶۸]

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

دونوں صورتوں کی تفصیل آپ اب پوچھتے ہیں ، افسوس ! دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے ! دو صورتیں یہ کہ ایک تو وہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا اور استمزاج کیا ، ممدوح نے منظور فرمایا ، مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینہ خیال میں ایک تصویر موہوم ہے اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ قلم بند تو کرتا ہوں۔ دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہوں یا نہیں۔

اس کا مضمون یوں تصور فرمایئے کہ جب اس موقع پر آب ورنگ اپنی دست کاری خرچ کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اُتر آئے، دسوں عقلیں ، پانچوں حواس ، غوروفکر ، وہم و خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے دور بینیں اُٹھائیں اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں ، کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی مگر وہ ایوان عالی شان وغیرہ۔ ہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو ایسی جسارت زیبا نہیں۔آزاد نے کہا سحر کا نورشفق کی سُرخی ، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے اہل دل کہتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ صبا ونسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں دل کہتا ہے صلی علی۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں خسر وگل سے استمزاج کون کرتا ہے۔ ؟ میں نے ایسا ممدوح یہاں پایا ، اسی کے دامن اقبال سے وابستہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ وغیرہ وغیرہ ۔ میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے اور اس میں کچھ ہرج نہیں۔ [۱۶۹]

''خدا اس دربار سے فارغ کر دے تو آپ سے سُرخ رو ہوں مجھے دل سے خیال ہے آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں''۔ [۱۷۰]

''دربار اکبری'' میں منہمک ہونے کی وجہ سے دوستوں کو آزاد سے گلہ تھا جس کا آزاد کو شدت سے احساس تھا۔

'' دربار اکبری'' کاتب سے لکھواتا ہوں ، آپ بھی لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے کچھ ہو جائے ! اب خدا کے فضل سے کئی حال آپ کے سنانے کے قابل ہو گئے ہیں ۔فیضی کے حال پر نظر ثانی کی تو مذہب کے سلسلے میں مجھے خیال آیا تھا کہ دیکھیے آپ اور آپ کے بھائی صاحب اسے سن کر کیا فرماتے ہیں خدا وہ وقت دکھائے۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ [171]

تصانیف کے سلسلے میں مواد اکٹھا کرنے کے متعلق اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کو خط میں لکھتے ہیں:

تذکرۃ العورات کا حال جو آپ نے پہلے مرحمت نامے میں لکھا تھا معلوم نہیں کہ اس میں چاند بی بی کا بھی تذکرہ ہے یا نہیں؟ یہ بھی بڑی بالیاقت اور صاحب ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے۔ اسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اُس کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشاء اللہ کبھی کام آئیں گے۔ اس طرح مصالحہ اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔ [172]

سردست اس قدر تو نہ ہوگا مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ یونی ورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے ملانے اور ہندو پنڈت نکلے بیٹھے ہیں؛ طلباے کالج کو یہ دیسی کتابیں پڑھا لیا کریں گے۔ کالج کے مولوی و پنڈت دونوں تخفیف۔ تب مولوی کا کیا حال؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی؛ اکسٹرا اسسٹنٹی مشکل ہے؛ منصفی؟ تحصیل داری؟ شاید پنشن دے دے گی۔ اس میں ابھی دو برس کی کمی ہے مگر ہو سکتی ہے۔ خیر اگر ہو بھی تو پچاس روپے سے زیادہ نہیں۔ آسان اور عام قاعدہ یہ ہے کہ مسلسل نوکری ۱۳ برس کی ہے اتنے مہینے کی تنخواہ لے لو اور سلام۔ اس تجویز کا عمل درآمد اپریل سے ہو جائے گا۔ اب خدا کی درگاہ سے اُمید ہے کہ تصنیفات کے لیے فرصت کا موقع ملا کرے گا! [173]

مولانا آزاد اپنی تصنیفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے۔ کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدائے کریم کارساز ہے، وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں؛ عہدے کے لیے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے۔؟ [174]

دربارِ اکبری کومولانا آزاد سر سالار جنگ کے نام معنون کرنا چاہتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں:

تسلیم ۔آپ کو یاد نہیں ، میں نے عرض کیا تھا۔ یعنی اس دن میں کالج میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دو طالب علموں نے آکر اس حادثۂ ناگہانی کی خبر دی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل پر صدمہ ہوا۔ وہ متحیر ہو کر مجھے دیکھنے لگے اور اس معاملے میں تقریریں معمولی کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ! اس وقت ہمیں دو باتوں کا فکر کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ اُن کے محامد و اوصاف اس طرح بیان کرنے چاہئیں جس سے پبلک اور گورنمنٹ کے دل پر اُن کے حقوق کی یاد کے نقوش تازہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ اُن کے لڑکوں کے ساتھ حقوق مذکورہ مدنظر رہیں۔ دونوں باتوں کے ضمن میں کوئی ایسی بات بھی جس سے اُن کا نام روشن ہو کر قائم رہے۔ اور مرثیہ خوانی اور تاریخیں لکھنی جو کہ شیوۂ قدیم ایشیا کا ہے ، یہ تو مجھے پسند نہیں ؛ اب اس کا زمانہ گزر گیا ہے۔ انھوں نے کہا ، پھر یہ کیوں کر ہو ؟ میں نے کہا ، مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا ؛ نہ میں کسی قابل ہوں ؛ اتنا ہے کہ دربار اکبری درست کر رہا ہوں ، یہ اُن کے نام پر کر دوں گا۔ دونوں خوش ہو گئے اور کہا کہ ضرور کیجیے۔ یہ عمارت عظیم الشان اُن کے نام پر یادگار رہو گی جو کبھی منہدم نہ ہوگی۔ میں نے کہا بلکہ دو تین اور بھی۔

اب آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ دربار مذکور کو اگر چہ طبع ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کے سبب سے آج کل ملتوی کر دیا ہے ، مگر تمام مسودے پہلو میں دھرے ہیں۔ یہ چھپائی چھ مہینے کا کام تھا جسے میں نے ڈیڑھ ماہ میں کیا۔ انشاء اللہ ۲۵ دن ، حد ایک ماہ کا کام اور ہے ، اس سے فارغ ہوں تو پھر اسے سنبھالتا ہوں۔ خدا و مولیٰ اسداللہ الغالب سر انجام کو حد انجام پر پہنچانے والے ہیں ۔مگر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈیڈیکیشن کا مترری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں یا اسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثۂ جان کاہ پر عالم نے نالہ و زاری کے حق ادا کیے اور یادگار کے لیے تاریخیں اور نظمیں لکھیں: فقیر آزاد سے

اور کچھ نہ ہو سکا، یہ کتاب اُن کے نام پر لکھنا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی :

''چہ کند بے نوا ہمیں دارد''

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے اُن کے سامنے پڑھتا اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے۔ ہائے سر سالار جنگ! سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔ ہائے سر سالار جنگ! مولیٰ اسد اللہ الغالب حاضر و ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ آپ سے کیا اپنا حال کہوں ، میرا دل کچھ اور دل ہے۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں، انشاء اللہ جلد ختم کرتا ہوں۔ کلکتے تک سے بمبئی مدراس تک سے برابر درخواستیں آرہی ہیں اور گھر میں کچھ بھی نہیں!

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ لاہور و امرتسر کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں ہے؟ اس سے بھی تو پوچھو، وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفیٰ دے دیا ہے وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربارِ اکبری لکھ رہا ہے' مگر اکیلا ہے ،کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا کہ وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے : جوہم سے ہو سکتی ہے ، ہم بھی کریں۔ میں درماندۂ تائید و تدبیر کیا کہوں کہ میرا کام سوا خدا و مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد! چار بجے ہیں ، صبح قریب ہے ، وقت تو قبول کا ہے ، اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے [۱۷۵]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

مہاراجا صاحب ایک تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں جس میں عام سلاطین کے حالات ہوں مگر زور اس بات پر ہو کہ سلطنت اس خاندان میں کیوں کر اور کن کن اسباب سے آئی ، اورگئی تو کن کن سببوں سے گئی۔ مثلاً بادشاہ کی بے پروائی

یا عیاشی یا بدنیتی وغیرہ سے یا ارکان دولت کی بے لیاقتی یا نمک حرامی سے ۔ مجھے لکھا تھا کہ تم اس کام کا ذمہ لو اور لکھو کہ کیا تنخواہ لو گے۔ میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیا۔ آٹھ دس دن ہوئے کہ وہ خود آئے اور کہا کہ ان کی نوکری اختیار کرو تو کیا تنخواہ لو گے، اور اس میں اصرار کیا۔ میں نے صاف جواب دے دیا اور انکار کیا۔ غالباً آپ کے نزدیک بھی نامناسب نہ ہوگا۔ میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انھیں میں لگی ہے۔ میں کسی کی کتاب لکھوں؟ طمع کا منہ کالا ہے۔آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ ڈسٹرکٹ مدارس سررشتہ تعلیم سے الگ ہوکر انتظام جدید میں آگئے۔ کالج کا بھی ایسا ہی حال ہوگا۔ کالج کا مولوی اور پنڈت ضرور تخفیف میں آئے گا کیوں کہ یونیورسٹی پنجاب میں مولوی اور پنڈتوں کی کیا کمی ہے۔ اچھا مجھے پنشن بھی دے دیں گےتو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پورا کروں گا: اپنے لختِ جگر بچوں! کو نیم جان تڑپتا نہ چھوڑوں گا۔ چھپائی کا کام دس بارہ دن سے زیادہ نہیں رہا۔ آب حیات نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بے وقوفی ہوئی ہے: دس مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ ماہ میں کیا ہے۔ اللہ آسان کرے: جناب مخدوم ومکرم اپنے بھائی صاحب کوتسلیم کہیے گا اور یہ بھی کہیے گا کہ 'کوہ نور' دیکھتے ہیں یا نہیں؟ بہتر ہے کہ ضرور دیکھا کریں تا کہ حال تو معلوم رہے۔[۱۷۶]

آب حیات اور نیرنگ خیال کے بارے میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

میرا حال یہ ہے کہ تقریباً ۸ دن ہوئے ہوں گے آب حیات اور نیرنگ خیال سے چھٹکارا ہوا۔" مگر اِس سال یونیورسٹی مجھ پر مہربان ہوئی زبان اُردو میں طلباء داخلہ کا ممتحن مقرر کیا اور زبان دانی میں اُردو اور فارسی کا ایک اور ایک حصّہ عربی کا۔ اِن کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے مگر کاغذات جونمبر لگانے کو آئے ہیں، وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ ہیں اور آج سے دس دِن کی مہلت باقی ہے۔خدا اس بلا سے جلد مخلصی دے۔[۱۷۷]

دربار اکبری کا مولانا آزاد نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> انشاء اللہ دس دن میں میں اس کام کو ختم کر دوں گا؛ پھر دربار اکبری ہے اور میں ہوں مولیٰ اسد اللہ الغالب مظہر العجائب کا فضل شامل حال چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ تیسرے ہفتے میں کچھ نہ کچھ لے کر حاضر خدمت ہوں گا۔ آپ انھیں! پھر لکھ دیجیے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم و مغفور کی ہو چکیں۔[۱۷۸]

> دربار اکبری، کو لپیٹ رہا ہوں، مگر دو ہی دن جم کر بیٹھا تھا۔ کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ خیر میں نے ایک دن آرام دیا تخفیف معلوم ہوئی۔ اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ خیر، کام خدا کے فضل سے ہو گیا۔ مگر افسوس اس بات کا آتا ہے کہ بے وقت ہوا۔ خدا اس مرحوم کو اعلیٰ عیلین میں مراتب قربت عطا کرے اگر وہ زندہ ہوتا تو ان چھٹیوں میں خود جاتا اور سناتا، جب دل کا ارمان نکلتا، کیونکہ میں دیکھتا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس کس مقام پر کیا رائے لگاتے ہیں۔ اب جو لکھنا تھا وہ میں نے لکھ لیا اور ہر ایک حال مسلسل بھی ہو گیا جو کام باقی ہے وہ فقط اتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا، کہیں دو کو ایک کر دیا، کہیں کوئی لفظ بدل دیا، کہیں پس و پیش کر دیا۔ خیر اللہ سب مشکلوں کا آسان کرنے والا ہے۔ دیکھیے تصویروں کے باب میں اتنا لکھا، جناب سید صاحب نے جواب بھی نہ دیا۔ آٹھ دس تصویریں بہم پہنچائی ہیں جس طرح ہو گا انھیں سے اس گڑیا کو سنوار کر حاضر کر دوں گا۔ افسوس کہ فرصت نہیں خیر اب پھر۔[۱۷۹]

''دربار اکبری'' تصنیف کرنے کے لیے مولانا آزاد کے پاس وقت نہیں۔ اور خود صحت کے ہاتھوں بھی تنگ آ چکے ہیں۔ لہٰذا جولائی ۱۸۸۴ء کو لکھے گئے خط میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں:

> انصاف کیجیے کہ اب تصنیف کے لیے طبیعت میں ذوق شوق پیدا ہو تو کہاں سے ہو؟ برابر خطوط چلے آتے ہیں کہ فرمائیے دربار اکبری کا کیا حال ہے۔ قند پارسی

(گفتگوئے فارسی) کا کیا حال ہے۔ لیکچروں کا کیا حال ہے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے۔[۱۸۰]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے گزر گیا ہے کہ تعریف سن کر غصہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں، فرصت تو ہے نہیں اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔۔۔ سخن دان فارس مشتہر نہیں ہوا جو میرے اس مختصر فقرے کا مفصل مزا آجاتا۔۔۔ میں نے سخن دان فارس کو نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے چاہا کہ اب دربار اکبری کو سنبھالوں، مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی۔ کیوں کہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں، قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں، اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں؛ اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے، بے موت مر جائے گا، اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کیا ہوگا۔ ان کے حال پر افسوس نہیں، یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے۔ چناں چہ اس لیے اب اسے سنبھالا ہے، اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقع پر کوئی تقریب، کوئی معاملہ یا معرکۂ خاص پیش آیا تھا، وہ بھی نقل کروں۔ کیوں کہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے۔ آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے: آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا۔ خدا انجام کو پہنچا دے۔[۱۸۱]

دیوانِ ذوق کی تالیف کے سلسلے میں مولانا آزاد شیخ ابراھیم ذوق کے شاگرد میاں مذاق کو خط میں لکھتے ہیں:

بندہ پرور! ادام اللہ برکاتہم!

تسلیم۔ آپ کو معلوم ہے کہ استاد مرحوم کا کلام اگر ان کے پاس سے باہر نکلتا تو ہمارے پاس آتا تھا، اور کسی کو نہ دیتے تھے۔ دلی سے نکلتے وقت پروردگار نے توفیق دی اور تائید الٰہی نے یاوری کی کہ ایک کتاب اور اکثر مسودے متفرق ان کے ہاتھوں کے میں لے کر نکلا۔ یہ کتاب وہی ہے جس میں کہ آپ بھی اپنے ہاتھ سے کچھ کچھ اشعار اپنے لکھ آئے ہیں۔ آپ کے بعد اس میں بہت کچھ اور لکھا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس فرض کے ادا کا وقت آ پہنچا اور اب صرف دس پندرہ دن کا کام رہ گیا ہے۔

اس ہفتے پٹنے سے کسی خدا ترس بندے کی تحریر پہنچی؛ اس نے آپ کا نام مبارک لکھا ہے کہ بدایوں میں ان کے پاس دو قصیدے استاد مرحوم کے ایسے ہیں کہ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہیں۔ میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ عجیب نہیں جن دنوں آپ دلی میں تشریف رکھتے تھے، والد مرحوم کی چھوٹی بیاض یا استاد مرحوم کے مسودات خاص میں سے آپ نے دو قصیدے نقل کیے۔ آپ وہ دونوں قصیدے عنایت فرمائیں تو اس مجموعے میں داخل کئے جائیں تاکہ اگر دیوان مطبوعہ میں نہیں مشتہر ہوئے تو اب مشتہر ہو جائیں۔ انھیں اللہ مغفرت کرے، وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں کو بھی اللہ نے دسترس دے رکھی ہے: واجب ہے کہ ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے میں سعادت حاصل کریں۔[۱۸۲]

مولانا آزاد اپنے اُردو ڈرامہ کے متعلق لکھتے ہیں:

فی الحال میں نے ایک ڈرامہ اُردو میں لکھا ہے جس میں اکبر کے دربار کی بعض مفید حالتیں اور اہلِ دربار کی لیاقتیں دکھائی ہیں۔ اور یہ بھی سمجھایا ہے کہ اکبر بادشاہ غیر ملک کے ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے کس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گیا تھا۔ اور کالج کے طلبا اس تصنیف کے ادا کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور یہی بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کا ایک کمال جو گردش ایام سے مٹ کر محو ہو گیا تھا، پھر تازہ ہوتا ہے۔[۱۸۳]

۵ جون ۱۸۸۷ء میں سید ناصر نذیر فراق کے نام لکھتے ہیں:

خدا جانے میری تحریر سے تم کیا سمجھے ہو گے حقیقت میں یہ کام زیادہ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ضعف دماغ نے مجھے نکما کر دیا ہے۔ رات کو بالکل لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ درحقیقت یہ بھی مقتضائے سن ہے آزاد بے چارہ بڈھا ہو گیا اور صدمات زمانہ نے توڑ دیا۔اپنے بستے مسودوں میں بند سے پڑے ہیں۔دیکھتا ہوں اور ترستا ہوں کہ ہائے نظر ثانی نہیں کر سکتا ۔ جب یہ حالت ہوتو فرمائیے ، شاگردوں کا حق کیا ادا کر سکوں؟ میرا حال خود قابلِ رحم ہے بہ کمال عجز کہتا ہوں کہ معاف کرو۔سوالوں کا جواب مجملاً لکھتا ہوں:

۱۔ تصانیف کی فہرست مشکل ہے ،کبھی پھر لکھوں گا۔

۲۔ استاد مرحوم کا دیوان ایک دفعہ مرتب کیا وہ ضائع ہو گیا: اب پھر فرصت پاؤں تو دوبارہ محنت کروں ۔

۳۔ دربار اکبری ، سات آٹھ سو صفحے کی کتاب میں نے لکھی ہے۔ اس میں امرائے عہد اکبر کے حالات اس لطف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس طرح میر ،سودا ، سید انشا کے حالات آپ نے ' آب حیات' میں دیکھے۔ کتاب تیار ہے ، فقط نظر ثانی کی کسر ہے۔ بس بھئی ، اب پھر کبھی۔[۱۸۴]

۱۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں میجر سید حسن بلگرامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

آب حیات کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے ، فقط قدر افزائی ہے ، ورنہ ''من آنم کہ من دانم'' آپ کے عنایت نامے اور آپ کے بھائی صاحب کے مرحمت نامے کے مضامین تقریباً متحد تھے ، اس لیے دو دو جگہ لکھنا فضول سمجھ کر ان کے لیے لکھتا ! ہوں اور آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں، آپ ملاحظہ فرما کر بھیج دیجیے گا۔ جو کچھ حال سنا میں نے صاف صاف لکھ دیا ہے۔[۱۸۵]

ایک اور خط ملاحظہ فرمائیں:

میں آج کل عجب مخمصے میں پڑ گیا۔۔۔ ادھر مجھے کورس وغیرہ کا مرض لگ گیا، ادھر کالج کا تردد کہ دفعتہً معلوم ہوا، آب حیات اور نیرنگ خیال امتحان یونی ورسٹی میں داخل ہوگئی ہیں اور امتحان آغاز مئی پر ہوگا۔ سب نے کہا کہ دونوں کو ضرور چھپوانا چاہیے۔۳، ۴ سو طالب علم دفعتہً طلب گار ہوگا۔ مجھے بھی طمع نے لچایا اور فوراً شروع کر دیا۔ اگر نہایت کوشش ہو اور کارگر بھی ہو اور کئی چھاپہ خانوں سے کام لیا جائے تو دو مہینے چاہئیں۔ خیر اب تو پھنس گیا۔ دو دو ہزار چھپوانے شروع کیے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ تنہا ہوں، رفیق کوئی نہیں۔ استغفر اللہ یہ کیا کفر ہے، مولیٰ موجود ہے۔[۱۸۶]

۱۰ اگست ۱۸۸۳ء کو سید حسن بلگرامی کے نام مولانا آزاد لکھتے ہیں:

تسلیم! بارہ دِن کا عرصہ ہوا کہ ایک نسخۂ 'آب حیات' طبع جدید بذریعہ عریضہ، نیاز ارسال خدمت کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک رسید اس کی نہیں پہنچی۔ کتاب مذکور میں اگر چہ جا بہ جا بہت مطالب زیادہ کیے ہیں۔ مگر میر انیس مرحوم کے خاندان کا حال اور مرزا دبیر مرحوم کا حال آپ سے داد طلب ہے اب کی دفعہ فہرست بھی بہ نسبت طبع اوّل کے مفصل تر لکھی ہے، اسے ملاحظہ فرما لیجیے گا۔ اگر فرمایئے تو ایک نسخہ آپ کے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھی بھیج دوں۔ مگر انھیں ایسے ہزلیات کے دیکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہوگی۔ پھر یہ بھی فرمایئے کہ ایک نسخہ سید لائق علی خان کی خدمت میں بھیجوں یا کچھ ضرورت نہیں، اور انھیں بھیجوں تو پھر جناب عالی کے لیے کیا رائے ہے۔[۱۸۷]

دو نسخے 'آب حیات' حیدر آباد کو روانہ کر دیے، اور آپ کے بھائی صاحب کو عریضہ لکھ دیا کہ ایک نسخہ اپنے کتب خانے میں رکھیں؛ دوسرے نسخے کے لیے اس قدر مرحمت فرمائیں کہ ایک عریضہ میری طرف سے لکھوائیں۔ اور حضور نواب سید لائق علی خان بہادر کی خدمت میں پیش فرمائیں۔[۱۸۸]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

مجھے ایک اور مشکل پیش آئی ؛ صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے مجھے فرمایا کہا آب حیات اور نیرنگ خیال کو ہم نے کالج اور نارمل اسکولوں کی پڑھائی میں بھی داخل کر دیا ہے۔لیکن ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح اس میں تاریخ زبان اُردو کی آپ نے لکھی ہے۔ ایسی ہی تاریخ اور تحقیق زبان فارسی کی ہو کہ اسے فارسی کے کورس میں داخل کریں۔ میں نے عرض کی کہ زبان فارسی میں دس لیکچر میرے لکھے رکھے ہیں۔ اس میں زبان فارسی نظم فارسی پر بھی ایک ایک لیکچر ہے پوچھا ''تیار'' ہے؟ میں نے کہا ''سب تیار ہیں'' تجویز مناسب یہ معلوم ہوئی کہ میں انھیں چھپوا دوں تقریباً تین سو صفحے سے زیادہ کی کتاب ہوگی۔ قیمت میں کم رکھوں گا ، ہر طالب علم لے سکے گا۔ صاحب اپنی سکیم میں لکھ دیں کہ فلاں کتاب میں سے فلاں فلاں لیکچر بھی طلباء دیکھ لیں۔ یہ لیکچر میں نے ۱۸۷۴ء میں دیے تھے ، ان پر بھی نظر ثانی واجب ہے اس لیے طبیعت متردد ہے اور آج آنے کو ہمت نہیں پڑی۔ [۱۸۹]

قوی جنگ کوئی صاحب عرض بیگی ہیں اُنھوں نے بڑی محبت سے ایک خط لکھا اور تصنیفات طلب فرمائے ۔ میں نے نیرنگِ خیال بھیجی ۔بیس دن کے بعد خط آیا کہ کتاب نہیں پہنچی ۔فرمایئے تین آنے کی کتاب پر دو آنے رجسٹری کے دیتا تو آپ کو کیا جواب دیتا۔ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی ۔ [۱۹۰]

تسلیم ۔ مدت گزر گئی کہ خدمت سے مقصر ہوں مگر عالم مجبوری ہے کہ آب حیات میں غوطے کھا رہا ہوں ۔ انشاء اللہ ایک مہینے کا کام اور ہے۔ [۱۹۱]

مولانا محمد حسین آزاد نے ڈراما اکبر بھی لکھا تھا۔ جس کو بعد میں ان کے شاگرد ناصر نذیر فراق نے مکمل کیا تھا۔ ڈراما لکھنے کے متعلق ۱۸۸۳ء میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

جس فارسی ڈراما کا آپ نے حال بیان فرمایا تھا وہ میں نے لے کر دیکھا، چونکہ ابتدائی تصنیف ہے۔اس لیے تحریر میں پھیلاؤ اور بات کو بڑھانا اور مزے لے لے کر کہنا ، کوئی مصرع ، کوئی فقرہ مقفیٰ ، کوئی چٹکلا وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطف ابھی نہیں پیدا ہوئے۔ خیر جو کچھ کیا ہے نہایت غنیمت ہے۔ عربی ، فارسی میں یہ شاخ انشاپردازی کی بالکل نہ تھی ؛ بڑی بات ہے کہ زمین سخن میں ایک قلم تو لگائی ؛ شاخ و برگ بھی نکل آئیں گے۔گل پھول بھی کھل جائیں گے۔ ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر زمانہ فرصت دے تو انشاء اللہ اُردو میں ایک ڈراما لکھ کر میں بھی نمونہ دوں گا۔ دل تو بہُت کچھ چاہتا ہے۔مگر اکیلا آدمی اور بے سامان ؛ کیا کیا کچھ کرے۔

یک دل و خیل آرزو ، دل بہ کجا کجا نہم
سینہ تمام داغ داغ ،پنبہ کجا کجا نہم [۱۹۲]

زبان فارسی کی تاریخ میں پروفیسر آزاد ایک شخص ہیں اُنھوں نے تین چار لیکچر خوب دیے ہیں اور زبان مذکور کے اصول اور بہُت حالات اور بھی لکھے ہیں۔ تین چار سو صفحے کی کتاب ہوگی۔مگر افسوس ہے کہ وہ ابھی مسودے ہیں نظر ثانی کر رہے ہیں۔ عجب نہیں کہ ہو جائے تو جلد چھپوا دیں۔ [۱۹۳]

ہاں قواعد فارسی میں ایک کتاب ڈائریکٹر صاحب کی فرمائش سے میں نے لکھی تھی ؛ اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اور کتب خانہ آزاد سے فاضل ہے۔ وہ انشاء اللہ روانہ کرتا ہوں (خدا کرے بھول نہ جاؤں) آپ دیکھیے گا قواعد کی کتاب ہے اور اُصول وضوابط بیان کیے ہیں۔ اور پھر دیکھیے کہ طرز بیان کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ یہ بھی دیکھئے گا کہ مثالیں کیا خوش آیند بہم پہنچائی ہیں اور زبان کو اور محاورے کو کس قدر قوت دیتی ہیں۔خدا کرے آپ کو پسند آ جائے۔ [۱۹۴]

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

مولوی محمد حسین آزاد مولوی محمد باقر کے فرزند اور دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جنگ آزادی سے پہلے دہلی اُردو اخبار کی ادارت میں اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ اختتام جنگ پر مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے گولی سے اڑا دیا تو آزاد بمشکل جان بچا کر لاہور پہنچے۔ لاہور میں ڈاکٹر لائٹر اور محمد حسین آزاد کا سالِ ورود ایک ہی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ مشرق اور مغرب سے تجدّد کے جو دو روشن ستارے اُبھرے تھے ان کا سنگم لاہور میں ہوا اور پھر ان کی تابناک روشنی نے ادب کے مطلع کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ محمد حسین آزاد کے مزاج اور اُسلوبِ فکر میں دلّی کالج کی روایت اور دہلی کی قدیم تہذیب کا بہت اثر تھا۔ وسیع المشربی، درویشی اور استغنا مزاجی انہیں ورثے میں ملی تھی۔ دِلّی کالج کے قیام کے دوران انہیں تعصّب اور تنگ نظری سے نفرت ہو گئی۔ محمد ابراہیم ذوق کی تربیت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا، مذاہب کے بارے میں انہوں نے آزادہ روی کا مشرب اختیار کیا۔ اور ان سب کی روشن جھلکیاں ان کی تصنیفات میں بھی نظر آتی ہیں۔[۱۹۵]

بقول شیخ عبدالقادر:

یہ خطوط طرزِ تحریر کے اعتبار سے اردو خط نویسی کا عمدہ نمونہ ہونے کے سوا یہ بڑی خوبی رکھتے ہیں کہ شغلِ تصنیف کے متعلق ہیں اور ان میں پروفیسر محمد حسین آزاد کی مشہور تصانیف پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ کہیں آبِ حیات کا ذکر ہے کہیں سخن دان فارس کی تیاری ہے کہیں دربار اکبری کا تہیہ۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنی محنت کس قدر تلاش اور کیسے وسیع مطالعہ کے نتائج ہیں جن سے ہم فیض یاب ہو رہے ہیں۔[۱۹۶]

مکتوبات آزاد میں آزاد کی مختلف تصانیف کے بار بار ذکر ۱۸

یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مکتوبات مولوی محمد حسین آزاد اور آزاد کی دیگر تصانیف کا باہمی ارتباط بہت زیادہ ہے۔

حوالہ جات

١ حسن اختر ملک ، ڈاکٹر ،''تاریخ ادب اُردو'' ابلاغ لاہور ١٩٧٩ء ، ص ٥٢٤

٢ آزاد ، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی ، سید ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ١٩٦٦ء ص ١١٧

٣ ایضاً ، ص ٩٤

٤ ایضاً ، ص ١٤٤

٥ ایضاً ، ص ١٢٧

٦ ایضاً ، ص ١٤٤

٧ ایضاً ، ص ٢٤٣

٨ ایضاً ، ص ١٣٣

٩ ایضاً ، ص ١٠٧

١٠ ایضاً ، ص ١٣٨

١١ ایضاً ، ص ١٣١

١٢ ایضاً ، ص ٩٧

١٣ ایضاً ، ص ١٠٤

۱۴ ایضاً ، ص ۱۳۹

۱۵ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۱۱۴

۱۶ فرزانہ سید، ''نقوش ادب''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴

۱۷ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۱۴

۱۸ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۹ ایضاً ، ص ۲۰۶

۲۰ ایضاً ، ص ۱۵۰

۲۱ نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر، ''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین''، ۱۹۸۳ء، ص ۸۸

۲۲ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۱۴

۲۳ ایضاً ، ص ۹۷

۲۴ ایضاً ، ص ۱۱۴

۲۵ ایضاً ، ص ۳۷۔۳۸

۲۶ ایضاً ، ص ۳۸

۲۷ ایضاً ، ص ۳۹

۲۸ ایضاً ، ص ۲۱۳

۲۹ ایضاً ، ص ۹۷

۳۰ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۲۲۰

۳۱ ایضاً ، ص ۱۲۴

۳۲ ایضاً ، ص ۱۴۹

۳۳ ایضاً ، ص ۲۲۵

۳۴ ایضاً ، ص ۱۴۱

۳۵ ایضاً ، ص ۱۰۳

۳۶ ایضاً ، ص ۱۷

۳۷ ایضاً ، ص ۱۱۰

۳۸ ایضاً ، ص ۱۱۴

۳۹ ایضاً ، ص ۲۷

۴۰ ایضاً

۴۱ ایضاً

۴۲ ایضاً ، ص ۱۲۴

۴۳ ''اردوے معلّٰی''، مطبع اکمل المطابع دہلی، ۱۸۶۹ء، ص ۶۵

۴۴ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی،

سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۱۲۵

۴۵ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۳۶

۴۶ ایضاً ، ص ۱۹۴

۴۷ ایضاً ، ص ۱۶۷۔۱۶۸

۴۸ ایضاً ، ص ۲۴۶

۴۹ ایضاً ، ص ۱۸۳

۵۰ ایضاً ، ص ۱۰۶

۵۱ ایضاً ، ص ۱۱۶

۵۲ ایضاً ، ص ۹۰۔۹۱

۵۳ ایضاً ، ص ۱۹۷

۵۴ ایضاً ، ص ۱۳۰

۵۵ ایضاً ، ص ۱۲۸

۵۶ ایضاً ، ص ۱۶۶

۵۷ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد، ''مکتوبات آزاد''، گیلانی پریس لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۱۳

۵۸ ایضاً ، ص۲۲

۵۹ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۷۹

۶۰ ''مکاتیب آزاد'' ص ۵۰۔۵۱

۶۱ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد، ''مکتوبات آزاد''، گیلانی پریس لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۹۵

۶۲ ایضاً ، ص ۸۸

۶۳ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۲۷

۶۴ ایضاً ، ص ۱۳۱

۶۵ ایضاً ، ص ۹۶

۶۶ محمد صادق ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۱۲۹

۶۷ وحید قریشی ، ڈاکٹر ، سے راقمہ کا انٹرویو بمقام لاہور، بتاریخ ۵ دسمبر ۲۰۰۷ء

۶۸ جالب دہلوی ، سید، از دیباچہ'' مکاتیب آزاد''، ص ۱۸۔۱۹

۶۹ ''مکاتیب آزاد'' ص ۳۲۔۳۳

۷۰ ایضاً ، ص ۸۶

۷۱ ایضاً ، ص ۱۷۸۔۱۷۹

۷۲ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۰۔

۷۳ ایضاً ، ص ۱۹۲

۷۴ ایضاً ، ص ۲۱۳

۷۵ ایضاً ، ص ۲۱۹

۷۶ ایضاً ، ص ۱۶۰۔۱۶۱

۷۷ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۲۴۹۔۲۵۰

۷۸ ایضاً ، ص ۴۱

۷۹ ایضاً ، ص ۱۰۳۔۱۰۵

۸۰ ایضاً ، ص ۵۵

۸۱ ایضاً ، ص ۵۵۔۵۶

۸۲ ایضاً ، ص ۶۴۔۶۵

۸۳ ایضاً ، ص ۶۶

۸۴ ایضاً

۸۵ ایضاً ، ص ۶۷

۸۶ ایضاً ، ص ۶۸

۸۷ ایضاً ، ص ۶۹

۸۸ ایضاً ، ص ۷۱

۸۹ ایضاً ، ص ۷۱۔۷۲

۹۰ ایضاً ، ص ۷۵۔۷۷

۹۱ ایضاً ، ص ۱۱۳

۹۲ ایضاً ، ص ۲۵۲

۹۳ ایضاً ، ص ۲۲۵

۹۴ ایضاً ، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۹۵ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۹۹

۹۶ ایضاً ، ص ۱۱۴

۹۷ ایضاً ، ص ۲۵۲۔۲۵۳

۹۸ ایضاً ، ص ۲۵۵

۹۹ ایضاً ، ص ۲۴۵

۱۰۰ ایضاً ، ص ۹۰

۱۰۱ ایضاً ، ص ۱۶۶

۱۰۲ ایضاً ، ص ۱۷۱

۱۰۳ ایضاً ، ص ۱۷۲۔۱۷۳

۱۰۴ ایضاً ، ص ۱۸۸

۱۰۵ ایضاً ، ص ۱۸۹۔

۱۰۶۔ ایضاً ، ص ۱۹۰

۱۰۷۔ ایضاً ، ص ۱۹۱

۱۰۸۔ ایضاً ، ص ۱۹۲۔۱۹۳

۱۰۹۔ ایضاً ، ص ۱۹۳

۱۱۰۔ ایضاً ، ص ۱۹۵

۱۱۱۔ ایضاً ، ص ۲۰۴

۱۱۲۔ آزاد، مولوی **محمد حسین** ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۵

۱۱۳۔ ایضاً ، ص ۲۰۷

۱۱۴۔ ایضاً ، ص ۱۷۷

۱۱۵۔ ایضاً ، ص ۲۱۵

۱۱۶۔ ایضاً ، ص ۲۱۸

۱۱۷۔ ایضاً ، ص ۲۱۹۔۲۲۰

۱۱۸۔ ایضاً ، ص ۲۲۲

۱۱۹۔ ایضاً ، ص ۲۲۳۔۲۲۴

۱۲۰۔ ایضاً ، ص ۱۵۹۔۱۶۰

۱۲۱۔ ایضاً ، ص ۲۲۵۔۲۲۶

۱۲۲۔ ایضاً ، ص ۵۷

۱۲۳۔ ایضاً ، ص ۱۰۲

۱۲۴۔ ایضاً ، ص ۱۰۵۔۱۰۶

۱۲۵۔ ایضاً ، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۱۲۶۔ ایضاً ، ص ۱۵۱

۱۲۷۔ ایضاً ، ص ۱۵۵

۱۲۸۔ ایضاً ، ص ۱٦۴

۱۲۹۔ آزاد، مولوی محمد حسین، ''مکاتیب آزادؔ'' مرتبہ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹٦٦ء ص ۲۰۸۔۲۰۹

۱۳۰۔ ایضاً ، ص ۱۱۳

۱۳۱۔ ایضاً ، ص ۱۱٦

۱۳۲۔ ایضاً ، ص ۱۳۹

۱۳۳۔ ایضاً ، ص ۱۴۴

۱۳۴۔ ایضاً ، ص ۱۳۹

۱۳۵۔ ایضاً ، ص ۱۴۸

۱۳٦۔ ایضاً ، ص ۱۰۲

۱۳۷۔ ایضاً ، ص ۱۰۷

۱۳۸۔ ایضاً ، ص ۱۱۹

۱۳۹۔ ایضاً ، ص ۲۲۲۔۲۲۳

۱۴۰۔ ایضاً ، ص ۱۴۰

۱۴۱۔ ایضاً ، ص ۱۸۰

۱۴۲۔ ایضاً ، ص ۱۸۲

۱۴۳۔ ایضاً ، ص ۱۹۱

۱۴۴۔ ایضاً ، ص

۱۴۵۔ ایضاً ، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۱۴۶۔ آزاد، مولوی محمد حسین، ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۱۔۱۶۲

۱۴۷۔ ایضاً ، ص ۲۲۰۔۲۲۱

۱۴۸۔ ایضاً ، ص ۲۲۶

۱۴۹۔ ایضاً ، ص ۹۰۔۹۱

۱۵۰۔ ایضاً ، ص ۲۰۷

۱۵۱۔ ایضاً ، ص ۲۳۷۔۲۳۸

۱۵۲۔ ایضاً ، ص ۲۳۸

۱۵۳۔ ایضاً ، ص ۲۲۸

۱۵۴۔ ایضاً ، ص ۲۳۹۔۲۴۰

۱۵۵۔ ایضاً ، ص ۲۴۰

۱۵۶۔ ایضاً ، ص ۱۹۸

۱۵۷۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر، بحوالہ'' راوی مولانا محمد حسین آزاد نمبر حیات آزاد پر ایک اہم نادر و معاصر مآخذ'' ص ۱۵۳۔۱۵۴

۱۵۸۔ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۹۷

۱۵۹۔ ایضاً ۶۲۔۶۷

۱۶۰۔ آزاد، محمد حسین، ''آب حیات'' خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۷

۱۶۱۔ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف'' ص ۶۲۷

۱۶۲۔ آزاد، محمد حسین، ''قصص ہند''، بک ٹاک میاں چمبر ۳ ٹمپل روڈ لاہور ص ۶۔۷

۱۶۳۔ بحوالہ ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف''، ص ۳۴۳

۱۶۴۔ ''نیرنگ خیال'' ص ۹

۱۶۵۔ آغا سلمان باقر، ''محمد حسین آزاد، حیات، شخصیت، فن''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء ص ۱۴۱

۱۶۶۔ آزاد، محمد حسین، مقدمہ دربارِ اکبری، طبع ثانی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۳ اگست ۱۹۱۰ء، ص ۶

۱۶۷۔ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۵۹۔۱۶۰

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۶۹۔ ایضاً، ص ۱۶۷۔۱۶۸

۱۷۰۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۱۷۱۔ ایضاً

۱۷۲۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۱۷۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔۱۷۹

۱۷۴۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۱۷۵۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔۱۸۹

۱۷۶۔ ایضاً ، ص ۱۹۰۔۱۹۱

۱۷۷۔ آزاد، مولوی محمد حسین ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ، ص۱۹۲

۱۷۸۔ ایضاً ، ص۱۹۳

۱۷۹۔ ایضاً ، ص۱۹۵۔۱۹۶

۱۸۰۔ ایضاً ، ص۲۱۹۔۲۲۰

۱۸۱۔ ایضاً ، ص۲۲۳۔۲۲۴

۱۸۲۔ ایضاً ، ص۲۴۴۔۲۴۵

۱۸۳۔ ایضاً ، ص ۲۴۷

۱۸۴۔ ایضاً ، ص ۲۵۸

۱۸۵۔ ایضاً ، ص۱۷۱۔۱۷۲

۱۸۶۔ ایضاً ، ص۱۸۲۔۱۸۳

۱۸۷۔ ایضاً ، ص۱۹۴۔۱۹۵

۱۸۸۔ ایضاً ، ص ۱۹۷

۱۸۹۔ ایضاً ، ص۲۰۹۔۱۱۰

۱۹۰۔ ایضاً ، ص۲۱۳

۱۹۱۔ ایضاً ، ص۲۱۳

۱۹۲۔ ایضاً ، ص ۲۰۱۔۲۰۲

۱۹۳۔ ایضاً ، ص ۲۰۷

۱۹۴۔ آزاد، مولوی محمد حسین ، ''مکاتیب آزاد'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۲۰۷۔۲۰۸

۱۹۵۔ انور سدید ، ڈاکٹر ، ''اُردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اُردو پاکستان ، کراچی ۱۹۹۶۔۱۹۹۷ ، ص ۳۵۴

۱۹۶ مخزن جلد ۱۱ نمبر ۱ اپریل ۱۹۰۶ء ، ص ۲۱

باب ششم

آزاد کے مکتوب الیہ: تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ

مکاتیب آزاد کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے مکتوب الیہ کچھ تو ایسے حضرات تھے جن کو مولانا آزاد نے بمشکل ایک یا دو خط لکھے ہیں۔مثلاً میاں نوشاہی کے نام صرف ایک مختصر سا خط لکھا ہوا ہے۔ وہ بھی صرف اپنا خط لینے کے لئے لکھتے ہیں۔

میاں نوشاہی جی !

کوئی میرا خط ہوتو دے دیں۔

محمد حسین آزاد عفی عنہ
۴ دسمبر ۱۸۷۶ء[1]

مولانا آزاد کا یہ سب سے مختصر خط ہے۔ اسی طرح باقی کئی دوست احباب کے نام بھی ایک ایک خط ہے۔مولانا اخبار میں بھی کام کرتے تھے اس لیے مہتمم پنجابی اخبار، مہتمم ہمائے پنجاب، مہتمم اخبار انجمن، مدیر اخبار اور ادارہ نور بصیرت بھی مولانا آزاد کے مخاطب ہیں، اِن سب کے نام ایک ایک خط ہے۔کچھ خط اور کچھ عرضیاں مولانا آزاد کی ملازمت کے سلسلے میں ہیں۔میجر فلر صاحب، سلطان مراد خاں، خلیفہ محمد حسین، مولوی عبدالطیف خاں، قائم علی خان، سید محمد کامل صاحب، کوہ مری، نامعلوم الاسم دہلوی، محرم علی چشتی، انسپکٹر آف سکولز، سجاد حسین (طالب علم)، نوح رضوی مچھلی شہری، کارندہ راجا صاحب، سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب، میاں مذاق شاگرد ذوق مرحوم، حاجی بنے صاحب، آغا ابراہیم حسین، مولوی ممتاز علی، کوتوال لاہور، پنڈت گوپی ناتھ۔ بنام ؟ یہ سب ایسے مخاطب ہیں جن کے نام صرف ایک ایک خط ہے۔

معصوم علی صاحب اور منشی ذکاء اللہ صاحب کے نام دو دو خط ہیں۔معصوم علی صاحب کے نام دونوں خط فارسی میں ہیں۔

بنام نا معلوم اور سید ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام پانچ ،حکیم محمد دین صاحب کے نام چھ، ڈاکٹر لائٹر کے نام چار خط ، چودہ محکمانہ خط اور درخواستیں ہیں۔ لالہ دنی چند کے نام بتیس اور میجر سید حسن بلگرامی کے نام اکتیس (۳۱) خط ہیں۔سب سے زیادہ خط مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے نام اور اُس کے بعد اپنے دوست میجر سید حسن بلگرامی کے نام لکھے ہیں۔

لالہ دنی چند

لالہ دنی چند مشہور قصبہ جگراؤں کے رہنے والے تھے۔جگراؤں ضلع لودھیانہ کا ایک نام آور قصبہ ہے[۲]۔ لالہ دنی چند مولوی محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مولوی محمد حسین آزاد کی زیر نگرانی لاہور میں رہے اور مولوی محمد حسین آزاد ان کی ترقی کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہے۔ اِن کے نام لکھے گئے مکتوبات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد لالہ دنی چند کی ترقی اور وکالت کے امتحان کے لیے کس قدر کوشاں تھے۔لالہ دنی چند کے نام لکھے گئے مکتوبات میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جن میں مولوی محمد حسین آزاد نے اِن کی منصفی اور وکالت کے امتحان کا ذکر کیا ہے۔ لالہ دنی چند پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا نے لالہ دنی چند کو وکالت کا امتحان دینے کا مشورہ دیا جو لالہ دنی چند نے مان لیا ، اور وکالت کا امتحان دینے کے لیے لالہ دنی چند کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد نے بہُت تگ و دو کی۔لالہ دنی چند نے تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کیا۔مولانا آزاد کو اِن کے امتحان پاس کرنے پر اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی ایک شفیق باپ کو اپنے بیٹے کی کامیابی پر ہوتی ہے۔گویا مولانا محمد حسین آزاد اپنے شاگرد لالہ دنی چند کو اپنی اولاد کی مانند سمجھتے تھے۔ لالہ دنی چند مولانا آزاد کے مرزا تفتہ ہیں۔(مرزا تفتہ مرزا غالب کے چہیتے شاگرد تھے) مولانا محمد حسین آزاد نے سب سے زیادہ خط اپنے شاگرد لالہ دنی چند ہی کے نام

لکھے ہیں۔ان کے متعلق بہت سی معلومات مولانا آزاد کے مکتوبات میں سے ہی ملتی ہیں۔لالہ دنی چند چونکہ قصبہ جگراؤں کے رہنے والے تھے اِس سلسلے میں آزاد کا یہ خط ملاحظہ ہو:

''یہ خط جگراؤں کی طرف پھینکتا ہوں ، خدا کرے پہنچ جائے ! پتا مجھے معلوم نہیں خدا جانے تمھیں کب پہنچے اور میرے لکھنے کا فائدہ بھی حاصل ہو یا نہ ہو''۔ [۳]

میجر سید حسن بلگرامی

مولانا محمد حسین آزاد کے دوسرے مکتوب الیہ میجر سید حسن بلگرامی ہیں اُن کے نام انہوں نے اکتیس (۳۱) مکتوب لکھے ہیں۔ جن میں سے ۲۸ مکتوب مخزن میں شائع ہوئے تھے جو بعد میں مرغوب ایجنسی نے ایک مجموعے کی صورت میں ۱۹۰۷ء میں شائع کیے تھے۔میجر سید حسن بلگرامی بلگرام کے رہنے والے تھے۔ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد بلگرام کے متعلق لکھتے ہیں:

''جواہر خیز خاک پاک بلگرام کو کون نہیں جانتا۔سلطنت اسلام کے ابتدائی زمانے سے لے کر اب تک ایسے ایسے درِ شہوار وہاں پیدا ہوئے ہیں کہ زمانے کی آنکھ نے نہیں دیکھے''۔ [۴]

میجر سید حسن بلگرامی بھی بلگرام کے ایک اعلیٰ خاندان کے رکن تھے۔ آپ نواب عماد الملک کے سوتیلے اور نواب سید علی بلگرامی اتالیق حضور نظام کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ پہلے انگریزی تعلیم کے ذریعہ ڈاکٹری حاصل کی اور پھر انڈین میڈیکل سروس میں چلے گئے اور اپنے ہی بقول وہ زیادہ تر فوج کے ساتھ رہے۔مگر اس عرصہ میں اپنے ذاتی اور خاندانی ذوق وشوق کے ذریعہ عربی ، فارسی ، اُردو اور ترکی کے لاثانی ادیب بن گئے۔قومی درد کی وجہ سے سرسید احمد خاں کے ساتھ خاص تعلقات رکھتے تھے۔انڈین میڈیکل سروس سے مستعفی ہوکر وہ انگلستان چلے گئے اور ایک عرصہ تک انگلستان ہی میں رہے۔۱۹۱۲ یا ۱۹۱۳ء میں وہ انگلستان سے واپس انڈیا آ گئے اور علی گڑھ میں مقیم ہو گئے۔مغربی زبانوں میں انگریزی ، فرانسیسی ، جرمن اور کسی قدر اسپینش میں بھی اُنہوں نے

واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اُنھوں نے اپنے سفر اسپین کے حالات بھی لکھے تھے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اُن کا انگریزی خطبہ صدارت چھپا ہوا موجود ہے۔میجر سید حسن بلگرامی ہر جگہ قومی خدمات کو سب سے پہلے مدِنظر رکھتے تھے۔اُردو میں بھی اُن کا ایک مضمون مولانا محمد علی کے اخبار 'ہمدرد' میں چھپا تھا۔میجر سید حسن بلگرامی مرزا غالب کے بڑے مداح تھے اور کبھی کبھی ان کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔علی گڑھ کالج میں سید حسن بلگرامی نے ''بلگرامی ٹیوٹریل کالج'' نامی بورڈنگ قائم کی تھی جس میں سید حسن بلگرامی خودبھی رہا کرتے تھے۔وہ دل کے مریض تھے۔ ۱۹۱۵ ء میں شملے میں سر علی امام کے مہمان تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔[۵]

۱۹۰۷ء میں سر عبدالقادر کی تحریک اور سید حسن بلگرامی کی محبت سے مکتوبات آزاد کا ایک مختصر سا مجموعہ مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں سید حسن بلگرامی کے نام ۲۸ اٹھائیس خط شائع ہوئے تھے۔سیدحسن بلگرامی کے نام کے خطوں میں مولانا آزاد نے اپنی مصروفیت اور بار بار دربارِ اکبری اور ڈراما اکبر کا ذکر کیا ہے، جس سے ایک تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کوخودتو ادب سے بے حد لگاؤ تھا ہی لیکن میجر سید حسن بلگرامی ڈاکٹر ہونے کے باوجود ایک ادیب تھے اور اُن کی بھی ادب سے گہری وابستگی تھی۔دوسرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد 'دربارِ اکبری' میں مکمل منہمک تھے اور آپ اس کتاب کی ترتیب و مواد کا اہتمام کر رہے تھے۔'ڈراما اکبر' بھی اِن کے زیرِغور تھا۔ اِسی طرح مولانا آزاداورسید حسن بلگرامی ایک دوسرے کو کتابوں کے بارے میں اطلاعات بھی دیتے تھے اور کتابیں مہیا کرنے میں ایک دوسرے کے معاون و مدد گار ہوتے تھے۔اِس سے بھی مکتوب نگاراورمکتوب الیہ کی ذہنی ہم آہنگی اور کتابوں سے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے کہ سید حسن بلگرامی کوبھی کتابوں سے بے حد لگاؤ تھا۔آزاد لکھتے ہیں:

> ''تحفتہ العوام کا جونقش مطلوب ہے ، انشاء اللہ عنقریب دریافت کر کے عرض کروں گا''۔[۶]

اِسی طرح حیدر آباد کے حالات ، اور اُس وقت شائع ہونے والے پرچے ''شفق'' پر بھی گفتگوفرماتے تھے اور ایک دوسرے کو آگاہ کرتے رہتے تھے مثلاً لکھتے ہیں:

''شفق کے پرچے الگ الماری میں رکھتا جاتا ہوں ، تیار آپ کے حکم کے منتظر ہیں اس خط کا جواب آئے تو روانہ خدمت کروں''۔[7]

''شفق ابھی آیا ، اکثر پرچے آپ کے دیکھنے کے قابل ہیں''۔[8]

میجر سید حسن بلگرامی جن دِنوں ملازمت کے سلسلے میں امرتسر میں مقیم تھے ، مولانا کی یہ خط و کتابت میجر سید حسن بلگرامی کے ساتھ اُنہی دنوں کی ہے۔ مولانا لاہور میں تھے اور میجر سید حسن بلگرامی امرتسر میں تھے۔میجر حسن بلگرامی کے نام جو خطوط اُنہوں نے لکھے ہیں اِن میں شگفتہ مزاجی بے تکلفی اور سادگی ہر لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اِن کے نام بہُت سے خط لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں بڑی بے تکلفی اور خلوص تھا۔

ڈاکٹر ولیم لائٹنر

ایک اور مکتوب الیہ جن کے نام مولانا آزاد کے کافی خط ہیں ڈاکٹر ولیم لائٹنر ایک صاحب بہادر تھے جو تقریباً ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے[9]۔تعلیم وتربیت استنبول میں حاصل کی۔ نوعمری میں لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج میں مذہبیات کی جماعت میں داخل ہوگئے ، چند مہینے بعد عربی فارسی پڑھنے لگے۔ عربی ، فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۶۱ء میں لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج ہی میں پروفیسر مقرر ہو گئے اور عربی ، فارسی اور اسلامی قانون کی تعلیم دینی شروع کر دی ۔[10]

ان کے متعلق ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

۱۸۴۸ء میں ہنگری میں انقلاب کا سیلاب آیا اور ملک پر تباہی اور بربادی نے ایسی یورش کی کہ لوگ بھاگ کر آس پاس کے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ انہی خانماں برباد قافلوں کے ساتھ ایک نوجوان بیوہ اپنی عزت اور ایک

لڑکے اور لڑکی کی جانیں بچانے کے لیے استنبول میں وارد ہوئی ۔لڑکے کی عمر آٹھ سال کی تھی اور لڑکی غالبًا اس سے چند سال بڑی تھی۔ استنبول میں نوجوان بیوہ کی ایک انگریز ڈاکٹر سے شادی ہوگئی جس کا نام لائٹر تھا۔ سوتیلے باپ نے صرف بچوں کی پرورش ہی نہیں کی بلکہ انھیں اپنا نام استعمال کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ یتیم لڑکی جو اپنی ماں کے ساتھ جان بچانے استنبول آئی تھی جب پل بڑھ کر جوان ہوئی تو اُس کا بیاہ ایک انگریز سے ہوا جو حکومت ہند کے محکمہ جنگلات میں افسر تھا۔ یوپی میں ضلع گورکھپور کے مقام پر ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام لیو پولڈ ایمری رکھا گیا۔ یہی لیوپولڈ ایمری دوسری جنگ عظیم میں مسٹر چرچل کی وزارت میں پانچ سال تک (۱۹۴۰ تا ۱۹۴۵ء) وزیر ہند رہے۔

لڑکے کا نام ولیم لائٹر تھا ، اس نے جب ہوش سنبھالا تو اسے استنبول کے مکتبوں اور مسجدوں میں عربی اور ترکی کا درس لینے کے لیے بھیجا گیا۔ چنانچہ چند سال کے اندر یہ عربی اور ترکی اہل زبان کی طرح بے تکلف بولنے لگا۔۱۸۵۶ء میں جنگ کریمیا شروع ہوئی تو ولیم لائٹر کی عمر مشکل سے سولہ برس تھی ، اِس وقت برطانوی فوجوں کو ترجمانی کی سخت ضرورت تھی ولیم لائٹر نے فوج میں کمیشن حاصل کر لیا۔ اور جب جنگ ختم ہوئی تو یہ کرنل کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ فوج انہیں مستقل کمیشن دینے پر آمادہ تھی لیکن ولیم لائٹر پادری بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ لندن یونیورسٹی کے ''کنگز کالج'' میں مذہبیات کی جماعت میں داخل ہوگئے مگر چند ہی مہینے بعد مذہب کی تعلیم سے اِن کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔اب یہ عربی ، فارسی پڑھنے لگے۔ تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی ڈاکٹر لائٹر کو کالج میں پروفیسری کی جگہ مل گئی اس وقت یہ صرف بیس سال کے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ اسلامی قانون بھی پڑھانے لگے ۔ انہی کی کوششوں سے لندن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا باقاعدہ وہ شعبہ قائم ہوا ، جو موجودہ سکول آف اورئینٹل اسٹڈیز کا نقشِ اوّل تھا۔"

ڈکشنری آف انڈین بائیو گرافی میں ان کے متعلق لکھا ہے

لائٹنر ۱۸۴۰ میں بداپسٹ میں پیدا ہوئے ان کے والد ۱۸۴۷ء میں ترکی میں فزیشن تھے۔ مالٹا پروٹسٹنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔(ڈاکٹر ولیم لائٹنر) ۱۵ سال کی عمر میں چیف مترجم ہو گئے"[۱۳]

ڈاکٹر ولیم لائٹنر نومبر ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تعینات ہو گئے تھے۔گورنمنٹ کالج لاہور میں اِن کا پرنسپل کی حیثیت سے بڑا مقام تھا اور انگریزی میں ان کی حیثیت مسلّم تھی لیکن مشرقی علوم سے بھی اِن کو بہُت محبت تھی۔اُنہوں نے اورنیٹل کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی اور انجمن پنجاب کی داغ بیل ڈالی۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۹-۱۸۷۰ء میں پنجاب کالج کا قیام عمل میں آیا۔اِن کی بڑی خواہش تھی کہ لاہور میں اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ڈاکٹر ولیم لائٹنر انجمن پنجاب کے صدر اور اورنیٹل کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ولیم لائٹنر عربی، فارسی، ترکی، اُردو اور انگریزی کے عالم اور مصنف تھے۔۱۸۷۶ء میں اُنہوں نے لارڈ لسٹن سے پنجاب کالج کو مکمل یونیورسٹی بنانے کا وعدہ لیا، اس کی توثیق شاہی دربار سے کی گئی۔

۱۸۸۲ء میں پنجاب کالج کو مکمل اور بااختیار یونیورسٹی کا درجہ مِل گیا۔ڈاکٹر لائٹنر پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر لائٹنر تُند مزاج اور غُصہ کے مالک تھے۔شروع شروع میں اِن کے مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ تعلقات بڑے گہرے، مشفقانہ اور دوستانہ تھے۔آزاد پر مہربان تھے۔آزاد کی ذہانت و فطانت اور علمی و تنقیدی صلاحیتوں سے بہُت متاثر تھے۔

لائٹنر نے ۱۸۶۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد سے اُردو پڑھنی شروع کی تھی اور تقریباً پانچ مہینے تک یہ ان سے اُردو پڑھتے رہے۔لائٹنر نے محمد حسین آزاد کو ایک صداقت نامہ بھی دیا تھا جو ایک

طرف تو آزاد کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے اور دوسری طرف لائٹنر کی مردم شناسی کا غماز اور لائٹنر کے مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ اچھے تعلقات کا بھی بین ثبوت ہے۔

صداقت نامہ کا اُردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور

۲۸ اپریل ۱۸۶۵ء

مولوی محمد حسین گزشتہ پانچ مہینے سے میرے اُردو منشی ہیں، مَیں ان کے کردار اور علم کا حد سے زیادہ معترف ہوں وہ ہر اس تحریک کو اپنے وقت اور وسیع معلومات سے امداد دینے پر مستعد رہتے ہیں جس کا مقصد قوم کی اصلاح ہو۔ انجمن اشاعتِ مفیدہ میں میری صدارت میں انہوں نے جو مقالہ پڑھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے موضوع پر کتنی قدرت حاصل ہے اور اُن کی تنقیدی صلاحیت کسی یورپین عالم سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مولوی انتہائی علمی انسان ہیں۔ مختلف موضوعات پر مختلف لوگوں کی فراہم کی ہوئی معلومات میں ہمیشہ میں نے ان کی اطلاعوں کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد پایا ہے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ گورنمنٹ کی توجہ اب تک ایسے پُر جوش اور ذہین آدمی کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر
ایم ۔اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی
آنریری فیلو کنگز کالج لندن [۱۳]

لیکن ''ہمائے پنجاب'' اور ''سنین الاسلام'' کی وجہ سے بعد میں ڈاکٹر لائٹنر اور مولانا محمد حسین آزاد کے تعلقات بگڑ گئے۔ لائٹنر کا رویہ مخالفانہ ہوگیا اور لائٹنر نے موقع بہ موقع مولانا محمد حسین آزاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور کالج میں آزاد پر سختی شروع کر دی۔

اس طرح مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ ڈاکٹر لائٹنر کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ شروع شروع میں مولانا نے حالات بہتر کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ آزاد کے مخالفوں

کی وجہ سے اور کچھ لائٹنر کے گرم مزاج کی وجہ سے حالات بہتر نہ ہو سکے۔ جیسا کہ اِن کے خطوں سے بھی پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر کو تعلیمی کاموں کے علاوہ سیر و سیاحت سے بھی خاصی رغبت تھی۔ سیر و سیاحت کے شوق میں یہ کشمیر، ہنزہ، گلگت اور کافرستان گئے۔ اسی دوران ان کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی اور یہ چھٹی لے کر اپنے علاج کے لیے انگلستان چلے گئے۔ ۱۸۷۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر انگلستان سے واپس آئے تو اُس وقت آزاد کے حالات پریشان حد تک خراب نہیں ہوئے تھے لیکن ۱۸۷۷ء میں زور و شور سے جنگ ہوئی۔ اِس سلسلے میں آزاد کا ایک خط اپنے شاگرد لالہ دنی چند کے نام ہے۔ جس میں آزاد لکھتے ہیں:

> مجھ سے ڈاکٹر صاحب سے اب کی دفعہ بڑی سخت طور پر جنگ ہوئی، نہیں جانتا کہ اب پہاڑ سے اُتر کر کیا رنگ ہو یا تو بھارت کا یدھ ہوا یا گول مول ہو گئی۔ مجھ سے ملنے کو اگر جی چاہتا ہو گا تو اُن سے بھی اجازت لے لیجیے گا۔ ایک جی میں آتی ہے کہ کچھ کچھ مضامین تین تین چار چار صفحے کے دے کر رسالہ قصور مڈل اسکول کو اور رونق دے دوں، پھر کہتا ہوں کہ ایک دِن یہ بھی منحرف ہو جائے گا تو ناحق دل کو رنج ہوگا۔ [۱۴]

کالج میں یہ انگریزی ادب اور فلسفہ پڑھاتے تھے۔ شیکسپیئر پر جب کبھی یہ لیکچر دیتے تو لاہور کے کمشنر اِن کی جماعت میں آ کر شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر بیرسٹر بھی تھے، ایک دفعہ لا کالج کے پرنسپل چھٹی پر چلے گئے تو کئی مہینے تک ڈاکٹر لائٹنر اُن کی جگہ قانون پڑھاتے رہے، لیکن اِن کے مزاج سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔ آتش مزاجی کی وجہ سے ان کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی اور آخر کار ۱۸۸۶ء میں انگلستان واپس چلے گئے۔ ۱۸۸۷ء میں جب ڈاکٹر لائٹنر رخصت پر تھے، اپنے منصب سے بھی سبک دوش ہو گئے اور مستقل انگلستان میں قیام پذیر ہو گئے۔ مسٹر ایری کے مطابق ڈاکٹر لائٹنر پچاس (۵۰) مشرقی اور مغربی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ لندن میں مشرقی علوم کی تعلیم کے لئے

ایک باقاعدہ ادارہ ووکنگ بستی میں ''اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے قائم کیا۔ ۲۲ اپریل ۱۸۹۹ء کو ڈاکٹر لائٹنر کا (بون) جرمنی میں انتقال ہوگیا۔[۱۵] ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی کے مطابق ڈاکٹر لائٹنر نے ۲۲ مارچ ۱۸۹۹ء کو بون میں وفات پائی۔[۱۶]

ڈاکٹر لائٹنر کی اُردو تالیفات میں عربی ''صرف ونحو'' اور''سنین الاسلام'' کے نام قابلِ ذکر ہیں ''سنین الاسلام'' کا پہلا حصہ ۱۸۷۱ء میں اور دوسرا حصہ ۱۸۷۶ء میں مطبع انجمن پنجاب سے شائع ہوا تھا۔ انجمن پنجاب کی رپورٹ متعلقہ ۱۸۸۲۔۱۸۸۱ء کے مطابق ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن کے جلسوں میں درج ذیل مقالات وقتاً فوقتاً پیش کیئے۔

۱) کیا سنی مسلمان دنیا کے لیے سلطان ترکیہ خلیفہ ہیں۔
۲) شال بافی میں استعمال ہونے والے خاص ہندسوں اور رنگوں کا نقشہ
۳) پنجاب کی نمائیندہ کونسل
۴) دیسی سول سروسیں
۵) دیسی نوجوانوں کو انگلستان بھیجنے کے خطرات
۶) تعلیمی کمیشن اور انجمنِ پنجاب

حکیم محمد دین

حکیم محمد دین صاحب کے بارے میں آغا محمد طاہر صاحب نے'' مکتوبات آزاد'' میں لکھا ہے:

> حکیم محمد دین صاحب لاہور سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے تھے۔علمی و ادبی شوق اس قدر تھا کہ دن رات تحصیل علم میں ہی مصروف رہتے تھے۔اس زمانے کے اکثر علوم مروجہ میں اچھی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔علم کیمیا کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا۔[۱۷]

حکیم محمد دین کے متعلق سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی لکھتے ہیں :

نقوش کے لاہور نمبر میں شیخ محمد دین صاحب کا ذکر ہے کہ وہ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے، چھوٹی عمر میں منشی فاضل پاس کیا، پھر ڈاکٹر لائٹر کے مشورے سے وٹرنری کالج میں داخل ہو کر فارغ التحصیل ہوئے۔ رسالہ طب حیوانات نکالا ، ریاست نابن گئے پھر ۱۸۷۹ء کے قریب لاہور آ کر مطب کرنے لگے اور ۱۹۲۳ء میں فوت ہوئے۔نقوش ۹۴۵۔[۱۸]

مولانا عبداللطیف خان

کلکتہ کی مشہور و معروف شخصیت ۹۳-۱۸۲۸ء ممبر بورڈ ممتحن ممبر سینٹ کلکتہ یونیورسٹی ، ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر درجہ اوّل ،ضلع ۲۴ پرگنہ ،جٹس آف دی پیس صوبجات ، بنگال ، بہار و اڑیسہ ، آپ عبدالغفور نساخ کے حقیقی بھائی تھے ان کے والد کا نام منشی قاضی فقیر محمد بن قاضی محمد رضا مغفور ہے۔[۱۹] وسطی ایشاء کے سفر سے واپس آ کر آزاد کلکتے آئے اور جو کچھ وہاں مشاہدہ کیا اُن کے بارے میں بتاتے ہوئے کلکتہ کی سوسائٹیوں یعنی انجمنوں (برٹش انڈین ایسوسی ایشن انجمن اسلامی اور ایشیاٹک سوسائٹی) کا ذکر کیا اور بتایا کہ ''انجمن اسلامی'' کے صدر عبداللطیف خاں فصیح۔ بااخلاق متواضع اور ملنسار ہیں اور اِسی طرح کلکتے کے اکابرین میں انجمن اسلامی کے صدر عبداللطیف خاں کا نام بھی لیا۔ ۲ اپریل ۱۸۶۷ء کو ایک اجتماع ہوا۔ اور بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر سرسیسل بیڈن نے مولوی عبداللطیف صاحب کی تعریف میں فارسی میں تقریر کی اور ان کی خدمات کو سراہا۔[۲۰]

میجر اے آر فلر۔ A.R. Fuller

۱۸۲۸ء۔ ۱۸۶۷ء

مصنف سفر نامہ یروشلم۔

۱۸۵۶ء میں جب پنجاب میں محکمہ تعلیم کا آغاز ہوا تو میجر صاحب کا تقرر بطور ناظم تعلیمات ہوا۔ اسی ملازمت کے دوران ہی آپ کی وفات ہوئی۔ میجر فلر نے ہی مولوی محمد حسین آزاد کو ملازم رکھا تھا۔ میجر صاحب کے سررشتہ دار مولوی کریم الدین تھے۔میجر صاحب نے مولوی کریم الدین کے ساتھ مل کر عربی انتخاب مسلم الادب کلکتہ یونیورسٹی کے لئے ۷۰۔۱۸۶۹ء میں مرتب کیا۔ لاہور سے اِس کا اُردو ترجمہ ۱۸۹۹ء میں شائع کیا۔

میجر صاحب کی وفات کی خبر رپورٹ مجموعی انتظام ممالک پنجاب ۶۷۔۱۸۶۶ء نے صفحہ ۱۲۶ اور حوالہ نمبر ۱۶۴ پر دی ہے۔اِن کی وفات کے بعد Field Arnold کا تقرر ہوا۔[۲۱]

سر سالار جنگ

سر سالار جنگ ۱۸۵۳ء میں اپنے چچا سراج الملک کی وفات کے بعد ریاست حیدرآباد کے وزیر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں آپ نے انگلستان کا سفر کیااور ڈیوک آف سدر لینڈ میں مہمان رہے۔آکسفورڈ یونیورسٹی نے آپ کوایل۔ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔[۲۲]

سر سالار جنگ نواب نام میر تراب علی خاں ، ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ میں پیدائش اور ۲۹ ربیع الاوّل ۱۳۰۰ھ (۸ فروری ۱۸۸۳ء) کو وفات ہوئی۔[۲۳]مولانا محمد حسین آزاد اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تصنیف دربارِ اکبری ان کے نام معنون کریں۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی سر سالار جنگ کے متعلق لکھتے ہیں:

مختار الملک نواب سر سالار جنگ اوّل کا نام میر تراب علی خاں تھا۔ وہ ۲ جنوری ۱۸۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محترم شجاع الدولہ تھے اور جدِ امجد نواب منیر الملک ثانی ، جو ۱۸۰۹ء سے ۱۸۳۲ء تک دولت آصفیہ کے مدارالمہام رہے۔ سالار جنگ کے چچا نواب سراج الملک بھی اسی عہدے پر فائز تھے۔ جب ۱۸۵۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا تو اعلیٰ حضرت نواب ناصر الدولہ نظام وقت میں نواب سالار جنگ کو اس عہدۂ جلیلہ پر سرفراز فرمایا اور یہ ۳۰ سال تک اپنے فرائض کو نہایت خوش اُسلوبی اور عمدگی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ بالآخر ۸ جنوری ۱۸۸۳ء کو ۵۴ سال کی عمر میں بعارضۂ ہیضہ انھوں نے اس جہانِ فانی سے رحلت کی اور اپنے پیچھے اپنا نیک نام چھوڑ گئے۔

نواب صاحب بےنظیر مدبّر ، دور اندیش حاکم ، بارعب افسر ، اعلیٰ درجے کے منتظم اور نہایت صاحبِ عقل و دانش انسان تھے۔ عقل وفراست ،فہم وکیاست تدبر و سیاست میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ خوش اخلاق اور پاکیزہ سیرت شخص تھے۔ معاملہ فہمی اُن پر ختم تھی۔ ایک نظر دیکھنے سے آدمی کی جبلّت اور خصلت کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وسخن کا بھی بہت اچھا مذاق رکھتے تھے۔ موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ریاضی اور تاریخ کے بھی ماہر تھے۔ اُن کا عہدِ وزارت نہایت کامیاب ، نہایت شان دار اور نہایت روشن رہا۔ ان کے عہد میں ریاست حیدر آباد نے ہر لحاظ سے نہایت ترقی کی۔ انھوں نے نہایت قابل اور لائق اصحاب کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا ، جو ریاست کی فلاح و بہبود میں اُن کے دست راست تھے اور جن کی امداد اور تعاون سے اُن کو ریاست کے اندر اصلاحات کے رائج کرنے میں بڑی مدد ملی اور دفاتر کا انتظام نہایت باقاعدہ ہوا۔ ریاست میں ریل و تار کی آمد اُن ہی کی یادگار ہے۔[۲۴]

سر سالار جنگ کو ہندوستان کے باشندے بلاتشخیص قوم و مذہب کے اپنے ملک اور قوم کا فرد اور باشندگان یورپ ''ہندوستان کا بسمارک'' سمجھتے تھے۔ہندوستان کی سرزمین نے اکبر بادشاہ کے بعد اس پائے کا مدبّر نہیں دیکھا تھا۔۱۸۵۷ء کے موقع پر میر تراب علی نے فقط ۲۳ برس ہی کی عمر میں وہ کام کیے کہ اُس کے دوست اور دشمن ہم قوم اور اجنبی اُس کی حُسن تدبیر اور خوش انتظامی کے قائل ہو گئے۔تھوڑی سی مدت میں حیدرآباد جیسی ریاست کو میر تراب علی نے اپنے حُسن انتظام سے ایسا مہذب اور مرفہ الحال بنا دیا تھا کہ وہ تمام ہندوستان کی ریاستوں کے لئے نمونہ بن گئی تھی۔[۲۵]

آغا محمد ابراہیم

آغا محمد ابراہیم مولانا آزاد کے بیٹے ہیں۔مولانا آزاد کے ہاں کل سولہ بچے ہوئے اور خوردسال ہی مر گئے۔صرف ایک لڑکا اور لڑکی عمر طبعی کو پہنچے۔اس کے بعد بیٹی بھی عالمِ جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گئی۔مولانا نے لڑکے کا نام آغا محمد ابراہیم اپنے اُستاد کے نام پر رکھا۔اُستاد کے ادب کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بیٹے کا پورا نام نہ لیتے تھے، ابرو کہتے تھے۔

آغا محمد ابراہیم عرف ابرو ۱۸۶۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مولانا آزاد نے بڑے شوق سے تعلیم وتربیت دی، لیکن آغا محمد ابراہیم کے دل میں علم و ادب سے وابستگی پیدا نہ ہوسکی۔اِنھیں سائنس کا شوق تھا۔ایف۔اے کرنے کے بعد وہ انجینئر نگ کرنے کے لیے رڑکی کالج چلے گئے۔[۲۶] انجینئر نگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بعض حالات کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔اُنھوں نے وہاں سے اوورسیئر ی کی سند لی اور پنجاب میں ملازمت کر لی۔۱۸۹۰ء میں جب مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو اُنھوں نے نوکری چھڑوا کر لاہور اپنے پاس بلا لیا۔وہ یہاں چیف کورٹ میں انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی کے ٹرانسلیٹر، پھر میر مترجم ہوئے، ۱۸۸۷ء میں آغا محمد ابراہیم کی شادی ذکیہ بیگم بنت سید افضل حسین دہلوی سے ہوگئی۔آغا محمد ابراہیم عرصے تک لاہور ہائی کورٹ سے وابستہ رہے۔اس کے بعد وہ منصف ہو گئے تھے اور انتقال کے وقت گڑھ شنکر میں منصف تھے۔دسمبر ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔آغا محمد ابراہیم کے یہاں کل نو بچے ہوئے۔پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں۔لڑکوں کے نام آغا محمد اسمٰعیل آغا محمد یوسف، آغا محمد طاہر، آغا محمد باقر اور آغا محمد اشرف ہیں۔[۲۷]

ناصر نذیر فراق دہلوی

مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوب الیہ میں سے ایک اِن کے شاگرد ناصر نذیر فراق دہلوی ہیں۔ ناصر نذیر فراق دہلوی خواجہ میر دردؔ کے نواسے ، میر محسن علی کے بیٹے ہیں ان کی ولادت ۱۸۶۵ء میں ہوئی۔ نظم و نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے مولانا محمد حسین آزاد اِن کی نظم و نثر کی بہت تعریف کرتے تھے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کے کمالات کا بہت کم اعتراف کرتے ہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو اُن کی کاوشوں اور کامیابیوں کو محض اپنی اصلاحوں کے ذریعے سے اس طرح روشناس کراتے ہیں کہ در پردہ خود انہیں کے کمالاتِ ذاتی کا اشتہار ہوتا ہے۔آزاد ایسا بالکل نہیں کرتے تھے وہ اپنے شاگردوں کی کھل کر تعریف کرتے تھے ۔ ناصر نذیر فراق دہلوی کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

> میں دیکھتا ہوں تمھاری نثر تمھاری نظم سے زیادہ مزے دار ہو چلی ہے۔ خدا رکھے دلی کے رہنے والے اور خواجہ میر درد کے نواسے ،تم سلیس اُردو نہ لکھو گے تو اور کون لکھے گا ۔۲۸

نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم میں ناصر نذیر فراق دہلوی کا ذکر اس طرح ہے:

> خواجہ میر درد کی یادگار اور مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ دہلی میں خواجہ میر درد کی بارہ دری کے ایک گھروندے میں رہتے تھے۔ بقول شاہد احمد مدیر ساقی ''سرخ و سپید رنگ، سفید کھلواں داڑھی ، گول چہرہ ، بھاری ڈیل ، انگشیا ننگدے پڑا ہوا فرغل ، سر پہ کبھی صافہ کبھی ٹوپی ، پاؤں میں سلیم شاہی ، ہاتھوں میں رعشہ تھا اور بہت تھا مگر خود ہی لکھتے۔ ان کی تحریر قسمت کی تحریر ہوتی تھی۔ کہ پڑھنے میں نہ آتی تھی'' وہ مخزن کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جب مخزن بند ہوگیا تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا ، پھر ساقی کے لیے انھوں نے ''لال قلعہ کی جھلک'' قسط وار لکھی، بڑی پیاری زبان لکھتے تھے مگر آپ کی اکثر تصانیف

شائع نہ ہو سکی۔سر عبد القادر کی فرمائش پر ایک ناول المورکھا'' لکھنا شروع کیا تھا۔ مخزن بند ہوا تو اُن کی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ پھر اور لوگوں کے اصرار پر اُسے مکمل بھی کر لیا مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی البتہ مولانا محمد حسین آزاد کی نا تمام تصنیف ''ڈرامہ اکبر'' کی تکمیل اُن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔آپ کی پیدائش ۱۶ اگست ۱۸۶۵ء کو اور انتقال ۱۲ فروری ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ چند تصانیف کے نام یہ ہیں۔

میخانہ درد، دلّی کا آخری دیدار، دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ، مضامین فراق، بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، چار چند، دکن کی پری اور سات طلاقنوں کی کہانی وغیرہ۔[۲۹]

ناصر نذیر فراق دہلوی اُردو بڑی رواں، شیریں، سادہ اور خاص بیگماتی لکھتے تھے۔سید ناصر نذیر فراق کا بیان ہے کہ مولانا ایک مرتبہ دہلی آئے تو اُن کے والد نے فراق کو مولانا کے قدموں پر لا ڈالا اور عرض کی کہ اسے آزاد ثانی بنا دیجیے، مولانا نے فراق کو گلے سے لگایا اُن کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔فرمایا سید صاحب آپ نے یہ کیا کیا۔سید زادے کو مجھ گنہ گار کے قدموں پر ڈال دیا۔اس کے بعد پوری توجہ کا وعدہ کر کے اصلاح کا سلسلہ جاری کر دیا۔[۳۰] فراق نے اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کے نامکمل ڈراما اکبر کی تکمیل بھی کی تھی۔

آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد لکھتے ہیں:

ریختہ کے مالک میر درد کا نام انہی سے روشن ہے۔دہلی میں خواجہ میر درد کی بارہ دری میں ہی مسکن ہے درویشانہ اور رئیسانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار نہ ہوگا جس نے فخریہ اِن کے مضامین درج نہ کیے ہوں۔کئی موٹے موٹے تاریخی ناول یادگار ہیں۔[۳۱]

ناصر نذیر فراق آزاد سے آخری ملاقات کا حال لکھتے ہیں۔

۱۹۰۹ء میں یکا یک خیال آیا کہ ایک بار لاہور چل کر مولانا کی زیارت کر لو ایسا نہ ہو خدانخواستہ مولانا اس جہان سے رحلت کر جائیں اور یہ آنکھیں آخری دیدار سے بھی محروم رہیں۔ اس خیال کا آنا اور میرا بارہ مارچ کو لاہور چل دینا۔ انارکلی محمد شفیع کی سرائے میں ٹھہرا۔ تیرہ مارچ اکبری دروازے مولانا آزاد کی دولت سرا پر پہنچ گیا۔ ایک پنساری مولانا کے امام باڑے کے نیچے ہی دوکان میں بیٹھتا ہے میں نے اس سے پوچھا آغا محمد ابراہیم صاحب کہاں ہیں، اس نے کہا وہ تو جگراؤں میں ہیں۔ میں نے کہا ان کے کوئی صاحب زادے، کیا آغا محمد یوسف گھر میں ہیں۔ پھر میرے دستک دینے پر آغا محمد یوسف مرحوم کوٹھے پر سے نیچے اُتر آئے، وہ مجھے کیا پہچانتے دیکھا نہ بھالا۔ پھر میں نے اپنا مدعا سنایا کہ آپ کے دادا جان کی قدم بوسی کے لیے دہلی سے آیا ہوں، فرمایا امام باڑے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ گئے استاد امام باڑے کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور جس ہیئت سے بیٹھے تھے، اُسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے، ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجامہ تھا، سر پر مغلیَ وضع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی۔ ایک بوریے پر بیٹھے تھے، ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتے تھے اور اسے منہ میں رکھ لیتے تھے اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے، بوریے کے اِدھر اُدھر کچھ راکھ کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا۔ میں نے کہا سبحان اللہ یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے آب حیات میں سید انشاء اللہ کے آخری دور میں لکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا تم کون ہو۔ میرے نام بتانے پر فرمانے لگے، بھئی میں تمھیں نہیں پہچانتا، میں نے کہا میں آپ کا شاگرد ہوں۔ فرمایا اچھا! اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تو لے آؤ۔ میں نے اُسے بڑی سعادت سمجھا، دوڑا دوڑا گیا۔ گرم جلیبیاں تو نہ ملیں ٹھنڈی لایا اور سامنے رکھ دیں، ایک جلیبی اُٹھائی اور فرمایا بھلا میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے ٹھنڈی جلیبیاں کب کھائی جائیں گی اچھا اٹھا لو، میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے۔ آغا محمد یوسف نے کہا زیادہ نہ کہیے نہیں تو بُرا بھلا کہیں گے، پھر کہا اچھا جاؤ یہاں سے، میں

اور آغا صاحب امام باڑے سے صدر دروازے میں آکر ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ آغا صاحب نے پان سے تو اضع فرمائی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ خلال کرتے ہوئے امام باڑے سے چلے آتے ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا ہیں بھئی تم کب دلی سے آگئے، واللہ میں نے تمھیں اس وقت نہیں پہچانا تھا یہ کہہ کر تخت کے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے ، مسکرانے لگے میں نے کہا آپ نے مجھے پہچان لیا فرمایا ہاں میاں تمھارا نام سید ناصر نذیر ہے۔ اس بات کو سُن کر میں بہت خوش ہوا اور آغا یوسف بھی حیران ہو گئے میں نے حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا۔ میں نے ایک تازہ سلام کہا ہے ، وہ سنانا چاہتا ہوں ،فرمایا پڑھو۔ میں نے سلام پڑھنا شروع کیا جو شعر پسند آتا تھا اُس پر خوش ہو کر فرماتے تھے۔ یہ خوب کہا ہے اور جو پسند نہ آتا تو فرماتے یہ کچھ نہیں ہے۔ جب میں نے سلام کا مقطع بھی پڑھ دیا تو فرمایا تمھارا سلام تو بہُت ہی اچھا ہے مگر کہیں کہیں جو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ نہیں ، یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے۔ میں نے کہا درست ہے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مگر کبھی کبھی بے ڈھنگے پن کی بھی کہہ جاتے تھے ، پھر یکا یک اُٹھے اور بازار کی طرف چل دیئے۔ پھر زندگی میں مولانا کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔[۳۲]

منشی ذکاء اللہ صاحب

منشی صاحب شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلی کی مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جن پر بقول آغا محمد طاہر مسلمان ہزاروں سال فخر کریں

گے۔ ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی کے کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔[۳۳] اِن کے والد کا نام ثناء اللہ تھا اور دادا مولوی محمد بقااللہ حافظ قرآن تھے۔ اِن کا سلسلہ نسبت حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ اسی نسبت سے ان کا خاندان شیخ صدیقی کہلاتا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے ابتدائی دور میں اِن کے آباؤ اجداد ، غزنی سے ہجرت کرکے لاہور آگئے اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور سے دہلی ہجرت کر گئے ۔ مولوی ذکاء اللہ کے اجداد مغلیہ شہزادوں کے معلم تھے ان کے والد مرزا کوچک سلطان کے اتالیق تھے

مولوی ذکاء اللہ کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا اہتمام اُسی انداز سے ہوا جو ایک صدی قبل کے خالص مسلمان گھرانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔

اور یہ خانوادہ چونکہ عرصہ دراز سے امیر تیمور گورگانی کے شاہی خاندان کا اتالیق چلا آرہا تھا، لہٰذا مولوی ذکاء اللہ کے لیے بھی اُسی قسم کی تعلیم وتربیت درکار تھی جو انھیں آیندہ چل کر اس عہدے کا اہل ثابت کرسکتی۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ چھ برس کی عمر میں شیخ سعدی کی مشہور عالم کتاب ''گلستان'' پڑھنی شروع کر دی تھی۔ بارہ سال کی عمر تک گھریلو تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر ۱۸۴۴ء میں دہلی کالج میں داخل ہوگئے جہاں انھیں چھ سال تک تعلیمی وظیفہ ملتا رہا۔ اسی کالج میں مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد بھی زیرِ تعلیم تھے جو مولوی ذکاء اللہ کے گہرے دوست تھے۔ تمام علوم میں انھیں ریاضی، سائنس اور علم ادب سے زیادہ شغف تھا۔ فارسی ادب میں مولوی امام بخش صہبائی اور ریاضی میں ماسٹر رام چندر ان کے استاد تھے اور اپنے اِس لائق شاگرد پر خاص توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ ان شفیق اساتذہ کی توجہ اور اپنی محنت کی بدولت سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی انھوں نے دہلی کالج کی تعلیم مکمل کر لی۔

تعلیم سے فارغ ہوکر اِسی کالج (دہلی کالج) میں معلّمِ ریاضی تعینات ہوگئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات برس تک معلّمِ فارسی و اُردو رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنائے گئے اور گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں نارمل سکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ تین سال کے بعد اورینٹل کالج میں لیکچرر کے طور پر تقرری کے لیے پروانہ آیا مگر اس کے ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری بھی آپ کو پیش کی گئی۔ چنانچہ آپ نے الہ آباد کو ترجیح دی اور پندرہ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی۔ ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ پہلے انھیں ''خان بہادر'' اور ''شمس العلما'' کے خطاب دیے گئے۔ مولوی ذکاء اللہ کی محنت اور فرائض منصبی کے ساتھ لگن کا یہ عالم تھا کہ چھتیس برس کی پوری مدت ملازمت میں وہ صرف سولہ دن رخصت پر رہے۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد مولوی ذکاء اللہ ایک سال تک سرسید کے ہاں علی گڑھ میں مقیم رہے اور مجوزہ کالج کے معاملات میں ان کی مدد کرتے رہے۔ بعض تذکرہ نگار یہاں تک لکھتے ہیں کہ سرسید کو انگریزی کتابوں کے ترجمے شائع کرنے کا مشورہ بھی مولوی ذکاء اللہ نے دیا تھا، جس کے نتیجے میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔مولوی ذکاء اللہ کے بیٹے مولوی عنایت اللہ کو سرسید نے عرصہ دراز تک اپنے پاس رکھا اور اپنے بیٹوں کی طرح ان کی تربیت کی۔ سرسید کے ساتھ مولوی ذکاء اللہ کے عقیدت مندانہ اور دوستانہ تعلقات ان کی آخری عمر تک برقرار رہے۔ جب تک سرسید زندہ رہے ، مولوی ذکاء اللہ کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے عظیم مشن سے وابستہ رہے اور سرسید نے بھی ان کی عقیدت کا جواب محبت سے دیا۔

مولوی ذکاء اللہ کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ انھوں نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہزاروں صفحات لکھے لیکن ان کے سوانح نگاروں کی متفقہ رائے ہے کہ مولوی صاحب کے تصنیفی کام میں افکارِ عالیہ کی چمک اور روشنی کم ہے۔ان کے دوسرے ہم عصر مصنفین نے علم و ادب کی دنیا میں جو شہرت اور ناموری حاصل کی وہ مولوی ذکاء اللہ کے حصے میں نہ آسکی۔ انھیں خود بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ ہر لحاظ سے ایک اوسط درجے کے مصنف ہیں۔انھوں نے ریاضیات ، تاریخ و جغرافیہ ، ادب ، اخلاقیات ، طبعیات ، سیاستِ مُدن ، ہیئت وغیرہ متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا۔ موضوعات کے اسی تنوع کے پیشِ نظر مولانا حالی کہا کرتے تھے کہ ذکاء اللہ کی مثال بنیے کی دکان کی ہے ، جس نے جو چیز مانگی ، مل گئی۔

مجموعی طور پر انھوں نے ستر ہزار صفحات کے قریب لکھے جو ڈیڑھ سو جلدوں میں چھپے۔ دس ہزار صفحات مضامین و مقالات کی شکل میں الگ شائع ہوئے جو کئی ضخیم جلدوں کے برابر ہیں ، مولوی ذکاء اللہ نے سب سے پہلے ہندوستانی کھیلوں ، یعنی تاش ، شطرنج وغیرہ پر ایک کتاب لکھی۔ دوسری تصنیف ریاضی کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جو چھپ کر تین دن کے اندر دہلی میں بک گئی ؛ اُس وقت

ان کی عمر اُنیس سال سے کم تھی۔ انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' ''سائنٹفک گزٹ'' ''حسن'' ''حیدرآباد، علی گڑھ، ''ادیب'' خیر آباد، ''معارف'' ''کانپور'' ''مخزن'' لاہور اور'' زمانہ'' کے علاوہ متعدد رسائل میں مضامین لکھے۔اُردو کے مصنفین میں یہ واحد شخص ہیں جن کی زبان نے ان کی تالیفات وتراجم کے کم و بیش ستر ہزار صفحات میں ایک لفظ کے لحاظ سے بھی کوئی غلطی نہیں کی اور بیس برس کی عمر سے پچھتر سال کی عمر تک یہ علمی شغل جاری رہا۔جس دیوار کے ساتھ سر کی ٹیک لگا کر لکھا کرتے تھے وہاں ایک گڑھا پڑ گیا تھا۔ انھوں نے ریاضیات کے موضوع پر ستاسی ، تاریخ وجغرافیہ پر اٹھارہ ، علم ادب پر سولہ ،علمِ اخلاق پر چھ ،طبیعیات و ہیئت پر نو اور سیاستِ مُدن پر سات کتابیں لکھیں۔ ابھی کئی ہزار صفحات پر مشتمل مسودات صندقوں میں غیر مطبوعہ رکھے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ مولوی ذکاء اللہ کے تمام تصنیفی کام میں ان کی کتاب ''تاریخ اسلام'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اُردو زبان میں اسلامی تاریخ کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے حالات و کوائف نہایت شرح و بسط کے ساتھ ، تمام فارسی اور انگریزی تاریخوں سے لے کر تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض جلدیں ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ منشی ذکاء اللہ نے ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو وفات پائی تھی۔

منشی ذکاء اللہ مولانا محمد حسین آزاد کے ہم وطن ، ہمدرس اور بہت گہرے اور مخلص دوست تھے۔ دونوں کی مراسلت کے بہت سارے مکتوب ضائع ہو گئے ہیں۔ دو خط مولانا کے ان کے نام عالم وارفتگی کے زمانے کے ہیں۔ آزاد کے خاص دوستوں میں سے ہیں اور ان کے تعلقات ساری عمر رہے۔ جب آزاد عالم جنون میں خاک اُڑاتے پیدل دہلی پہنچے تو منشی ذکاء اللہ نے دوستی کا حق ادا کیا۔ مدتوں انہیں اپنے ہاں مہمان رکھا ور ایسی ناز برداریاں کیں کہ اُن کی مثال نہیں ملتی خود اور سارا گھر گویا ان کے حکم کے پابند ہوتے تھے۔منشی ذکاء اللہ کے نام لکھے گئے دونوں خط مولانا کے عالم وارفتگی کے زمانے کے ہیں جس میں مولانا نے اپنی جسمانی اور دماغی کیفیت کی اِطلاع اپنے پیارے دوست کو دی ہے اور واردات قلبیہ بھی لکھے ہیں۔

آغا سلمان باقر لکھتے ہیں:

کالج میں آزاد کو مولوی نذیر احمد ، منشی ذکاء اللہ اور خواجہ ضیاء الدین جیسے ہم جماعتوں سے واسطہ پڑا اور یہی ان کے دوست بھی تھے۔ جو بعد میں سب کے سب شمس العلماء ہوئے لیکن ہندوستان میں سب سے پہلا شمس العلماء کا خطاب پھر بھی آزاد ہی کو ملا۔ یہ تمام طالب علم اپنی ذہانت اور براقی طبع کے لیے کالج بھر میں مشہور تھے۔[۳۴]

منشی ذکاء اللہ کی حالی سے بھی دوستی تھی۔ حالی کے ایک شاگرد انوار الحق ادیب آزاد کے خلاف پنجابی اخبار میں مضامین لکھتے تھے اور پنجابی اخبار کے مدیر بھی حالی کے معتقد تھے۔ اس طرح آزاد حالی سے ناراض ہوگئے۔ مولوی ذکاء اللہ کے ایک خط کا اقتباس جو انہوں نے آزاد کو لکھا ، اس سے ان کی دوستی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حالی اور آزاد دونوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ منشی ذکاء اللہ آزاد کو لکھتے ہیں:

مجھ سے کئی دفعہ لوگوں نے کہا یہ صلح آپ کرا دیجیئے لیکن میں نے یہی کہا کہ دل کا حال کپڑوں کا سا نہیں ہوتا کہ دھونے سے ہی صاف ہو جائے جب دل میں کدورتیں آجاتی ہیں تو مشکل سے وہ صاف ہوتی ہیں۔ جب تک مولوی صاحب کا یہ خیال ہے کہ میری نظم کا خاکہ اڑانے کا آپ لوگوں نے قصد کیا ہے جب تک دل صاف نہیں ہو سکتا میرے نزدیک صلح کر لینی مناسب ہے اگرچہ اس کو بقا بہت دنوں تک نہیں مگر اس میں ایک بات ہے اور اس میں آپ کی عالی حوصلگی پائی جاتی ہے۔

فقط

ذکاء اللہ ۱۸۷۴ء [۳۵]

منشی ذکاء اللہ کی دوستی کا ایک اور واقعہ ہے۔

عالم جنون میں ایک دفعہ آزاد پیدل دہلی چلے گئے اور وہاں جا کر منشی صاحب کے

ہاں قیام کیا۔ ایک دن حجام آیا اور منشی جی کی داڑھی بنانے لگا۔ مولانا سامنے بیٹھے دیکھ رہے تھے، ایک دم اُٹھے اور کہا میاں تمھیں خط بنانا بھی نہیں آتا۔ ہٹو پرے منشی جی نے اُسے اشارہ کیا اور وہ الگ کھڑے ہوگیا۔ مولانا نے منشی جی کے بال تراشے اور پھر خط بنایا اور فرمایا منشی جی اب آئینہ دیکھیئے، منشی جی حیران رہ گئے۔ شام کو منشی جی نے اپنے احباب سے اس واقعے کا ذکر کیا، ان میں سے ایک نے کہا منشی جی آپ نے کمال کیا، دیوانے کے ہاتھ میں استرا دے دیا اور آپ صبر و سکون سے بیٹھے رہے۔ اگر مولوی صاحب کا مزاج برہم ہو جاتا اور وہ گلا کاٹ دیتے تو کیا ہوتا۔ منشی جی نے جواب دیا۔ میاں مجھے یقین تھا محمد حسین مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔[۳۶]

اِس سے منشی ذکاء اللہ اور آزاد کی دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ عالم وارفتگی میں آزاد اپنے دوستوں پر شک کرتے تھے مولوی خلیل الرحمان، منشی ذکاء اللہ اور آزاد کے رویے کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

مولوی صاحب کی صبح کی ہوا خوری ایسی حالت میں بھی بند نہ ہوئی ایک روز میں دفتر کو جا رہا تھا ہائی کورٹ کے سامنے جو نکا سڑک پر ہے وہاں دور سے مولانا آتے نظر آئے میں سخت پریشان ہوا کہ برسوں سے نہیں مِلا ہوں دیکھیئے کیسی بنتی ہے۔ مولانا نے مجھے دیکھ لیا اور کھڑے ہو گئے مجھ سے کہنے لگے تم بہت عرصے سے نہیں ملے کہیں باہر گئے تھے کہ یہیں ہو؟ میں نے غور کیا کچھ اور باتیں بالکل ہوش کی کرتے رہے میرے ایک ایک لڑکے کی نام بہ نام خیریت پوچھی پڑھنے لکھنے کو پوچھا۔ میں نے کہا فلاں فلاں نے ایم۔اے کیا ہے اور بی۔اے میں ہے وغیرہ سن کر بہُت خوش ہوئے۔ بہُت مبارک دی عربی پڑھوانے پر زور دیا آدھا گھنٹہ گرفتار رکھا مجھے دفتر کی جلدی۔ شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا کہ آپ کی بھی بہُت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی بس پھر کیا تھا کہنے لگے کہ تو

ایسا بے ایمان پاجی ہے تو نے میری کب خبر لی ، میرے اُوپر کیا کیا بن گئی تو نے کروٹ نہیں لی۔ پاجی پوچھتا ہے بہُت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی ارے تجھے خبر بھی ہے میرے ساتھ کیا دغا ہوئی؟ میں نے پوچھا کہ خیریت ؟ کہنے لگے میرے ساتھ ذکاء اللہ نے پھر دغا کی اس کی ۔۔۔ میں ایک روز ہوا خوری میں دہلی پہنچ گیا۔ ذکاء اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھہرایا مجھے کیا معلوم کہ اس کے دل میں دغا ہے۔ اِس کے مکان کے نزدیک ایک برات آ کر ٹھہری ، مجھ سے کہنے لگے کہ آزادتو بھی برات دیکھ آ ، میں گیا برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا ، آزاد آیا۔ مجھے بڑی خاطر سے دولہا کے پاس بٹھا دیا مجھے کیا خبر کہ ذکاء اللہ نے اس کی ۔۔۔کیا فریب کیا ہے ، اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اورمہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا اور ایسا جکڑا کہ رسوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہو رہا ہے۔جس طرح ہو سکا میں رسوں کوتُڑا کر ابھی چلا آ رہا ہوں ، نہ پوچھیئے کہ مجھے کتنی ہنسی آئی ۔[۳۷]

شمس العلماءمولوی ممتاز علی صاحب

سیدممتاز علی صاحب دیو بند ضلع سہارن پور (ہند) میں ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ءکوعید میلا دالنبی کے روز پیدا ہوئے۔[۳۸] آپ نے علوم اسلامیہ اورتعلیم کے مختلف مراحل دیوبند ، راولپنڈی ، سررشتۂ فیروزپور اور لاہور میں طے کیے ۔آپ مولانا محمد قاسم نان تو ی کے شاگرد اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے ہمدرس تھے۔سرسید احمد خاں ، مولانا الطاف حسین حالی ،شبلی نعمانی ، مولوی ذکاء اللہ ، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے ادب و انشاء میں مولوی محمد حسین آزاد کو اپنا اُستاد مانتے تھے اور اُن کا بے حد تک احترام کرتے تھے۔مولانا آزاد کا رویہ اِن کے ساتھ مشفقانہ اور پدرانہ تھا۔مولانا آزاد ان کوفرزند کے برابر چاہتے تھے اورمولوی ممتاز علی بھی اِن کو باپ کا درجہ دیتے تھے۔ مولوی ممتاز علی کو ۱۸۷۴ء سے انگریزی کا شوق ہوا۔۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۴ء تک گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد بی اے کے

امتحان میں ناکام ہوئے اور۱۸۸۴ء میں پنجاب چیف کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۹۱ء میں اپنی بیماری کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> سید ممتاز علی نہایت جوان صالح، ہونہار، ہوشیار، مؤدب اور لائق شخص تھے اس لیے سر سید ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کو بے حد عزیز رکھتے اور ان کی بہبودی اور ترقی میں نہایت درجہ کوشش اور سعی کرتے رہتے تھے ۔۱۸۸۴ء میں جب سید ممتاز علی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان دیا اور کامیاب نہ ہو سکے، اُسی وقت سے سر سید برابر اس فکر میں لگے رہے کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح سید ممتاز علی کو کوئی بہُت مناسب اور موزوں ملازمت مل جائے۔ اپنی عادت کے بر خلاف سر سید نے کئی جگہ ان کی سفارش کی۔ حیدر آباد دکن بھی متعدد مرتبہ لکھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ سر سید کو اس معاملے میں پوری کوشش کے باوجود کامیابی نہیں ہوئی اور سید ممتاز علی کو کوئی معقول نوکری نہ مل سکی یہ بھی شائد اچھا ہی ہوا کیونکہ قدرت کو ان سے جو کام لینا تھا، وہ ہرگز ظہور پذیر نہ ہوتا اگر سید ممتاز علی ملازمت کے جھنجٹ میں پھنس جاتے۔ بی اے میں فیل ہونے کے بعد اُنہوں نے دوبارہ امتحان دینے اور کالج میں پڑھنے کا خیال چھوڑ دیا اور اسی سال یعنی ۱۸۸۴ء میں پنجاب چیف کورٹ لاہور میں بہ حیثیت مترجم ملازم ہو گئے مگر یہ ملازمت اُن کی دلچسپی کی نہیں تھی۔ اس لئے اُس میں اُن کا جی نہ لگا اور اُس سے دلبر داشتہ رہے اتفاقاً ۱۸۹۱ء میں بہُت سخت بیمار ہو گئے ۔اور اُن کو بہُت بڑا بہانہ اس امر کا ہاتھ آ گیا کہ یہ ملازمت کسی طرح بھی میرے حسب حال نہیں کیونکہ محنت بہُت زیادہ اور تنخواہ بہُت کم ہے اسی لئے صحت پر نہایت ناگوار اثر پڑا ہے یہ بہانہ بہُت کافی اور معقول تھا اس لیے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ [۳۹]

۱۸۸۸ء میں مولوی سید ممتاز علی کی شادی ہوئی۔ ان کی اہلیہ کا نام محترمہ حمیدہ بیگم تھا۔ ان

میں سے دو بچے ایک بیٹی سیدہ وحیدہ بیگم اور ایک بیٹا سید حمید علی پیدا ہوئے۔حمیدہ بیگم تپ دق کی مریضہ تھیں چنانچہ ۱۸۹۵ء کو انتقال کر گئیں۔ ۱۸۹۷ء میں مولوی صاحب کی دوسری شادی محترمہ سیدہ محمدی بیگم سے ہوئی۔محترمہ دہلی کی رہنے والی اور سید احمد شفیع اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی بیٹی تھیں۔سید احمد شفیع سرسید احمد خان کے دوست اور اپنے وقت کے صاحب علم اور ماہر تعلیم تھے۔شادی کے وقت ان کی بیگم کی عمر ۱۹ سال تھی۔

سیدہ محمدی بیگم پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ چنانچہ سید ممتاز علی نے ان کی علمی استعداد سے آگاہی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ خواتین کی ذہنی اور فکری بیداری کے لیے کچھ کرنا چاہیئے۔لہٰذا شادی کے سات آٹھ ماہ بعد ہی سید ممتاز علی نے خواتین کے لیے ایک ہفت روزہ تہذیب نسواں کے نام سے جاری کیا۔جس کی ادارت سیدہ محمدی بیگم کے ذمہ ہوئی۔تہذیب نسواں کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا۔ اِس کے اجراء سے پہلے سرسید احمد خان سے سید ممتاز علی نے مشورہ کیا پہلے تو اُنہوں نے اِس خیال کی سخت مخالفت کی لیکن بعد میں مان گئے اور اس کا نام بھی اُنہوں نے تجویز کیا 'تہذیب نسواں' سید ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء کے آغاز ہی میں ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کا نام ''دارالاشاعت پنجاب'' تھا۔''دارالاشاعت پنجاب'' سے 'پھول' اور کہکشاں بھی جاری کیے۔اور اپنی تصانیف کو بھی متعارف کروایا۔

سید ممتاز علی کو عربی ، فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ اُردو نثر میں تو وہ ایک خاص اُسلوب کے حامل تھے۔ دوران تعلیم مشنری مبلغین کی وجہ سے اسلام کے بارے میں کچھ شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے تو سرسید احمد خاں نے اِنھیں اِن شکوک و شبہات سے نکالا۔سید ممتاز علی نے علمی اور ادبی کتابیں لکھیں۔جن میں اہم کتاب ''تفصیل البیان فی مقاصد القرآن'' ہے مولوی صاحب کا یہ بہُت بڑا علمی اور اسلامی کارنامہ ہے سید ممتاز علی اعلیٰ پائے کے مصنف۔ زبردست انشاء پرداز ، طبقہ نسواں کے محسن ، اسلامیات کے فاضل اور تعلیمات کے ماہر تھے۔آپ مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ کے رکن اور پنجاب یونیورسٹی سینٹ کے ممبر بھی رہے۔۱۹۳۴ء میں آپ کو انگریزی گورنمنٹ

کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔

''حقوق نسواں''، ''سبیل الارشاد''، ''ثبوت واجب الوجود'' ''خزینۃ الاسرار'' اور'' تذکرۃ الانبیاء'' وغیرہ بہت سی علمی ، ادبی ، اصلاحی اور تعلیمی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ دیوبند میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہیں۔

چھ فروری ۱۹۱۰ء کو بزم اُردو لاہور کی طرف سے آزاد کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، اس جلسے میں مولوی ممتاز علی نے ایک مفصل تقریر کی تھی جس میں مولوی ممتاز علی نے آزاد کے جنون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> عالم دیوانگی کے ظہور سے پہلے بھی مولانا پر روحانی جذبات کا غلبہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا بعارضہ فتق بیمار تھے آپ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسری کی خدمت انجام دیتے تھے، رات کے وقت غلبہ مرض کی وجہ سے شدید تکلیف ہوئی ، آدھی رات کے بعد مولوی ممتاز علی صاحب کو اپنے مکان پر بلا بھیجا یہ اسی وقت گئے اور رڈی ۔۔۔حالت دیکھ کر مایوس و پژمردہ خاطر ہوئے، بالآخر دوا دارو کا انتظام کر کے اپنے گھر واپس چلے آئے۔ صبح کو کچھ دِن چڑھے مولانا نے میر صاحب کو پھر بلوایا اُنہوں نے جا کر دیکھا تو بالکل تندرست پایا۔مولانا نے کہا میری صحت یابی کا عجیب واقعہ ہے دل لگا کر سنو:
>
> اِس کرب اور تکلیف کی حالت میں مجھے آسمان پر کچھ آدمیوں کے بولنے کی آواز آئی ۔ میں نے بہُت غور سے سُنا تو اس مجمع میں میرے والد مولوی محمد باقر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوئے ایک اور شخص کسی دوسرے آدمی کو کوئی بات سمجھا رہا تھا مگر وہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی میں نے اپنے والد سے کہا کہ یہ کیا مشکل معاملہ ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا مولوی محمد باقر نے پوچھا کیا تم سمجھ گئے ہو میں نے کہا ہاں سمجھ گیا ہوں ، چنانچہ میں نے ان کو اس کا مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ وہ آدمی جو مسئلہ سمجھا رہا تھا میرے والد سے پوچھنے لگا کہ یہ کون شخص ہے

اُنھوں نے جواب دیا بندہ زادہ ہے یہ سن کر اُس نے کہا تو اسے بھی ساتھ کیوں نہیں لے لیتے مگر میرے والد نے کچھ عذر کر دیا اس کے بعد میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ مجھے پوچھنے والا کون شخص ہے۔ اُنھوں نے کہا حضرت علیؓ ہیں پھر حضرت علیؓ نے فرمایا ۔تم علاج کیوں نہیں کر دیتے۔مولوی محمد باقر نے جواب دیا میں کس طرح علاج کر سکتا ہوں۔حضرت علیؓ نے تدبیر بتائی کہ تم اس کے پیٹ میں اتر کر اس کی انتڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ٹھیک کر دو۔چنانچہ اس کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مولوی محمد باقر میرے پیٹ میں بول رہے ہیں اس کے بعد میں نے اپنے والد سے کہا علاج تو ہو گیا مگر کوئی پرہیز ، انہوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا آپ نے فرمایا ہمارے علاج میں کسی پرہیز کی ضرورت نہیں مگر میں اس پر اصرار کرتا رہا۔آخر اُنھوں نے کہا دہی کے ساتھ تربوز کھایا کرو۔مولوی ممتاز علی صاحب نے کہا کہ اس کے بعد ہم نے مولانا آزاد کے مکان میں تربوز کے چھلکے اور دہی کے دونے اکثر پڑے دیکھے۔[۴۰]

نواب حسین مرزا

نواب حسین مرزا غالب کے بہُت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ اِن کی صاحبزادی کی شادی میر افضل حسین صاحب سے ہوئی تھی۔میر افضل حسین کی بڑی بیٹی ذکیہ کے ساتھ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے بیٹے آغا ابراہیم حسین کی شادی کی تھی۔ میر افضل حسین کے والد نواب تفضّل حسین شاہی زمانے میں بادشاہ کے وکیل تھے۔ جامع مسجد کے قریب حویلی میر تفضّل حسین کے ساتھ ان کی بڑی جائداد تھی جو ۱۸۵۷ء میں ضبط ہوگئی تھی۔اس محلّہ کا نام اب بھی باقی ہے جو وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کے عقب میں واقع ہے۔میر افضل حسین کے صاحب زادے میر محمد حسین ، نواب حسین مرزا کے نواسے دہلی کی یادگار ہستیوں میں سے تھے۔ دہلی کے مشہور سوشل ورکر ، میونسپل کمشنر ، دہلی یونیورسٹی کے فیلو اور یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر اور دہلی تحریک کالج کے سیکرٹری تھے۔اُنہوں نے دہلی تحریک سکول کو انٹر کالج اور ڈگری کالج بنوایا۔ملک و قوم کی بے لاگ خدمات

انجام دیتے ہوئے ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔[۴۱]

حاجی بنے صاحب

حاجی بنے صاحب دہلی کے رئیس اعظم تھے۔ ان کے دوستانہ تعلقات مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کی جائیداد ضبط ہوگئی تھی اس کے سلسلے میں ایک عرصہ تک مقدمہ بازی ہوتی رہی۔ جب ان کے مقدمات چیف کورٹ لاہور میں آتے تو انھیں اکثر اِن مقدمات کی پیروی کے لیے لاہور آنا پڑتا تھا۔ حاجی بنے صاحب لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد کے ہاں بھی اکثر ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کی سرائے دہلی صدر بازار میں اب تک مشہور ہے۔[۴۲]

بقول آغا محمد باقر:

> اس زمانے میں اُنہوں نے مولانا سے کبھی ڈھائی سو روپیہ قرض لیا تھا اور وہ کسی سبب سے ادا نہ کر سکے۔ ۱۹۲۷ء میں ان کے پوتے نے میرے ماموں میر محمد حسین آزاد سے آکر کہا کہ اِن کے ذمے مولانا آزاد کا قرضہ تھا، وہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ یہ رقم اُنہوں نے ادا کر دی۔[۴۳]

میاں نوشاہی

میاں نوشاہی جی حضرت فیض حامد عرف حضرت مکھن شاہ نوشاہی مقیم موچی دروازہ لاہور ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹ شعبان ۱۳۳۴ھ مطابق ۲۲ جون ۱۹۱۶ء کو وفات پائی۔[۴۴]

نوٹ: اس سے زیادہ نوشاہی جی کے متعلق کچھ نہیں مل سکا۔

محرم علی چشتی

محرم علی چشتی ۶ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۳ جون ۱۸۶۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔محرم کے مہینے میں پیدا ہوئے تھے اِس مناسبت سے ان کا نام محرم علی رکھا گیا۔ مولوی یکدل نے تاریخ ولادت درج ذیل قطعہ میں اِس طرح کہی:

بفضلِہٖ چوں محرم علی ولادت یافت
ششِ محرم و یکشبنہ بود از میلاد
ششِ محرم و یکشبنہ نیز شد تاریخ
مبارک است عزیزاں بتاں مبارک باد[۴۵]

لیکن سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی نے تاریخ پیدائش ۱۱ اگست ۱۸۶۴ءلکھی ہے۔[۴۶] روزنامہ احسان'' بابت ۲۱ دسمبر ۱۹۱۴ء میں بھی محرم علی چشتی کی تاریخ ولادت ۱۱ اگست ۱۸۶۴ء درج ہے۔ جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان کی تاریخ ولادت ۶ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۳ جون ۱۸۶۳ء ہی درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ مولوی نور احمد نے '' تحقیقات'' کے سالِ آغاز ۱۸۶۴ء میں مولوی محرم علی کے بارے میں لکھا ہے کہ'' دوسرا بھائی محرم علی جو ابھی خرد یک سالہ ہے۔ ان کے والد کا نام مولوی احمد بخش یکدل چشتی تھا۔ مولوی محرم علی مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے ان کے بڑے بھائی مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی اور یادگارِ چشتی وغیرہ تھے منجھلے بھائی مولوی محمد علی پُر دِل تھے جو اپنے فارسی کلام اور مادہ ہائے تاریخ کے سبب اپنے زمانے کے نامور شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ اِن کے والد مولوی احمد بخش یکدل چشتی کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے فخر الشعراء کا خطاب دیا تھا اور یہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور فاضل تھے۔

مولوی محرم علی چشتی نے علی گڑھ کالج سے بی اے کیا اِنہوں نے تعلیم سے فارغ ہو کر

۵ جنوری ۱۸۸۴ ء کو رفیق ہند جاری کیا۔ رفیق ہند کا افتتاحی مقالہ سر سید احمد خان نے لکھا تھا۔ مولوی محرم علی چشتی تحریک پاکستان کے سرگرم رکن ،منفرد صحافی اور اعلیٰ پائے کے ادیب تھے طبیعت کے بہت تیز تھے۔ بہت جلد حامی اور بہت جلد سخت مخالف ہو جاتے تھے انتہا پسند تھے جب سر سید لاہور آئے تو مولوی محرم علی نے اُن کی پُر زور حمایت کی لیکن جلد ہی بعد میں اُن کے سخت مخالف ہو گئے ۔مولوی محرم علی چشتی نے عمر کے آخری حصے میں وکالت کا امتحان دیا پاس ہو گئے اور وکالت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ وکالت شروع کی تو ان سے عدالتیں بھی گبھرانے لگیں۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی قائم علی چشتی تھے جن کی تربیت پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف والوں نے کی تھی اور اِنھیں فاضل لاہوری کا خطاب عطا ہوا تھا۔ چھوٹے بیٹے مولوی ابراہیم علی چشتی تھے جنھوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مولوی محرم علی چشتی مولانا آزاد کے شاگرد تھے ان کا بہت احترام کرتے تھے اور زندگی بھر ان کا احترام کرتے رہے مولانا آزاد کے زبردست مداح تھے۔ مولوی محرم علی چشتی مولانا محمد حسین آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم عرف ' ابرو' کے ہمدرس تھے۔ اس لحاظ سے مولانا آزاد اِنھیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے ،مولوی محرم علی چشتی بھی مولانا آزاد کو بے حد احترام دیتے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی بہت ساری تحریریں '' رفیقِ ہند'' میں شائع کروائیں۔

محرم علی چشتی کی وفات ۸ دسمبر ۱۹۳۴ء میں ہوئی ،[۴۷] لیکن ان کی تاریخ وفات پر بھی اختلافات ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر نے لکھا ہے''مولوی محرم علی چشتی کی وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔''[۴۸] مولوی محبوب عالم لکھتے ہیں '' آپ نے ۱۸ دسمبر ۱۹۳۶ء کو وفات پائی''[۴۹] اور یہی تاریخ وفات درست معلوم ہوتی ہے مولوی محرم علی چشتی نے رفیق ہند اخبار ، دیوانِ اشعار (ارمغان چشتی) کے علاوہ '' اسلامی زندگی کا دنیوی پہلو'' اُردو نثر میں یادگار چھوڑے ہیں۔

پنڈت گوپی ناتھ

پنڈت گوپی ناتھ پنڈت مکندرام کے بیٹے اور پنڈت گوبند سہائے کے بھائی ہیں۔ پنڈت مکند رام نے اردو صحافت کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۳۱ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے۔سولہ سال کی عمر میں لاہور چلے آئے۔یہاں انہوں نے خوشنویسی کا فن سیکھا اور ''کوہ نور'' میں کتابت کا کام کرنے لگے۔ ذاتی شوق اور محنت سے انگریزی، فارسی اور سنسکرت پر عبور حاصل کیا۔ وسائل نہ ہونے کی بنا پر بے سروسامانی کے عالم میں متر بلاس پریس جاری کیا۔ پنڈت گوپی ناتھ باصلاحیت تھے اور اخبار نویسی سے دلچسپی بھی تھی لہٰذا دونوں باپ بیٹوں نے مل کر ''اخبار عام'' جاری کیا۔

پنڈت مکند رام نے پنڈت گوپی ناتھ کے تعاون سے تین اخبارات نکالے'' ہمائے پنجاب'' جو یکم اپریل ۱۸۷۰ء کو جاری ہوا۔ ایک ہندی اخبار'' متر بلاس'' جو کم و بیش ۲۰ سال تک شائع ہوتا رہا اور''اخبار عام'' جو یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو منظر عام پر آیا۔'' اخبار عام'' کے ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ تھے جب مکند رام ۱۸۹۷ء میں انتقال کر گئے تو ان کے دونوں بیٹوں نے اخبار کا نظم ونسق سنبھالا۔ پنڈت گوپی ناتھ بے باک اور حق گو انسان تھے۔[۵۰]

مجموعی جائزہ اور سفارشات

مکتوبات کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی مکتوبات کی ادبی اہمیت کسی طرح بھی تخلیقی کارناموں سے کم ہے۔فن تاریخ کے نقطہ نظر سے بھی ان کی اہمیت مسلّم ہے۔مکتوبات کے ذریعہ ہم مکتوب نگار کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اس کو چلتا پھرتا اور اپنے کاموں میں مصروف پاتے ہیں۔مکتوبات لکھنے والے کی ذات اور اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں مکتوب نگار کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے مکتوب شائع ہوں گے اس لیے وہ مکتوبات میں احتیاط اور اہتمام سے کام نہیں لیتا اس طرح مکتوبات اس کی زندگی کے بعض ایسے رخ کو بھی نمایاں طور پر ظاہر کر دیتے ہیں جس کو وہ ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو۔کبھی کبھی مکتوبات کے ذریعہ وہ اپنے بے تکلف اور عزیز دوستوں کو ایسی راز کی باتیں بھی بتا جاتا ہے جس کا ظاہر کرنا وہ مناسب نہ سمجھتا تھا۔مکتوبات ہی کے ذریعہ بعض مشاہیر کے راز فاش ہوئے ہیں ان کے دل کی باتیں اور جذبات و کیفیات کاغذ کے پرزوں کے ذریعے اُن کے مخاطبوں تک ہی نہ محدود رہیں بلکہ ان مکتوبات کے ذریعہ دوسرے لوگ بھی ان کی دلچسپ داستانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اُردو ادب میں مولانا شبلی نعمانی کے مکتوب عطیہ کے نام مکاتیبی ادب کا نہایت قیمتی اثاثہ ہیں جس کی مدد سے مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت اور اُن کی نفسیات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔اس طرح مکتوبات سوانح لکھنے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

مرزا غالب کے مکتوبات اُردو کے مکاتیبی ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔مکتوبات زمانے کے حالات اور واقعات کا ایک اچھا مرقع ہوتے ہیں۔ ان میں مکتوب نگار کے حالات ، ماحول ، مختلف مسائل اور خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور اس کی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں پر بے لاگ تنقید کرتا ہے بلکہ خود اس کے مشاغل اوراپنے متعلق خیالات اُس کے مکتوبات میں ملتے ہیں۔ اس طرح مکتوب نگاری تنقیدی ادب میں بھی اضافہ کرتی ہے اور انشاء پردازی میں

بھی اپنا مقام رکھتی ہے۔مولوی محمد حسین آزاد کو اُردو زبان و ادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ارکان خمسہ کے اہم ارکان میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔مولوی محمد حسین آزاد کے مکتوبات بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں ان مکتوبات کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے سے مطالعہ آزاد میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے ۔اُردو ادب میں مولوی محمد حسین آزاد کا مقام بحیثیت مکتوب نگار متعین کیا گیا ہے اور ان کے مکتوبات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ان مکتوبات کے مطالعے سے ہم مولوی محمد حسین آزاد کی زندگی کے بہت سے مخفی پہلوؤں سے بھی روشناس ہوتے ہیں جس سے مکتوبات کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مکتوبات کی درج بالا ادبی اہمیت اور افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ دور حاضر اور ماضی قریب میں جن لوگوں نے مکاتیب لکھے ہیں مثال کے طور پر مشفق خواجہ ، حافظ محمود شیرانی وغیرہ ایسے محققین کے مکتوب بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کے مکتوبات مرتب کروائے جائیں۔

۲۔ بھارت کے محققین اور دانشور جن کے مکاتیب ابھی منظر عام پر نہیں لائے گئے ہیں ۔مثلاً مالک رام ،عرشی رام پوری وغیرہ کے مکتوبات بھی مرتب کروائے جائیں تا کہ ان کی روشنی میں ان محققین کی تحقیقی کاوشوں کو بہتر طور پر جانا جا سکے۔

۳۔ جدید عہد کے شعراء اور ادبی شخصیات کے مکتوبات تلاش کیے جائیں انھیں نہ صرف شائع کیا جائے بلکہ ان پر تحقیقی کام بھی کروائے جائیں مثلاً معاصرین اقبال میں فیض احمد فیض ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ کے مکاتیب مرتب کروائے جائیں۔

۴۔ اہم مکتوب نگار شخصیات کے مکتوبات کے مجموعے شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان

کے نام آئے ہوئے دوسروں کے مکتوبات بھی جمع کر کے مرتب کئے جائیں تا کہ

وہ مباحث جو ان کے مکاتیب کی وجہ سے منظر عام پر آئے ہیں اُن کا مقصد واضح ہو سکے۔

۵۔ اہم مکتوب نگاروں کے مکتوبات کو تعلیمی سطح کے نصاب میں مناسب نمائیندگی دی جائے تا کہ اُن مکتوبات کے ساتھ ساتھ مکتوب نگاروں کی اہمیت بھی اجاگر ہو سکے۔

۶۔ مکتوب نگاری کی صنف آنے والے زمانے میں نا پید ہوتی دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس کی جگہ جدید مواصلات مثلاً موبائیل فون ، ایس ایم ایس ، ای میل نے لے لی ہے اس لیے اس صنف کو محفوظ کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱ مرتضیٰ فاضل حسین لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزادؔ'' از مولانا محمد حسین آزاد، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء، ص۱۳۳۔

۲ ایضاً ، ص ۸۹

۳ ایضاً ص۱۰۲

۴ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد، ''مکتوبات آزادؔ'' ، نظام الدین گیلانی پریس لاہور ، ۱۹۲۷ء ، ص ۱۳۸

۵ ''مکاتیب آزادؔ'' ، ص ۴۸

۶۔ ''مکتوبات آزادؔ'' ، ص ۲۲۰

۷ ایضاً ، ص ۲۲۰

۸ ایضاً ، ص ۲۲۱

۹ ''مکاتیب آزادؔ'' ، ص ۴۸

۱۰ اسلم فرخی ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف''، انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی، ۱۹۶۵ء ، ص ۱۴۰

۱۱ ایضاً ص ۱۳۹۔۱۴۰

۱۲ سی۔ای، بک لینڈ، ''ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی''، فرسٹ ایڈیشن ان پاکستان، ۱۹۷۵ء ، البرونی لاہور، ص ۲۴۹

۱۳ محمد حسین آزاد حیات و تصانیف ، جلد اوّل ، ص ۱۴۸

۱۴ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۴۳

۱۵ محمد حسین آزاد حیات و تصانیف ، جلد اوّل ، ص ۱۴۳

۱۶ ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی ، ص ۲۵۰

۱۷ ''مکتوبات آزاد'' ، ص ۱۳۸۔ ۱۳۹

۱۸ ''مکاتیب آزاد'' ، ص ۱۵۰

۱۹ سلطان محمود حسین ، سید ، ڈاکٹر ، ''تعلیقات ۔خطبات گارساں دتاسی''
مجلس ترقی ادب کلب روڈ ، لاہور طبع اوّل ۱۹۸۷ء ، ص ۲۲۷

۲۰ ''مکاتیب آزاد'' ، ص ۴۲

۲۱ ''تعلیقات ۔خطبات گارساں دتاسی'' ص ۳۰۳

۲۲ ایضاً

۲۳ ''مکاتیب آزاد'' ص ۱۸۳

۲۴ محمد اسماعیل پانی پتی ، شیخ ، مکتوبات سر سید جلد اوّل ، مجلس ترقی ادب لاہور
طبع ثانی جون ۱۹۷۶ء ، ص ۲۲۹

۲۵ ''اخبار انجمن پنجاب ، پنجاب یونیورسٹی'' نمبر ۸ جلد ۱۴ مطبوعہ ۲۴ فروری ۱۸۸۳ء
ص ۱۳

۲۶ ''مکاتیب آزاد'' ، ص ۹۱ نیز ۲۱۷

۲۷ ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' ص ۳۹۵ نیز آغا سلمان باقر بالمشافہ گفتگو

۲۸ مکاتیب آزاد، ص ۲۶۱

۲۹ نقوش مکاتیب نمبر (جلد دوم)، ص ۹۴۵

۳۰ ''مکاتیب آزاد'' ، ص ۲۵۹

۳۱ ''مکتوبات آزاد'' ، ص ۱۳۹

۳۲ محمد صادق، ڈاکٹر، ''آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین''
مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۵۔ ۱۲۷

۳۳ احمد رضا، ''محاسن الاخلاق'' از شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ،
مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۵ء، ص ۱۵

۳۴ آغا سلمان باقر، ''محمد حسین آزاد حیات، شخصیت، فن''، سنگ میل
پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء ، ص ۳۷

۳۵ ''محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف''، نیز ''نقوش مکاتیب نمبر'' ص ۱۳۲

۳۶ ''مکاتیب آزاد'' ، ص ۱۰۱

۳۷ ''آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین'' ص ۱۲۳۔۱۲۴

۳۸ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ''پاکستانی ادب کے معمار سید امتیاز علی تاج''
شخصیت اور فن، ۱۹۹۹ء ، ص ۱۲

۳۹ ایضاً، ، ص ۱۳

۴۰ محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف ، ص ۳۶۴

۴۱ ''مکاتیب آزاد'' حاشیہ ، ص ۲۴۹

۴۲ ''مکاتیب آزاد''، ص ۲۵۶

۴۳ ''مکاتیب آزاد حاشیہ'' ،ص ۲۵۶

۴۴ شریف احمد شرافت نوشاہی ،شریف التواریخ ،بحوالہ ادارہ معارفِ نوشاہیہ ساہنپال شریف (ضلع گجرات)

۴۵ ممتاز گوہر، ڈاکٹر ،''پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقاء''مغربی پاکستان اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۷ء ،ص ۱۹۹ نیز نور احمد ،مولوی ،چشتی، از مقدمہ یادگار چشتی ، ص ۵۳

۴۶ ''مکاتیب آزاد'' حاشیہ ،ص ۷۷

۴۷ ایضاً

۴۸ ممتاز گوہر، ڈاکٹر ،''پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقاء'' مغربی پاکستان اکیڈمی۔ لاہور، ۱۹۹۷ء ،ص ۱۹۹

۴۹ محبوب عالم ،مولوی ،''اُردو صحافت کی ایک نادر تاریخ مقدمہ وحواشی'' طاہر مسعود مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور ،۱۹۹۲ء ،ص ۱۹۲

۵۰ ایضاً ، ص ۵۷

کتب

۱ آزاد، محمد حسین، ''نظم آزاد'' مفید عام پریس، لاہور، ۱۸۹۹ء

۲ آزاد، محمد حسین، ''دربارِ اکبری''، طبع ثانی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۳ اگست ۱۹۱۰ء

۳ آزاد، محمد حسین، ''سخن دان فارس'' (حصہ اوّل) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء

۴ آزاد، محمد حسین، ''دیوان ذوق'' مطبع اسلامیہ لاہور، ۱۸۹۲ء

۵ آزاد، محمد حسین، ''نیرنگِ خیال''، بک ٹاک میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

۶ آزاد، محمد حسین، ''کلیات'' لاہور بک ٹاک ۲۰۰۶ء

۷ آزاد، محمد حسین، ''قصص ہند'' بک ٹاک لاہور ۲۰۰۶ء

۸ آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات، مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح'' ۲۰۰۱ء

۹ آزاد، محمد حسین، ''مجموعہ'' ارسلان بکس علامہ اقبال روڈ میر پور آزاد کشمیر ۲۰۰۱ء

۱۰ آزاد، محمد حسین، ''نصیحت کا کرن پھول'' آزاد بک ڈپو دہلی، سالِ تالیف مذکور نہیں،

۱۱ آغا سلمان باقر، ''محمد حسین آزاد کا عالم وارفتگی''، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء

۱۲ آغا سلمان باقر، ''محمد حسین آزاد حیات، شخصیت، فن''، سنگ میل لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۳ آغا محمد اشرف، ''آب حیات کے لطیفے''، لاہور، ۱۹۴۱ء

۱۴ آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد (مرتب) ''مکتوبات آزاد'' نظام الدین گیلانی پریس لاہور

۱۹۲۳ء

۱۵ احمد رضا، ''محاسن الاخلاق'' از شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ، مجلس ترقی ادب لاہور طبع اوّل، ۱۹۷۵ء

۱۶ ''اُردو دائرہ معارف اسلامی'' (جلد ۱) لاہور پنجاب یونیورسٹی، طبع اوّل، ۱۹۶۴

۱۷ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف''، حصّہ اوّل انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، ۱۹۶۵ء

۱۸ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف''، حصّہ دوم، انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، ۱۹۶۵ء

۱۹ افتخار عالم، سید، ماہروی، ''حیاۃ النذیر'' بھوپال، ۱۹۱۲ء

۲۰ الطاف حسین حالی، مولانا، ''حیات جاوید'' ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۹۰ء۔۱۹۱۲ء

۲۱ امداد صابری، ''تاریخ صحافت اُردو'' (جلد اوّل) دہلی ۱۹۵۳ء

۲۲ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۹۶۔۱۹۹۷

۲۳ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ''، عزیز بک ڈپو، لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۸ء

۲۴ انوار الحسن ایم اے، ''محمد حسین آزاد'' ادارہ فروغ اردو لکھنو، بار اوّل ۱۹۵۷ء

۲۵ بدر منیر الدین، ''رقعات عبدالحق، تحقیق و تدوین'' خزینہ علم و ادب، لاہور

۲۶ تبسم کشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ'' سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۷ ثریا حسین، پروفیسر، ''گارسین دتاسی، اُردو خدمات علمی کارنامے'' اتر پردیش اُردو اکادمی، سالِ تالیف مذکور نہیں۔

۲۸ جلیل احمد قدوائی، ''مکاتیب عبدالحق''، مکتبہ اُسلوب کراچی، ۱۹۶۳ء

۲۹ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اُردو''، جلد اوّل، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۳ء

۳۰ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اُردو''، جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع سوم ۱۹۹۴ء

۳۱ حامد حسن قادری، ''داستان تاریخ اُردو'' (ایڈیشن ۴)، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء

۳۲ حامد علی خان، مولانا (مدیر اعلیٰ)، ''اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا'' جلد اوّل، غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۷ء

۳۳ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اُردو'' ابلاغ لاہور ۱۹۷۹ء

۳۴ خلیق انجم، ''غالب کے خطوط''، جلد اوّل، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی اشاعت اوّل ۱۹۸۹ء اشاعت دوم، ۱۹۹۲ء

۳۵ رجب علی بیگ سرور، ''فسانہ عجائب''، مرتب رشید حسن خان نقوش اُردو بازار لاہور، اپریل ۱۹۹۰ء

۳۶ سرسید احمد خان، ''مضامین تہذیب اخلاق'' (جلد دوم) سال تالیف مذکور نہیں

۳۷ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' سنگ میل پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور، ۱۹۷۱ء۔۱۹۸۳ء

۳۸ سلیم قریشی سید، عاشور کاظمی ''۱۸۵۷ء کے ''غداروں کے خطوط'' انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۳۹ سلیمان ندوی، سید، ''مکاتیب شبلی'' (حصہ اوّل) استقلال پریس مسلم مسجد

لاہور ۱۹۸۹ء

۴۰ سلطان محمود حسین ، سید ، ڈاکٹر ، ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی'' مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع اوّل ۱۹۸۷ء

۴۱ سید احمد مولوی ، دہلوی ، ''فرہنگ آصفیہ'' ، جلد دوم ، مکتبہ حسن سہیل لاہور ، سال تالیف مذکور نہیں ،

۴۲ سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ''وجہی سے عبدالحق تک'' سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۶ء

۴۳ سید عبداللہ ، ڈاکٹر ''میر امن سے عبدالحق تک'' مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء

۴۴ سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، اردو خط نگاری نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء

۴۵ سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، ''ادب وفن'' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۸۷ء

۴۶ سید اقبال علی ، مولوی ، ''سید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب'' مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ، مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع دوم ، ۱۹۹۱ء

۴۷ سی۔ای ، بک لینڈ'' ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی'' فرسٹ ایڈیشن ان پاکستان ۱۹۷۵ء ، البرونی لاہور

۴۸ شریف احمد شرافت ، نوشاہی ، ''شریف التواریخ'' ، بحوالہ ادارہ معارف نوشاہیہ ساہپال شریف (ضلع گجرات)

۴۹ طاہر نسیم ''سرسید اور اُردو صحافت'' مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور بار اوّل ۱۹۸۰ء

۵۰ عبدالمجید خواجہ ، بی اے ''جامع اللغات'' جلد اوّل اردو سائنس بورڈ ، لاہور ۱۹۸۹ء

۵۱ عبدالحق ، مولوی ، ڈاکٹر ، ''مرحوم دہلی کالج'' انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ، دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء

۵۲ عتیق صدیقی ،'' اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اخبار اور دستاویزیں'' مکتبہ شاہراہ اُردو بازار دہلی ۱۰ مئی ۱۹۶۶ء

۵۳ غالب ''اردوے معلّٰی'' مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل ، سید ، (جلد اوّل ، جلد دوم) ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۶۹ء

۵۴ فائق ، کلب علی خاں ''کلیات میر جلد اوّل حصہ غزلیات'' مجلس ترقی ادب ، لاہور

۵۵ فرزانہ سید ، ''نقوش ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور ۲۰۰۲ء

۵۶ فیروز الدین مولوی ، ڈسکوی ''اُردو لغات فیروزی'' الفیصل ناشران کتب اُردو بازار لاہور ۱۹۸۹ء

۵۷ گوہر نوشاہی ، ڈاکٹر ، ''ادبی زاویے'' ، مجلس فروغ تحقیق اسلام آباد ، ۱۹۹۱ء

۵۸ گوہر نوشاہی ، ڈاکٹر ، ''تحقیقی زاویے'' مجلس فروغ تحقیق ، اسلام آباد ۱۹۹۱ء

۵۹ گوہر نوشاہی ، ڈاکٹر ، ''پاکستانی ادب کے معمار سید امتیاز علی تاج'' (شخصیت اور فن) اکادمی ادبیات پاکستان ، اسلام آباد ، ۱۹۹۹ء

۶۰ محمد عتیق صدیقی ، ''صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات'' انجمن ترقی اُردو ہند علیگڑھ ۱۹۶۲ء

۶۱ محمد شفیع ، مولوی ، ''مقالات'' (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء

۶۲ محمد صادق ، ڈاکٹر ، ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۷۶ء

۶۳ محمد صادق ، ڈاکٹر '' آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین'' مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع اوّل ، جولائی ۱۹۷۳ء

۶۴ محمد اکرام چغتائی ، ''محمد حسین آزاد ، نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ، ۲۰۰۴ء

۶۵ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ ''مکتوبات سرسید'' (جلد اوّل)، مجلس ترقی ادب
لاہور، ۱۹۷۶ء

۶۶ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ '' سرسید مقالات حصہ دوم'' مجلس ترقی ادب
لاہور، طبع اوّل ۱۹۶۱ء

۶۷ محمد طفیل، ''نقوش شخصیات نمبر''، ادارہ فروغ اردو لاہور، جنوری ۱۹۵۵ء

۶۸ محبوب عالم، مولوی، ''اُردو صحافت کی ایک نادر تاریخ مقدمہ وحواشی''
طاہر مسعود مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۲۹ء،

۶۹ مرتضٰی حسین فاضل، سید، ''اُردو معلّٰی'' (حصّہ اوّل جلد دوم) مجلس ترقی ادب،
لاہور ۱۹۶۹ء

۷۰ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، سید، ''مکاتیب آزاد'' مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء

۷۱ معین الدین احمد انصاری، ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں'' اُردو اکیڈمی سندھ،
کراچی ۱۹۶۷ء

۷۲ ''مکتوبات آزاد''، مرغوب ایجنسی، طبع دوم، ۱۹۰۷ء

۷۳ ممتاز گوہر، ڈاکٹر، ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء'' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
لاہور، ۱۹۹۷ء

۷۴ مہدی آفادی، ''افادات مہدی'' یعنی ایم مہدی'' حسین مرحوم افادی الآفادی کا
مجموعہ مضامین مرتب مہدی بیگم شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور، طبع چہارم ۱۹۴۹ء،

۷۵ نور احمد، مولوی چشتی ''مقدمہ یادگار چشتی''

۷۶ نورالحسن، ڈاکٹر، ''دہلی کا دبستان شاعری'' بک ٹاک لاہور، ۱۹۹۱ء

۷۷ نذیر احمد، پروفیسر، ''غالب کی مکتوب نگاری'' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۶۷ء

۷۸ نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر، ''غالب تاریخ کے آئینے میں اور دوسرے مضامین'' ناظم آباد کراچی ۱۹۶۳ء

رسائل/ جرائد/ کتابی سلسلے

۱ ''اخبار انجمن پنجاب'' ۱۷ جنوری تا ۱۴ جون ۱۸۸۳ء

۲ ''اخبار انجمن پنجاب'' جولائی ۱۸۸۳ء تا دسمبر ۱۸۸۳ء

۳ ''دریافت'' شمارہ ۳ ستمبر ۲۰۰۴ء نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئج اسلام آباد

۴ ''راوی'' مولانا محمد حسین آزاد نمبر، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۸۳ء

۵ ''راوی'' ۲۰۰۶ء صد سالہ شمارہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

۶ ''راوی'' ۲۰۰۷ء جی سی یونیورسٹی، لاہور

۷ ''رفیق ہند'' ہفت روزہ ۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۷ء مرتبہ مولوی محرم علی چشتی

۸ ''سفیر ہند'' امرتسر مرتبہ پادری رجب علی جلد ہشتم ۱۸۸۱ء

۹ ''علی گڑھ میگزین'' جلد ۲۴ نمبر ۲ غالب نمبر بابت ۴۸۔۱۹۴۹ء

۱۰ ''مخزن'' اپریل ۱۹۰۶ء جلد ۱۱ نمبر ۱

۱۱ ''مخزن'' مئی ۱۹۰۶ء جلد ۱۱ نمبر ۲

۱۲ ''مخزن'' جولائی ۱۹۰۶ء جلد ۱۱ نمبر ۴

۱۳ ''مخزن'' اگست ۱۹۰۶ء جلد ۱۱ نمبر ۵

۱۴ ''مخزن'' ستمبر ۱۹۰۶ء جلد ۱۱ نمبر ۶

۱۵ ''نقوش شخصیات نمبر'' جنوری ۱۹۵۵ء، ادارہ فروغ اُردو لاہور

۱۶ ''نقوش مکاتیب نمبر'' جلد اوّل نومبر ۱۹۵۷ء، ادارہ فروغ اُردو لاہور

۱۷ ''نقوش مکاتیب نمبر'' جلد دوم نومبر ۱۹۵۷ء، ادارہ فروغ اُردو لاہور

مقالہ جات

۱۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو) کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء

۲۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر، ''پنجاب میں اُردو اَدب کا ارتقاء'' تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۳ء

انٹرویوز

مندرجہ ذیل شخصیات سے بالمشافہ مصاحبے (انٹرویو) کیے گئے۔

۱۔ وحید قریشی ڈاکٹر، سابق صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۲۔ اسلم فرخی ڈاکٹر، مصنف محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف سابق صدر شعبہ اُردو جامعہ کراچی

۳۔ آغا سلمان باقر ڈاکٹر، والد آغا باقر نبیرہ آزاد، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

سوال نامہ

۱۔ اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالیں۔

۲۔ اُردو ادب کی مکتوب نگاری میں مولانا محمد حسین آزاد کا کیا مقام ہے۔؟

۳۔ کیا مکاتیب آزاد کے مضامین کا عکس ان کی تخلیقی اور تحقیقی تحریروں میں آتا ہے؟

۴۔ مکاتیب آزاد نے اُردو نثر پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں۔؟